نعت کے
تخلیقی زاویے
ریاض حسین چودھری رحمۃ اللہ علیہ
ریسرچ سینٹر

تخلیق کار کا تنقید وتبصرہ کی طرف خود مائل ہونا کئی اعتبار سے مبارک ثابت ہوتا ہے۔ وہ امور جن کا اظہار شعری سطح پر ممکن نہیں ہوتا یا شعری اظہار کی بعض حدود کے باعث اظہار کے تقاضے پورے نہیں ہو پاتے تو نثر کے ذریعے اپنا ما فی الضمیر پیش کر کے فکری تشفی کے مختلف اسباب پیدا کیے جاتے ہیں۔ ریاض حسین چودھری کی شناخت کا بنیادی حوالہ ان کی شاعری ہے اور ان کا زیادہ تر تخلیقی اثاثہ مدحِ رسول پر مشتمل ہے۔ ان کی زندگی میں نعت ایک مقصدِ حیات کا درجہ رکھتی ہے اور اس کی تکمیل کے لیے وہ تا حیات کوشاں رہے۔ ان کے بائیس کے قریب نعت کے مجموعے شائع ہوئے جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نعت کا تخلیقی رجحان ان کا کل وقتی میلان تھا۔ "نعت کے تخلیقی زاویے" ان کی نثر کی ایسی دستاویز ہے جو نعت، تخلیقِ نعت اور تخلیق کارانِ نعت کے بارے میں ان کی متنوع تحریروں پر مشتمل ہے اور اس میں ان کے نعتیہ مجموعوں کے پیش لفظ اور انٹرویوز بھی شامل کیے گئے ہیں۔

اس کتاب کا یہ جمالیاتی وصف ہے کہ یہ مضامین نعت کے مباحث کے تناظر میں بعض فکری پہلوؤں پر ایسے جامع مواد کی حامل ہے جو ایک انسان کے درست طرزِ حیات سے لے کر قومی سطح کے مسائل تک کو محیط ہے۔ ان کی بحث میں مستقبل کی جہت نمائی بھی ہے اور وہ درد و سوز بھی جو ایک سماج کے معاشرتی ارتقا کے لیے اہلِ فکر کے باطن میں تاباں ہوتا ہے۔ وہ اپنی نعت میں جس طرح سماج کے حوالے سے اپنی فکر و دانش کا اظہار کرتے ہیں، ان کی نثر میں بھی اس حوالے سے ایک واضح دردمندانہ میلان نظر آتا ہے۔ اس لحاظ سے ان مضامین کا تنوع اپنے حلقہ قارئین کے لیے حیرت انگیز بھی ہے اور اثر انگیز بھی۔ ان کا اسلوبِ بیان اپنے اندر ایک خاص جاذبیت کا حامل ہے۔ ان کے شعری اوصاف کا عکس ان کی نثر میں بھی نمایاں ہے۔ شیخ عبدالعزیز دباغ کی مرتبہ "نعت کے تخلیقی زاویے" کے عنوان سے یہ نثری دستاویز ریاض حسین چودھری کے افکار کا مجموعہ ہی نہیں، معاصر نعت کی بعض تخلیقی جہتوں کی تفہیم میں ایک اہم سنگِ میل بھی ہے۔

طارق ہاشمی
شعبۂ اردو، جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# نعت کے تخلیقی زاویے

## ریاض حسین چودھریؒ

مرتبہ

شیخ عبدالعزیز دباغ


نعت ریسرچ سنٹر

B-306، بلاک 14، گلستانِ جوہر، کراچی

موبائل نمبر: 0332-2668266

sabeehrehmani@gmail.com

www.sabih-rehmani.com

# نعت ریسرچ سینٹر

## ہمارا نصب العین ! نعتیہ ادب کا فروغ



| | | |
|---|---|---|
| کتاب | : | نعت کے تخلیقی زاویے |
| **مصنف** | : | ریاض حسین چودھری |
| **مرتب** | : | شیخ عبدالعزیز دباغ |
| کمپوزنگ | : | اشفاق انجم |
| اشاعت | : | ستمبر 2021ء |
| تعداد | : | 300 |
| صفحات | : | 334 |
| قیمت | : | 800 روپے |

شائع کردہ

B-306، بلاک 14، گلستانِ جوہر، کراچی۔

ISBN:978-969-8918-72-3

# انتساب

## شاعرِ رسولؐ ریاض حسین چودھریؒ کے نام

جو رب کریم سے نعت نگاری کا صلہ مانگتے رہے کہ:

**اے خدا!** میرے پاکستان کی نظریاتی اور جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت فرما۔

(طلوعِ فجر)

**اے خدا!** قیامت تک میری آنے والی نسلیں حضورؐ کے حلقۂ غلامی میں رہیں اور بعدِ حشر بھی زنجیرِ غلامی کی کڑیاں ٹوٹنے نہ پائیں۔ (آبروئے ما)

**اے خدا!** امتِ مسلمہ کو عظمتِ رفتہ کی بازیابی کے سفر پر نکلنے کی توفیق عطا فرما۔

(زمزمِ عشق)

**اے خدا!** میرے قلم کو بنو نجّار کی بچّیوں کا سوز و گداز عطا کر اور اِسے ہوائے مدینہ سے ہمکلامی کے شرف سے مشرف فرما۔ (تحدیث نعمت)

**اے خدا!** علم، حکمت اور دانائی جو مومن کی گم شدہ میراث ہے اُسے پھر سے امتِ مسلمہ کا مقدر بنا دے۔ (دبستانِ نو)

**اے خدا!** روزِ محشر مجھے میرے آقا ﷺ کے سامنے شرمندہ نہ ہونے دینا مَیں اپنے شفیق آقاؐ کا سامنا نہ کر پاؤں گا۔ (لامحدود)

**اے خدا!** خطۂ دیدہ و دل، پاکستان، عالمِ اسلام کی پہلی ایٹمی طاقت ہے۔ غلامانِ رسولؐ کے ایٹمی اثاثہ جات کی حفاظت فرما۔ ہم سب کو فصیلِ ارض وطن پر جاگتے رہنے کا شعور عطا کر۔ (کائنات محوِ درود ہے)

**آمین**

کہاں نعتِ مسلسل صورتِ مصحف ہوئی نازل
کہاں میرا جہانِ فن، کہاں میری سخن دانی
(ریاض)

# ریاض حسین چودھریؒ کی تحریر کا

# ایک اقتباس

’’زرِ معتبر‘‘ میں (۱۹۸۵ء میں) درِ اقدس ﷺ کی حاضری تک کا کلام شامل ہے۔ کلماتِ تشکر و امتنان استاذ مکرم حضرت آسی ضیائی کے لیے جنہوں نے ہاتھ پکڑ کر مجھے لکھنا سکھایا، ہر قدم پر میری اصلاح ہی نہیں رہنمائی بھی کی۔ اِس صحیفۂ نعت میں شامل تقریباً سبھی نعتیں مواجہ شریف میں کھڑے ہو کر سردارِ کائنات کی خدمتِ اقدس میں پیش کرنے کی لازوال سعادت حاصل ہوئی۔ فارسی، اردو، پنجابی کے تقریباً ساڑھے تین سو شعرا کا ایک ایک نعتیہ شعر بھی ڈائری میں لکھ رکھا تھا جنہیں بارگاہِ نبی رحمت ﷺ میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کی اور یہ تھی میری برستی آنکھوں کی لرزتی التجا:

’’حضور ﷺ مطلع عرض کیا ہے، آقا ﷺ یہ شعر دیکھئے، مولاؐ مقطع ملاحظہ فرمایئے۔ یارسول اللہ! یہ ہمارے احمد ندیم قاسمی ہیں، انہوں نے آپ ﷺ کی بارگاہِ بیکس پناہ میں یہ شعر نذر کیا ہے، حضور ﷺ قبول فرمایئے، یہ ہمارے حفیظ تائب ہیں ان کا یہ شعر سماعت فرمایئے اور انہیں ردائے شفا عطا کیجئے....

آقا ﷺ میرے گھر کا بچہ بچہ سلام عرض کر رہا تھا، ننھے مُنے بچے دونوں

ہاتھ اٹھا کر سلام کہتے تھے۔ حضور ﷺ سب کنیزیں دست بستہ کھڑی تھیں، سرکارﷺ، میرا پاکستان آپ کے غلاموں کا حصارِ آہنی ہے، حضور ﷺ اغیار نے اس کا مشرقی بازو کاٹ لیا ہے۔ آقاؐ میرے وطن پر کرم اور مسلسل کرم، آقاؐ میرے وطن کی ہواؤں کا سلام قبول کیجئے۔''

ایک غلام اپنے آقا ﷺ کی بارگاہ میں سر جھکائے مجرموں کی طرح کھڑا تھا، ستونوں کے پیچھے چھپ رہا تھا، آنسوؤں، ہچکیوں اور سسکیوں کی زبان میں اپنے حضورﷺ سے نجانے کیا کچھ عرض کرتا رہا اور نجانے کیا کچھ کہتا رہے گا... ایک عجیب سی تمنا دل میں مچلتی رہتی ہے کہ مرنے کے بعد بھی سپاس گذاری کا یہ سلسلہ جاری رہے اور حشر کے دن جب ہجومِ تشنہ لباں میں مَیں بھی گُم صُم کھڑا ہوں تو حضورؐ فرمائیں کہ آؤ ریاض آج بھی کوئی نعت سناؤ اور میں بڑھ کر اپنے آقاﷺ کے قدموں کو تھام لوں۔

ریاض حسین چودھریؒ

۲۳ جنوری، ۱۹۹۵ء، لاہور

# فہرست

فضائے نعت میں اڑتے ہوئے نہیں تھکتا
مرا قلم بھی ہے جبریل کے پروں کی طرح

# ریاض حسین چودھری کا نعتیہ شعور

ریاض حسین چودھری نعت اور تنقیدِ نعت کا گہرا شعور رکھنے والے شاعر اور ادیب و نقاد کے طور پر سامنے آئے۔ انھوں نے اردو نعت کو اپنے شعور کا اس طرح لازمی حصہ بنالیا کہ اس کی خوشبوان کے لاشعور کے اندر تک پھیلتی چلی گئی۔ جہاں کہیں بھی نعت پہ کام ہوتا اور کوئی بھی شخص اس حوالے سے کچھ نئی بات کرتا وہ اس کو سراہتے اور اس پہ تبصرہ کرتے۔

انہوں نے اپنے پہلے شعری مجموعے کی تشکیل و تکمیل کا کام روضۂ رسول پہ حاضری سے پہلے انجام دے لیا تھا۔ پھر انھوں نے روضۂ رسول پہ حاضری دی اور وہاں اپنی فکری کائنات کو جس طرح جلا بخشی اس نے ان کی تحریروں میں نئی جدت پیدا کی اور اپنی کیفیات اور محسوسات کو بڑے خوبصورت الفاظ میں صفحۂ قرطاس پہ منتقل کیا۔

اس کتاب'' نعت کے تخلیقی زاویے'' میں ان کی نعت سے متعلق نثری تحریریں، تبصرے، تنقیدات، حج سے متعلق سفر کی صورت حال اور انٹرویوز شامل کیے گئے ہیں۔جس سے ان کی زندگی کے وہ متنوع پہلو سامنے آتے ہیں جن میں حبِ نبی اور شعورِ نعت موجزن نظر آتا ہے۔

کتاب کے آغاز ہی میں ان کے پہلے مجموعہ نعت ''زرِمعتبر'' کا پیش لفظ شامل کیا گیا ہے:

''میرا ہر لفظ باوضو ہوکر اور میری ہرسانس احرام باندھ کر والئ کون و مکاں کی بارگاہِ اقدس میں سربسجود ہے۔کشکول آرزو زرِمعتبر سے لبریز

ہے، بازارِ مؤدت کا سب سے مستند حوالہ، امیر وفقیر، شاہ وگدا کی کوئی تفریق نہیں، عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر کوئی فوقیت حاصل نہیں، یہ زندہ اور توانا احساس اُس پیکرِ جمال کے نقوشِ پا کے تصدق میں ظہور پذیر ہونے والے بے مثال اور لازوال موسموں کی رعنائیوں اور شادابیوں سے اکتساب نمو کر رہا ہے جو مقصودِ تخلیقِ دو عالم ہے۔''

ان سطروں میں انھوں نے اپنے مخصوص نثری جملوں میں نہ صرف اپنے احساسات وجذبات اور کیفیات کی عکاسی کی ہے بلکہ کائنات کی تشکیل کی وجہ بھی بیان کر دی ہے۔اور ساتھ ہی انسان کے سماجی حوالے سے قرآن اور رسالت مآب کے ارشادات بھی بیان کر دیے ہیں۔

وہ ادب اور نعتیہ ادب کے حوالے سے اپنے مخصوص اور دلکش اسلوبِ بیان میں لکھتے ہیں:

''ادب اپنے عہد کے تخلیقی اور سماجی رویوں کی کوکھ سے جنم لینے والی خوشبو کا نام ہے اور خوشبو کا امتیازی وصف یہ ہے کہ زمان ومکان کی حد بندیوں سے ماوراء ہوتی ہے۔یہی خوشبو حسن وجمال کے پیکر میں سجتی ہے اور جذبات کی شبنم کے خنک اور گداز لمس سے ہمکنار ہوتی ہے۔''

ان کے خیال میں شعر جب لوحِ احساس پر شفق کی مانند پھوٹتا ہے تو تب کہیں جا کر خیال کی خوشبو سے ہم آہنگ ہوتے ہوئے ظہور پذیری کے عمل سے گزرتا ہے۔فرماتے ہیں:

''شاعری جب دہلیز مصطفیٰ کو چوم کر کیفِ دوام میں سرشار ہوتی ہے اور تخلیقی سطح پر خود سپردگی دائرہ عمل میں آتی ہے تو نعت قرطاس وقلم کو اپنے وجود کے اظہار کا اعزاز بخشتی ہے۔''

ان کی تحریر میں جس طرح عقیدت واحترام کی فضا پائی جاتی ہے اور جس طرح وہ نبی کریم ﷺ سے اپنی والہانہ محبت وعقیدت کا اظہار کرتے ہیں، ان کی تحریر کا ایک ایک لفظ ان کی ثنا خوانی کے ویژن کو قاری کے دل ودماغ پر روشن کرتا چلا جاتا ہے۔

زندگی کی لاحاصلی اور بے قراریوں میں ایک چیز جو انھیں قرار دیتی رہی وہ حضوری کے لمحوں کا حصول تھا۔ جس کا ذکر اور اظہار ان کی تحریروں اور شعروں میں جا بجا جھلکتا ہے۔

لمحات حاضری کی تمنا لیے ہوئے
ایک ایک لمحہ عمرِ رواں کا بسر ہوا

حتیٰ کہ وہ بیماری اور نیم بیہوشی کے عالم میں بھی ذکرِ رسول اور مدحِ رسول کرنا نہیں بھولے۔ یہ عقیدت واحترام کا وہ درجہ ہے جو ہر کسی کو آسانی سے حاصل نہیں ہوتا۔

ان کی لفظیات میں ایک ایسا جادو ہے کہ ہر لفظ ایک نئے لفظ کا در کھولتا چلا جاتا ہے۔ ایک ایسی طلسم نگاری ہے جو کہ پڑھنے والے کو ایک نئے جہان میں لے جاتی ہے اور کیفیات ومحسوسات کی نئی دنیاؤں سے روشناس کراتی ہے۔

''ہوا چراغ بانٹنے کا منصب سنبھالتی ہے اور خوشبوئیں نعت گو کے قلم کا طواف کرنے لگتی ہیں۔''

ان کے کے خیال میں غزل میں چاشنی بھی نعت کے وسیلے سے ہے۔

''غزل نے نعت کے دامن صد رنگ کی خلعت فاخرہ اوڑھ کر اپنی ہی سلامتی اور بقا کا اہتمام کیا ہے۔''

نعت میں ترسیل کا عمل رسول کریم ﷺ کی محبت کی وجہ سے تیز تر ہوجاتا ہے۔

''ابلاغ کی چاندنی لفظ کے ظاہر ہی کو نہیں اس کے باطن کو بھی منور کردیتی ہے۔''

''نعت اندر کی روشنی کے بھرپور ابلاغ کا نام ہے۔''

انھوں نے نعت کے حوالے سے اپنی تنقیدات میں ان پہلوؤں کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے کہ جن سے احترامِ ذات کے ساتھ ساتھ رسولِ کریم ﷺ کے افکار کو بھی نمایاں کیا جاسکے۔فاضل بریلویؒ کے شعری ویژن کے بارے میں لکھتے ہیں:

''فاضل بریلویؒ نے شعوری اور لاشعوری دونوں سطحوں پر بارگاہِ رسالت مآب میں تصویرِ ادب بن جانے کی روایت کو زندہ رکھا ہے بلکہ ادب واحترام کے حصار میں غزل کے رچاؤ اور بہاؤ کو مقید کرنے کا کارنامہ سرانجام دیا ہے۔''

نعتیہ مجموعوں پر تبصرے کرکے انھوں نے نعت گوشعرا اور ان کے نعتیہ کلام کو نعت کی ادبی تاریخ کا حصہ بنا دیا ہے۔

اس کتاب میں ان کے پانچ انٹرویو بھی شامل کیے گئے ہیں۔ان انٹرویوز کے دوران سوالات وجوابات سے کئی باتیں سامنے آتی ہیں۔انھوں نے نعت گوئی کو اپنی زندگی کا نصب العین بنایا اور اسے زندگی بھر کا سب سے قیمتی اثاثہ سمجھا۔وہ نعتیہ خیالات کو قرآن مجید کی تعلیمات سے جوڑتے ہیں:

''نعت کے حوالے سے میری سوچ قرآن کے فلسفۂ نعت سے مختلف نہیں۔قرآن کا فلسفہ نعت ربطِ رسالت سے ابلاغ پاتا ہے۔''

(انٹرویو از ڈاکٹر آفتاب احمد نقوی)

''جب تک لفظ احرام باندھ کر نہ نکلے، اور خیال باوضو نہ ہو، ذہن نعت کا مضمون سوچ ہی نہیں سکتا۔'' (انٹرویو از ڈاکٹر آفتاب احمد نقوی)

''چھٹی یا ساتویں میں تھا کہ پہلی نعت کہی۔ یہ نعت بچوں کے ایک رسالے ''کھلونا'' لاہور میں شائع ہوئی۔'' (انٹرویو از عمران نقوی)

''میں سمجھتا ہوں کہ ایک نعت گو کے لیے غزل گو ہونا بہت ضروری ہے۔'' (انٹرویو از عمران نقوی)

''میں نعت گوئی کی طرف شعوری طور پر نہیں آیا۔۔۔ مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے دنیا میں آنے سے پہلے میری روح فضائے نعت میں سانس لے رہی تھی۔'' (انٹرویو از محمد طاہر۔ابرار حنیف مغل)

''نعت گوئی میری سرشت میں شامل ہے۔قدرت ہزار زندگیاں بھی دے تو ہر زندگی میں نعت گو بننا ہی پسند کروں گا۔''

(انٹرویو از محمد طاہر۔ابرار حنیف مغل)

''قرآن پاک کو ایک نعت مسلسل کہا جاتا ہے۔'' (انٹرویو از اشفاق نیاز)

''نعت درودوسلام کے پیکرِ شعری کا نام ہے ہدایت آسمانی کی آخری دستاویز قرآن مجید فرقان حمید میں تاجدار کائنات حضور رحمت عالم ﷺ کے محامد ومحاسن کی دھنک پھیلی ہوئی ہے۔'' (انٹرویو از اشفاق نیاز)

''وہ جدت بے معنیٰ ہے جس کی جڑیں اپنی روایت میں پیوست نہیں۔''

(انٹرویو از فاروق قمر صحرائی)

ان کے انٹرویوز سے نعت اور نعت گوئی کے حوالے سے کئی باتوں کا پتہ چلتا ہے۔ کئی سوالات کے ایسے جوابات اور معلومات ملتی ہیں جن کی وجہ سے قارئین

ان کے خیالات وافکار سے صحیح معنوں میں روشناس ہوتے ہیں۔

اس کتاب کے آخر میں نثری نعت کے حوالے سے ان کے خیالات کو پیش کیا گیا۔ نثری نعت کو منظوم نعت سے کس طرح متمیّز کیا جاسکتا ہے۔اور شاعری کے مقابلے میں اسے ہم کس جگہ رکھ سکتے ہیں، یہ اہم مباحث ہیں۔

ہمارے یہاں عام طور پر نعت سے مراد یہی لی جاتی ہے کہ وہ شاعری کی صنف ہے مگر اس تحریر سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ نعت کو نثر کے آہنگ، لہجے اور اسلوب میں لکھا جاسکتا ہے۔نعت کے لیے کوئی کسی قسم کی حد بندی نہیں یہ کسی بھی صنف میں لکھی جاسکتی ہے مگر صرف رسولِ کریم ﷺ کے ادب اور احترام کو ملحوظ خاطر رکھنا اس کا لازمی خاصہ ہے۔چونکہ یہ نثر میں ہے اس لیے نثریت تو اس میں موجود ہی ہے مگر اس میں شعریت کا ہونا بھی ضروری ہے۔نثر میں شعریت کا تصور اس مضمون سے ہے جسے پیش کیا جارہا ہے۔ جہاں نثر میں متن تخلیقی نثر کی قلمرو میں داخل ہوتا ہے وہاں اس میں تخلیقیت اور شعریت کا ہونا ضروری قرار پاتا ہے۔ چند نثری جملے ملاحظہ کیجیے:

''سامنے رنگ ونور کی ایک دنیا آباد تھی،کشتِ آرزو میں رحمت کی بادِ بہاری چل رہی تھی، آسمانوں سے کہکشاؤں کے جھرمٹ اتر کر خالقِ وارض سما کی ربوبیت کا اعلان کر رہے تھے، میں اپنا بیگ اٹھائے حرم شریف کی طرف بڑھ رہا تھا۔ مجھے شوق فراواں کی ہمرکابی میسر تھی۔ یہ خیال دامن میں لپٹ گیا کہ حرم کی انہی دلکش فضاؤں میں میرے حضور بھی سانس لیتے ہوں گے۔انہی پہاڑوں نے میرے آقا کے چہرۂ انور کی زیارت کی ہوگی۔آقا علیہ السلام کا مقدس بچپن انہی گلیوں میں گزرا ہوگا۔متانت شائستگی اور سنجیدگی کے الفاظ کی تخلیق انہی کی گردِ پا سے

ہوئی ہوگی۔یہی چاند میرے آقا کی انگشتِ مبارک کے اشارے پر وجد
میں آیا ہوگا اور شق القمر کا معجزہ رونما ہوا ہوگا۔''

یہاں لفظ' بیگ' شعری مزاج کا حامل نہیں ہے۔ یہ نثر کا نمائندہ ہے مگر دیگر الفاظ تخلیقی متن میں شامل ہوتے ہیں اسی لیے تخلیقی نثر کی تشکیل کے امکانات میں شامل ہوکر اپنا جاندار کردار ادا کررہے ہیں۔

ان کے سفرِ حج سے متعلق یادداشتوں میں حج اورعمرہ کا سارا فلسفہ خوب صورت انداز میں بیان ہوا ہے:

''میں حالتِ احرام میں تھا اورعمرہ کی ادائیگی کا فریضہ جلد از جلد ادا کرنا چاہتا تھا۔زندگی ہی میں کفن بدن پر سجا کر جب انسان اپنے پروردگار کے حضور حاضر ہوتا ہے تو زمینی رشتے کچے دھاگوں کی طرح ایک ایک کرکے ٹوٹ جاتے ہیں سو میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔فکری اور نظری رشتے خون کے رشتوں پر غالب آچکے تھے۔''

ریاض حسین چودھری ایک بے مثال شعر کہنے والے شاعر ہی نہیں بلکہ خوبصورت نثر اور تنقید لکھنے والے ادیب ونقاد کے طور پر بھی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری اور نثر خاص طور پر رسولِ کریم ﷺ کی مدحت سے نمو پاتی ہیں۔انھوں نے شاعری اور نثر کے پیرائے میں جو کچھ لکھا ہے وہ روایتی تحریریں نہیں ہیں کہ جنھیں کچھ عرصہ بعد بھلا دیا جائے بلکہ ان کی تحریروں کے حوالے سے بات ہوتی رہے گی اور ان کے لکھے گئے لفظوں سے قارئین فیض حاصل کرتے رہیں گے۔

شیخ عبدالعزیز بادغ نے جس ترتیب اور انداز سے ریاض حسین چودھری کی تحریروں کو مرتب کیا ہے اس سے یہ کتاب ایک گلدستے کی صورت اختیار کرگئی ہے۔ ایک ایسا لفظوں کا گلدستہ جس میں کئی قسم کے پھول اکٹھے ہوں، ہر ایک اپنی اپنی جگہ

خوب سے خوب تر۔اورحسین سے حسین تر۔انھوں نے ریاض حسین چودھری کی تحریروں کو جمع کر کے ایک اہم فریضہ سرانجام دیا ہے۔جس کو جتنا بھی سراہا جائے وہ کم ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد اشرف کمال
صدر شعبہ اردو: گورنمنٹ گریجویٹ کالج بھکر

# عرضِ مرتب

ریاض حسین چودھریؒ نے شعری تخلیقات کے حوالے سے جو کام کیا وہ تو کیا ہی لیکن اُن کی نثر میں حب رسولﷺ کی چکا چوند کچھ ایسی ہے جس سے ان کے شعورِنعت کا سورج روح کی پہنائیوں میں عالم نور اتار دیتا ہے۔ آپ نے طویل عرصے تک ادارت کا کام کیا۔ ڈاکٹر طاہر القادری دامت برکاتہم العالیہ کی سیرت الرسول ﷺ کی جلدوں کی عبارت آرائی اور حسن آرائی کا کام برسوں کیا۔ اس سے قبل آپ نے تن تنہا پندرہ روزہ تحریک کی ادارت، اشاعت، سرکولیشن وغیرہ کا کام ۱۹۹۸ء سے ۲۰۰۶ء تک سنبھالے رکھا۔ اسی دوران وہ اپنی شعری تخلیقات میں بھی مصروف رہے۔ بین الاقوامی حالات حاضرہ، ملکی معیشت اور سیاسی اتار چڑھاؤ میں صحافتی اصولوں کی پاسداری کے مظاہرے، امانت و دیانت کے اصولوں پر صحافتی معاملات کی چھان بین اورراہ گم کردہ ذہنوں کی رہنمائی غرض صحافت کی تمام تر دنیا کو سمیٹ کرحق بات کہنے کے سلیقوں کی پرچار ریاض بطور مدیر پندرہ روزہ تحریک کرتے رہے۔

ان جملہ معاملات پر ان کا ایک ویژن تھا جس کی جھلک ان کے نعتیہ کلام میں ملتی ہے۔ اس دوران وہ اپنی حمدیہ اورنعتیہ کتب میں تعارف کے انداز میں اپنے شعور نعت کے خد و خال اجاگر کرتے رہے جب کہ معاصر شعرائے نعت کی کتب پر تبصرے بھی لکھتے رہے۔ ریاض نعتیہ صحافت کے کئی دانشوروں کو انٹرویوز بھی دیتے رہے جو ان کے جرائد میں نمایاں طور پر چھپتے رہے۔ ریاض کی اِن ساری تحریروں اورنقدِ نعت کے حوالے سے ان کے افکار پر مشتمل چھپے ہوئے انٹرویوز کو یکجا کر کے نذرِ قارئین کیا جا رہا ہے۔ آپ نے سفر نامۂ حجاز کی کچھ اقساط بھی لکھیں جو اپنی طرز کی الگ تحریریں ہیں جن کا نعتیہ نقد و نظر سے براہ راست کوئی تعلق نہیں تاہم ان میں دمکتا ہوا ادبی جوش اور ان کی مدحت نگاری کی مخصوص جذباتی حسن آرائیاں ان میں چراغاں کئے ہوئے ہیں اور ایسی کیفیات

کا بیان ہیں جن سے نعت کا لاشعور وجود پاتا ہے اور جو نعتیہ فکر کے تخلیقی لازمہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔اس بنا پر انہیں شامل اشاعت کیا گیا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ یہ تحریریں ریاض کے شعورِ نعت کی ایسی پردہ کشائی کریں گی جس سے جدید نعت کے قارئین اور مدحت نگاروں کو نعت کے نقد ونظر اور معاصر نعت کی تخلیقی جہات پر ایک یگانہ آگہی ملے گی۔

ان تحریروں تک پہنچنے میں ریاض حسین چودھریؒ کے صاحبزادے جناب محمد حسنین مدثر صاحب اور ان کے بھتیجے جناب محمد بلال امجد صاحب نے بہت تعاون کیا جس کے لئے میں ان کا بہت ممنون ہوں۔

اس کتاب کی اشاعت کے خیال اور اس کی تدوین و اشاعت کے حوالے سے سید صبیح رحمانی صاحب کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں کہ میں ان کا شکریہ ادا کرسکوں۔ وہ حوصلہ بھی دیتے ہیں، رہنمائی بھی، فکری وفنی تعاون بھی اور دعائیں بھی۔ اللہ پاک انہیں سلامت رکھے اور جزائے خیر سے نوازے۔آمین۔

شیخ عبدالعزیز دباغ

# تحدیثِ نعمت

(ریاض حسین چودھریؒ نے اپنا پہلا مجموعہ نعت ''زرِ معتبر'' ۱۹۸۵ء میں درِ رسول ﷺ پر حاضری سے پہلے مکمل کر لیا تھا جب کہ اس کی اشاعت ۱۹۹۵ء میں ہوئی۔ اس کا پیش لفظ جناب حفیظ تائبؒ نے ''پیشوائی'' کے عنوان سے تحریر کیا جب کہ ''تحدیثِ نعمت'' کے عنوان سے ریاض حسین چودھریؒ نے اپنی کیفیاتِ نعت قلم بند کیں۔ اس تحریر کے مضامین کو اجاگر کرنے کے لئے پیرا گراف سرخیاں مرتب نے لکھی ہیں۔)

### دہلیز مصطفیٰؐ سے احساس کا رزقِ شعور

زندگی کے ریگ زاروں میں تنہا کھڑا ہوں، سوا نیزے پر یاسیت کا سورج آگ برسا رہا ہے۔ اپنے اردگرد نظر دوڑاتا ہوں تو محرومیوں اور ناکامیوں کی خاک کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ جلے خیموں سے اُٹھنے والا دھواں منظر نامے کے ہر عکس کو دھندلا رہا ہے، شبِ انحراف کے سائے گہرے ہوتے جا رہے ہیں، ایک گھمبیر اور سنگین سناٹا چاروں طرف محیط ہے، مسائل و مصائب کی آگ کا ایک لا متناہی سلسلہ جھوٹ، دجل، فریب اور منافقت سکہ رائج الوقت، تنہائی کا سائیں سائیں کرتا ہوا جنگل، شرفِ انسانی کی ہر قدر کو بھی زر کے ترازو میں تولنے کی روایت ایک اذیت ناک کرب روز و شب پر محیط، اور تحویل میں ایک جگنو بھی نہیں۔ کوئی ویرانی سی ویرانی ہے، وحشت، خوف اور بربریت کی حکمرانی ہے۔ جبر کی سنگلاخ چٹانوں میں راستہ بنانا دشوار ہو رہا ہے۔ لیکن ایک زندہ اور توانا احساس اس اندوہناک پس منظر میں بھی سانس کی ڈوری کو ٹوٹنے نہیں دیتا اور دل کی ہر دھڑکن کا

جواز فراہم کرتا ہے۔ وہ زندہ اور توانا احساس دہلیز مصطفیٰؐ سے رزقِ شعور پاتا ہے۔ وہ حسین وجمیل احساس یہ ہے کہ میرا ہر لفظ باوضو ہو کر اور میری ہر سانس احرام باندھ کر والی کون و مکاں کی بارگاہِ اقدس میں سربسجود ہے، کشکولِ آرزو زرِمعتبر سے لبریز ہے، بازارِ مؤدت کا سب سے مستند حوالہ، امیر وفقیر، شاہ و گدا کی کوئی تفریق نہیں، عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر کوئی فوقیت حاصل نہیں، یہ زندہ اور توانا احساس اُس پیکرِ جمال کے نقوشِ پا کے تصدق میں ظہور پذیر ہونے والے بے مثال اور لازوال موسموں کی رعنائیوں اور شادابیوں سے اکتسابِ نمو کر رہا ہے جو مقصودِ تخلیقِ دو عالم بھی ہے اور ممدوحِ ربِ دوجہاں بھی، کائناتِ رنگ بو میں اُترنے والی ہر ساعت ہر لمحہ اور ہر گھڑی حرفِ ثنا لبوں پر سجا کر جس انسانِ کامل کی چوکھٹ پر اذنِ باریابی کی منتظر ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ کب خلعتِ انوارِ عشق مصطفیٰ ﷺ کلکِ بامراد کو عطا ہوئی، میں نہیں جانتا کہ کب سے نزولِ آیتِ عشقِ نبی کی بادِ بہاری گلشنِ ہستی کی روش روش پر مہک رہی ہے، مجھے نہیں خبر کہ کب منصبِ نعت گوئی کا زائچہ ہاتھ پر رقم ہوا، اور کب اور کہاں متاعِ قلب وجگر مکینِ گنبدِ خضرا کے نعلین پاک پر نثار ہوئی۔ مجھے تو یوں لگتا ہے، جیسے ازل سے درودوں کے گجرے اور سلاموں کی ڈالیاں لیے غریبوں کے والی اور یتیموں کے مولا کے حضور دست بستہ کھڑا ہوں اور حکمِ خداوندی بجا لا رہا ہوں۔ ذاتِ باری تعالیٰ خود نبی مکرم پر درود بھیجنے کا اعلان کر رہی ہے اور ایمان والوں کو حضور رحمتِ عالم ﷺ پر کثرت سے درود و سلام بھیجنے کا حکم دے رہی ہے۔

## دل سے بے جواز لمحوں کی رخصت

ایک شاعرِ بے نوا کی اوقات ہی کیا ہے۔ ذرّے کو آفتاب سے کیا نسبت اور جس کی حیثیت ایک ذرّے کے برابر بھی نہ ہو! جب اپنے من کی دنیا میں جھانک کر دیکھتا ہوں تو عجز و انکسار کے پانیوں میں ڈوب جاتا ہوں، کلماتِ عجز روح کی گہرائیوں سے

اُبھرتے ہیں، ہرطرف توصیفِ مصطفٰے ﷺ کے پھولوں کی بہار دکھائی دیتی ہے، نعتوں کی اَن گنت کہکشائیں حریمِ دیدہ و دل میں پَر فشاں نظر آتی ہیں تو صدیوں کی تھکن ایک پل میں کافور ہو جاتی ہے۔ جبر کی سنگلاخ چٹانوں میں راستے خود بخود قدموں کی پذیرائی کے لیے نکلنے لگتے ہیں، محرومیوں اور ناکامیوں کی راکھ ادھ کھلی کلیوں میں تبدیل ہو جاتی ہے، اطمینان اور سکون کی ایک گنگناتی ہوئی لہر بڑھ کر اپنے بازوؤں میں لے لیتی ہے۔ رنگوں، روشنیوں اور خوشبوؤں کی چادر روح اور بدن کے ہر زخم کو ڈھانپ لیتی ہے، فکر و نظر کے ویران جزیروں پر بادِ صبا رتجگے منانے لگتی ہے، دل کے آنگن سے بے جواز لمحے رخصت ہونے لگتے ہیں، دامنِ اُمید اعتماد و اعتبار کی دولت سے بھر جاتا ہے، سر خود بخود احساسِ ممنونیت سے جھک کر بارگاہِ خداوندی میں سجدۂ شکر بجالاتا ہے اور نغمۂ حمد لبوں سے چھلک پڑتا ہے۔ ایک تہی دامن، بے نوائے شہر، ملکِ سخن کی شاہی کو اپنے ہمرکاب پاتا ہے۔

## مدحت کی وقت سے ماورائیت

سچ تو یہ ہے کہ دست قدرت نے مدحتِ رسول ﷺ کے باب میں لفظِ زوال درج ہی نہیں کیا، یہ سرمدی نغمہ تو ازل سے لامکاں کی وسعت میں گونج رہا ہے اور ابد کے بعد لامکاں میں بھی یہی نغمہ سنائی دے گا، اپنے محبوب ﷺ کے ذکر کو بلند کرنے والا اس جہانِ رنگ و بو کا مالک و خالق ہے جو اوّل بھی ہے اور آخر بھی، جو حی بھی ہے اور قیوم بھی جو خبیر بھی ہے اور علیم بھی۔ اگر نعت کے معانی معلوم کرنا ہوں، اگر نعت کا مفہوم و مقصود مطلوب ہو اور جستجو ہو کہ نعت کسے کہتے ہیں تو خدائے لم یزل کی آخری کتاب قرآن مجید کی دل کی آنکھوں سے تلاوت کرنا چاہیے، تاجدارِ کائنات کا چہرۂ اقدس ورق ورق پر جلوہ گر نظر آئے گا۔ قرآن ایک مسلسل نعت ہے، ہر سمت سرکار ﷺ کے محامد و محاسن کی دھنک، ہر طرف اُنہیؐ کے تذکارِ جلیلہ کی روشنی، یہ نعت خود خالقِ ارض و سماوات نے کہی ہے، دستِ قدرت نے خود اپنے محبوب ﷺ کے شمائل و فضائل کی قندیل فروزاں کی ہے، فطرت نے

خود گلستانِ ثنا کی حنا بندی کی ہے اور حضور ﷺ کا شاعر سنتِ ربِ جلیل کا پرچم لیے فصیلوں پر ثنائے رسول کے چراغ سجا رہا ہے، نفس نفس وفا شناسی کے پودے لگا رہا ہے اور اپنے کج مج سے لفظوں میں اسمِ محمد ﷺ کی خوشبو بکھیر رہا ہے اور حشر کے دن بوقتِ عدل داورِ محشر کے حضور اپنی بیاضِ نعت لئے حاضری کا آرزومند ہے۔

## کیفیاتِ حضوری

یہ جون 1985 کا واقعہ ہے، رمضان المبارک کے آخری عشرے کا آغاز ہو چکا تھا، بخت نے یاوری کی، مقدّر کا ستارہ چمکا اور ایک دن، جو صدیوں پر محیط تھا، جس کا سورج آج تک میرے وجدان میں غروب نہیں ہوا، بادِ صبا گلزارِ نبی ﷺ سے حضوری کا پروانہ لے کے آ پہنچی۔ جی چاہا دیوانہ وار گلیوں میں نکل جاؤں، رقص کرتے کرتے تتلی بن جاؤں اور سوئے مدینہ اُڑ جاؤں... ایک عجیب کیف کا عالم تھا، یوں محسوس ہوا جیسے ازل سے سفر میں ہوں اور قافلۂ شوق شہرِ نبی ﷺ کی جانب رواں دواں ہے۔ حضوری کے تصور سے لہو کی ایک ایک بوند ناچ اُٹھی، ہر موئے بدن حرفِ سپاس بن گیا۔ اور پھر سچ مچ بادِ صبا اُنگلی پکڑ کر مجھے میرے حضور ﷺ کی بارگاہ میں لے گئی، مدینہ پاک کی ہوائے خنک میں سانس لینے کا اعزاز حاصل ہوا، شہرِ حضور ﷺ کی معطر و معنبر گلیوں میں سراغِ نقشِ پائے حضور ﷺ میں قدم قدم، قدم بوسی کا شرف حاصل ہوا، بے تاب نظروں کو طوافِ گنبدِ خضرا کی سعادت نصیب ہوئی، سنہری جالیوں کی ٹھنڈک قلبِ تپیدہ کو خنک ساعتوں کے لمس سے ہمکنار کر گئی۔ کیا عرض کروں، نہ زبان میں اتنی سکت ہے کہ بیان کے مرحلے سے گزر سکے اور نہ لفظوں میں اتنی جرأت کہ اظہار کے لیے لب کھول سکیں۔ میں نے ان جاگتی آنکھوں سے درِ آقا ﷺ پر جذبات و احساسات کی بیساکھیوں کو ٹوٹتے اور لفظوں کو ہوا میں تحلیل ہوتے دیکھا ہے۔ لمحاتِ حضوری کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ہر چیز سیلِ اشکِ رواں میں بہہ جائے۔ اور اندر کی ہر کثافت دُھل جائے اور مطلعِ کشورِ دل پر ستاروں کے جھرمٹ اُتر آئیں۔

## ’’زرِمعتبر‘‘ کی قبولیت کا منظر

’’زرِمعتبر‘‘ میں درِاقدس کی حاضری سے پہلے تک کا کلام شامل ہے۔ کلماتِ تشکر و امتنان استاذ مکرم حضرت آسی ضیائی کے لیے جنہوں نے ہاتھ پکڑ کر مجھے لکھنا سکھایا، ہر قدم پر میری اصلاح ہی نہیں رہنمائی بھی کی۔ اِس صحیفۂ نعت میں شامل تقریباً سبھی نعتیں مواجہ شریف میں کھڑے ہو کر سردارِ کائنات کی خدمتِ اقدس میں پیش کرنے کی لازوال سعادت حاصل ہوئی: حضور ﷺ مطلع عرض کیا ہے، آقا ﷺ یہ شعر دیکھئے، مولاؐ مقطع ملاحظہ فرمایئے۔ فارسی، اردو، پنجابی کے تقریباً ساڑھے تین سو شعرا کا ایک ایک نعتیہ شعر بھی ڈائری میں لکھ رکھا تھا۔ یارسول اللہ! یہ ہمارے احمد ندیم قاسمی ہیں، انہوں نے آپ ﷺ کی بارگاہِ بیکس پناہ میں یہ شعر نذر کیا ہے، حضور ﷺ قبول فرمایئے، یہ ہمارے حفیظ تائب ہیں ان کا یہ شعر سماعت فرمایئے اور انہیں ردائے شفا عطا کیجئے....

آقا ﷺ میرے گھر کا بچہ بچہ سلام عرض کر رہا تھا، ننھے مُنے بچے دونوں ہاتھ اٹھا کر سلام کہتے تھے۔ حضور ﷺ سب کنیزیں دست بستہ کھڑی تھیں، سرکارؐ، میرا پاکستان آپ کے غلاموں کا حصارِ آہنی ہے، حضور ﷺ اغیار نے اس کا مشرقی بازو کاٹ لیا ہے۔ آقاؐ میرے وطن پر کرم اور مسلسل کرم، آقاؐ میرے وطن کی ہواؤں کا سلام قبول کیجئے۔ ایک غلام اپنے آقا ﷺ کی بارگاہ میں سر جھکائے مجرموں کی طرح کھڑا تھا، ستونوں کے پیچھے چھپ رہا تھا، آنسوؤں، ہچکیوں اور سسکیوں کی زبان میں اپنے حضور ﷺ سے نجانے کیا کچھ کہتا رہا اور نجانے کیا کچھ کہتا رہے گا... ایک عجیب سی تمنا دل میں مچلتی رہتی ہے کہ مرنے کے بعد بھی سپاس گذاری کا یہ سلسلہ جاری رہے اور حشر کے دن جب ہجومِ تشنہ لباں میں مَیں بھی گُم صُم کھڑا ہوں تو حضورؐ فرمائیں کہ آؤ ریاض آج بھی کوئی نعت سناؤ اور میں بڑھ کر اپنے آقا ﷺ کے قدموں کو تھام لو۔

ریاض حسین چودھری

۲۳ جنوری ۱۹۹۵، لاہور

# آیۂ کائنات کا معنیٔ دیریاب تو

(ریاض حسین چودھریؒ کا دوسرا نعتیہ مجموعہ ''رزقِ ثنا'' جون ۱۹۹۹ء میں شائع ہوا۔ اس کا مختصر تعارف پروفیسر ڈاکٹر عاصی کرنالی نے لکھا جب کہ ریاض نے اس موقع پر اپنا قلبی اور روحانی احوال اس عنوان سے شامل کیا۔)

علم، حکمت اور دانائی مومن کی گمشدہ میراث ہے۔ بدقسمتی سے ہم اس میراث کے اہل ثابت نہیں ہوسکے۔ طاقِ جاں میں جلنے والے چراغ خودغرضی پر مبنی مفادات اور وحشی خواہشات کی تیز آندھیوں اور شرک و الحاد کی طوفانی بارشوں کا سامنا نہ کرسکے اور اپنے دائرہ تصرّف میں آنے والی ہر چیز کو اجالنے کا ہنر بھی رفتہ رفتہ کھو بیٹھے۔ نتیجہ اس کا یہ برآمد ہوا کہ امت مسلمہ شبِ جہالت کے گھپ اندھیروں میں اپنے نظریاتی تشخص سے بھی محروم ہوتی چلی گئی۔ چنانچہ آج نظریاتی تشخّص کی تلاش تو ایک طرف ہم اپنی ثقافتی اکائی کے تحفظ کے لیے بھی خود کو ذہنی طور پر تیار نہیں پاتے۔ صدیوں تک اجتماعی سطح پر، اس گمشدہ میراث کی بازیابی کی کوئی سنجیدہ کوشش ہمارے دامنِ تحقیق وجستجو میں دکھائی نہیں دیتی۔ ہم نے علمی پسماندگی کو اپنے گلے کا ہار بنالیا، دامنِ آرزو کی ساری مشعلیں گُل کرکے ہم نے نامرادی کے اندھیروں کو اپنا مقدّر سمجھ لیا اور بانجھ ساعتوں کی فصلیں کاٹنے کی مشقّت خوشی خوشی قبول کرلی۔

تاریخ کی بکھری ہوئی کڑیوں کو ملایئے تو محرومیوں اور ناآسودگیوں کی ایک دلخراش داستان مجسم سوال بن کر ہمارے سامنے آن کھڑی ہوتی ہے۔ اس فکری انحطاط اور

ذہنی زوال کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ علم کی مشعل جو ہمارا سب سے بڑا ثقافتی اعزاز تھا ہم سے چھین لی گئی۔ سقوطِ بغداد اور سقوطِ غرناطہ کے المیے اسلامی سلطنتوں کے خاتمے کا نوحہ تو بیان کرتے ہیں لیکن علم کی روشنی اور دانش کی تابندگی کے بہیمانہ قتلِ عام پر کسی کی آنکھ سے کوئی آنسو نہیں ٹپکتا۔ شاید اس لیے کہ ہم نے لفظ احتجاج کو بھی اپنی لغت سے خارج کر کے اس جمودِ مسلسل پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی ہے جو دیمک کی طرح ہماری عظیم الشان روایات کے ذخیرے پر صدیوں سے حملہ آور ہے۔ گویا ہم عظمتِ رفتہ کی بازیابی کا ہر خواب اپنی بے عملی اور بے حسی کی قبر میں دفن کر چکے ہیں۔ نعت اپنی دونوں ہتھیلیوں پر علم کے چراغ سجا کر جہالت کے اندھیروں کے خلاف جہاد کا اعلان کرنے کا نام ہے۔ اتباعِ رسول ﷺ کی جمالیاتی تفسیر کو نعت کہتے ہیں۔ نعت حضور ختمی مرتبت ﷺ کے انقلابی کردار کی علمی توجیہہ کا نام ہے۔ رعنائیوں کے جھرمٹ میں سیّاحِ لامکاں ﷺ کے فضائل، شمائل اور خصائل کا بیان نعت کے ثقافتی آہنگ کا سب سے بلیغ استعارہ ہے۔ نعت ان لمحاتِ حضوری کی سرشاریوں کی عطا ہے جن میں شب کے پچھلے پہر پلکوں پر آنسوؤں کی کناری سی سجنے لگتی ہے اور شاعرِ خوشنوا چشمِ تصور میں ہوائے خلدِ مدینہ سے ہمکلامی کا شرف حاصل کرتا ہے۔ حضور ﷺ علم کا شہر ہیں اس لیے تحریکِ اسلامی فروغِ علم کی بھی تحریک ہے۔ نعتِ حضور ﷺ گویا عظمت و شوکت کے دنوں کی واپسی کا تمہید نامہ بھی ہے اور عظمتِ رفتہ کی بازیابی کی ایک شعوری سعی بھی ہے جو جمالیاتی سطح پر اپنی انفرادی اور اجتماعی محرومیوں اور ناکامیوں کا ادراک کر کے ایک بار پھر انسانیت کو معلّمِ اعظم حضور سرورِ کونین ﷺ کی دہلیز سے جبینِ شوق کے سجدوں کی استواری کی آرزو مند ہے۔ نعت ہمارے ثقافتی تشخص کا سب سے مربوط، محفوظ اور مضبوط حوالہ بھی ہے۔ شہرِ علم ﷺ کے مقدّس، معطر اور معنبر دروازوں پر اپنی پلکوں سے دستک دینا اس کے بنیادی مقاصد میں شامل ہے۔ جب مکینِ گنبدِ خضرا ﷺ کی چوکھٹ سے وابستگی کا احساس عمل کا پیرہن اپنے بدن پر سجانے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو فکر و نظر

کی منڈیروں پر شعور و آگہی کے ان گنت چراغ جل اٹھتے ہیں اور علم و دانش کے ان چراغوں کی روشنی میں منزلیں خود بڑھ کر غلامانِ مصطفیٰ ﷺ کے قدموں کو بوسہ دینے کا اعزاز حاصل کرتی ہیں یعنی عظمتِ رفتہ کی تلاش کا پہلا اور آخری راستہ ممدوحِ ربِ دوجہاں ﷺ کی نعت نگاری ہے کہ تاجدارِ کائنات ﷺ سے غلامی کے رشتوں کو استوار کئے بغیر کوئی حوالہ بھی معتبر حوالہ قرار نہیں پا سکتا۔ نعت عروسِ دیارِ سخن ہے کہ اسے منصبِ دفاعِ رسولؐ عطا ہوا ہے اور دفاعِ رسولؐ ہی دفاعِ اسلام ہے۔ گویا اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کا ہر تصور بھی حضور ﷺ کی نعت کے دامنِ خوش رنگ میں اجاگر ہوتا ہے، شاخِ نعت پر اس تصور کو اذنِ نمود ملتا ہے تو اس کی خوشبو چار دانگ عالم میں پرچمِ توحید بن کر لہرا اٹھتی ہے۔ بستی بستی، قریہ قریہ اللہ کی وحدانیت کا پھریرا کھلتا ہے۔

ادب اپنے عہد کے تخلیقی اور سماجی رویوں کی کوکھ سے جنم لینے والی خوشبو کا نام ہے اور خوشبو کا امتیازی وصف یہ ہے کہ زمان و مکان کی حد بندیوں سے ماوراء ہوتی ہے۔ یہی خوشبو جب حسن و جمال کے پیکر میں ڈھلتی ہے اور جذبات کی شبنم کے خنک اور گداز لمس سے ہمکنار ہوتی ہے تو لوحِ احساسات پر شعر کے نزول کی شفق پھوٹتی ہے۔ شاعری جب دہلیزِ مصطفیٰ ﷺ کو چوم کر کیفِ دوام میں سرشار ہوتی ہے اور تخلیقی سطح پر خود سپردگی دائرہ عمل میں آتی ہے تو نعت قرطاس وقلم کو اپنے وجود کے اظہار کا اعزاز بخشتی ہے۔ اس وقت تک کسی لفظ کے سر پر فضیلت کا عمامہ نہیں سجایا جاتا جب تک وہ سیّدہ آمنہ علیہا السلام کے لال ﷺ کی قدم بوسی سے اعتبار کی سند اور غبارِ راہِ مدینہ کو اپنی آنکھوں کا سرمہ بنانے کی سعادت حاصل نہ کرلے۔ نعت کائنات ہے اور کائناتِ نعت سے ماوراء کوئی شے نہیں، ہر تخلیق کائناتِ نعت میں موجود ہے۔

جدید اردو نعت میں استغاثے کا رنگ نمایاں ہے کربلائے عصر میں تشنہ لبی کا

المیہ اتنا گھمبیر اور سنگین ہے کہ ساقیِ کوثرﷺ کے درِ اقدس کے سوا نظریں ہیں کہ کہیں اور ٹھہرتی ہی نہیں، نعت اپنی ثقافتی اکائی کے گرد منڈلاتے ہوئے خطرات سے گھبرا کر دامنِ مصطفیٰﷺ میں پناہ لینے کی ایک شعوری کوشش ہے جو ہمیشہ کامرانی سے ہمکنار ہوتی ہے۔ مسدسِ حالی اور اے خاصۂ خاصانِ رسلؐ کی بازگشت ابھی تک سنائی دے رہی ہے۔ اپنے عہد کا سارا آشوب آئینہ نعت میں دیکھا جاسکتا ہے۔ خوش آئند بات یہ ہے کہ نعت کے حوالے سے اسوۂ حسنہ کی پیروی کا شعور ایک تحریک بنتا جارہا ہے۔ معاشی ناانصافیوں اور معاشرتی ناہمواریوں سے لے کر ذات کے آشوب تک قدم قدم پر محرومیوں کی راکھ اپنے دامنِ دل میں سمیٹتا ہوا آج کا انسان سماجی اور معاشرتی عدل کے حصول کا تمنائی ہے اور نعت کا وسیع ہوتا ہوا کینوس تفہیم کے اَن گنت ذائقوں سے اسے روشناس کرارہا ہے۔ آج سے چودہ سو سال قبل جب فاران کی چوٹیوں پر آفتابِ رشد و ہدایت طلوع ہوا تو اس کے جَلو میں اُفق در اُفق دائمی امن کی بشارتیں بھی تحریر ہوئیں۔ نعت ان بشارتوں کی تعبیر کا وسیلۂ جلیلہ ہے۔ امن کی خواہش آج کے انسان کی سب سے بڑی خواہش ہے اور نعت اس خواہش کی تکمیل کا سب سے مؤثر ذریعہ ثابت ہوسکتی ہے کہ پیغمبرِ انقلابﷺ نے جس پرامن، نیک اور صالح معاشرے کی بنیاد رکھی تھی آج اس عہدِ ناپرُساں میں اس معاشرے کا قیام اسی صورت میں ممکن ہے کہ خود حضورﷺ کی ذاتِ اقدس سے اس قلبی، حبّی اور عشقی رابطے کو مزید مستحکم بنایا جائے جسے اصحابِ رسول کے کشکولِ آرزو کا زرِمعتبر تسلیم کیا گیا ہے اور جس زرِمعتبر کے بغیر بازارِعشق میں یوسف تو کیا سوت کی ایک اٹّی بھی نہیں خریدی جاسکتی۔ نفاذِ اسلام اور نفاذِ عدل دو مختلف چیزیں نہیں۔ جدید اردو نعت میں بھی یہی شعور فروغ پذیر ہے کہ ہمیں نفاذِ عدل کے ذریعہ انسانی معاشروں کو حیوانی معاشروں میں تبدیل ہونے سے بچانا چاہئے۔ اسی صورت میں انسان کے بنیادی حقوق کے تحفظ کی ضمانت دی جاسکتی ہے ورنہ جنگل کا قانون آج کے انسان کے مقدّر پر مسلّط کردیا جائے گا۔

پاکستان اسلامی تشخّص کی تلاش کا دوسرا نام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جدید اردو نعت میں پاکستان کا حوالہ اپنی پوری تخلیقی توانائیوں کے ساتھ موجود ہے۔ 65ء کی پاک بھارت جنگ نے ہمیں اپنے ہونے کا احساس دلایا تھا اور 28 مئی 1998ء کو پاکستان کے ایٹمی دھماکوں کی کوکھ سے پھوٹنے والے لمحۂ مسّرت نے از سرِ نو مسلم امہ کو اپنی پہچان کا شعور عطا کیا ہے۔ یہ شعور مسلم امہ کی سوچوں کا مرکز و محور بنا ہے کہ پاکستان عالمِ اسلام کی پہلی دفاعی لائن ہے اور یہ کہ پاکستان پوری ملتِ اسلامیہ کی امانت ہے اور اس امانت میں خیانت کا تصوّر بھی مسلکِ عشق سے غدّاری کے مترادف ہے۔

وہ فاقہ کش مسلمان جو صدیوں پر محیط عہدِ ناروا کے صدمات برداشت کرتا چلا آرہا ہے، محرومیوں، ناکامیوں اور نامرادیوں کی دستاویز جس کے دونوں ہاتھوں میں تھمادی گئی ہے، جس کا جسم ہی نہیں روح بھی زخموں سے چور چور ہے، بے پناہ افرادی قوت اور مادی وسائل کی فراوانی کے باوجود بے توقیری کی فصلیں کاٹنا جس کی جوان نسلوں کا مقدّر بنادیا گیا ہے، عظمت، تمکنت اور وقار جیسے الفاظ جس کی لغتِ عمل سے حذف کردیئے گئے ہیں جو آئینہ خانے میں خود اپنے آپ کو شناخت کرنے سے قاصر ہے، عظمتِ رفتہ کی بازیابی کی آرزو بھی جس کے سینے میں دم توڑ چکی ہے اور جو سوکھے ہوئے پتوں کی طرح تیز و تند ہواؤں کے رحم و کرم پر ہے، وہ مسلمان جس کی سوچوں کے تمام کواڑ مقفّل کردیئے گئے ہیں، بے غیرتی، بے حمیتی اور بے عملی کا زہر جس کی رگ رگ میں سرایت کرچکا ہے، جو اپنی عظیم روایات سے رشتہ توڑ کر گمراہی کے اندھیروں کے گہرے سمندروں میں گم ہوتا جارہا ہے، غبارِ تشکیک میں شبہات اور ابہام کی فصلیں کاٹتے کاٹتے جس کے دونوں بازو شل ہوچکے ہیں، وہ مسلمان جس کے سارے ثقافتی اثاثے لٹ چکے ہیں اور جو سر اٹھا کر چلنے کی خوئے دلنواز کو بھی جمودِ مسلسل کے برف زاروں میں گم کرچکا ہے وہ مسلمان اپنی تمام تر محرومیوں، کوتاہیوں اور خامیوں کے باوجود ایک جذبے کو اپنے سینے سے لگائے

ہوئے ہے اور ابلیسی سازشوں کے اژدہام میں اس نے جس چنگاری کو بجھنے نہیں دیا وہ عشقِ رسول ﷺ کی چنگاری ہے جو ازل سے اس کے سینے میں سلگ رہی ہے۔ اقبالؒ جسے روحِ محمدؐ سے تعبیر کرتے ہیں دشمنانِ اسلام اپنی تمام تر علمی خیانتوں، تحقیقی لغزشوں اور فکری مغالطوں کے باوجود اس فاقہ کش مسلمان کے جسم سے روحِ محمدؐ کو نکالنے میں ناکام رہے ہیں۔ نعت اسی روحِ محمدؐ کے جمالیاتی اظہار اور شعری پیکر کا نام ہے۔ آخرِ شب تصورِ محبوبِ کبریا ﷺ میں آنکھیں جن موتیوں سے لبریز ہوجاتی ہیں، دامنِ آرزو جن آنسوؤں سے بھیگ جاتا ہے اور پلکوں پر جو ستاروں کے جھرمٹ سے اتر آتے ہیں وہی موتی، وہی آنسو اور وہی ستارے ثنا کا رزق ہیں اور رزقِ ثنا اِسی وژن کی عکس بندی کی کہانی ہے۔ وہ کہانی جو ذاتِ مصطفیٰ ﷺ سے شروع ہوکر ذاتِ مصطفیٰ ﷺ پر ختم ہوجاتی ہے۔

ریاض حسین چودھری

لاہور: 28 مئی 1999ء

# لمحاتِ حاضری کی تمنا لئے ہوئے

(''تمنائے حضوری'' ریاض حسین چودھریؒ کا تیسرا نعتیہ مجموعہ ہے جسے انہوں نے بیسویں صدی کی آخری طویل نظم قرار دے کر جون ۲۰۰۰ء میں شائع کیا اور اکیسویں صدی کے نام منسوب کیا یہ کہہ کر کہ یہ صدی بھی میرے پیمبر ﷺ کی صدی ہے۔اس کی یہ تعارفی تحریر ریاض نے خود تحریر کی اور اپنی وارداتِ حضوری کو حضوری ہی کی کیفیت میں لکھا اور اپنے قارئین کو تحفہ نذر کر دیا۔اس کی پیراگراف سرخیاں مضامین کو اجاگر کرنے کے لئے مرتب نے لگائی ہیں۔)

## گدازِ جاں کا لمسِ لطیف

ممدوحِ ربِ ارض و سماوات ﷺ کی بارگاہِ بے کس پناہ میں حاضری کی تڑپ اور حضور کی متاعِ آرزو غلامانِ رسولِ ہاشمی ﷺ کے دلوں کی ہر دھڑکن کا منتہائے عزیز ہے، گنبدِ خضرا کی ٹھنڈی میٹھی چھاؤں میں جبینِ شوق کے سجدوں کی بیتابی گدازِ جاں کے لمسِ لطیف سے ہمکنار ہو رہی ہے، طائرانِ تخیل کی پرواز کی ابتدا بھی تاجدارِ کائنات ﷺ کی چوکھٹ کی خاکِ انور ہے اور ان کی انتہا بھی غبارِ درِ حضور ﷺ کی تجلیات سے مستنیر ہے، کائناتِ رنگ و بو کے ذرے ذرے میں خالقِ کائنات کے اس شاہکارِ عظیم کی محبت کے چراغ روشن ہیں کہ سرابِ نظر کی ہلکی سی دھند کا پرتو بھی اقلیمِ خیالِ پیغمبرِ آخر ﷺ کی فصیلوں پر نہیں پڑا۔

یہی محبت، عقیدت کے پیرہن میں سجتی ہے تو کارکنانِ قضا و قدر اسے محبوبیت

کی خلعتِ فاخرہ سے بھی نوازتے ہیں اور اس کے دامنِ آرزو میں لطف و عطا کی کرنوں کے پھولوں سے سرمدی رتجگوں کا اہتمام بھی کرتے ہیں۔ اسی لئے شمع رسالت کے پروانے، شہر نبی ﷺ کی گلیوں کے دیوانے درِ اقدس کی حاضری کو اپنی زندگی کے سفر کی معراج سے تعبیر کرتے ہوئے اپنی غلامی کے نیاز مندانہ حوالے کو بجا طور پر اعتبار و اعتماد کی اسنادِ جلیلہ کا سزا وار گردانتے ہیں، روایات میں آتا ہے کہ نبی آخری الزمان ﷺ کے دربارِ پرانوار میں صبح و شام ملائکہ آسمانوں سے اتر کر حاضری کے شرف سے مشرف ہوتے ہیں اور آقا حضور ﷺ کی بارگاہِ اقدس میں درودوں کے گجرے اور سلاموں کی ڈالیاں پیش کرنے کا اعزازِ لازوال حاصل کرتے ہیں۔ اس اعزازِ لازوال کی آرزو ہم جیسے گنہگار، خطا کار اور سیہ کار امتیوں کے بحرِ تمنا میں امواجِ شوق کا طوفان اٹھاتی رہتی ہے۔ اس لئے کہ سوچوں کا یہی اضطراب اور تمناؤں کی یہی بیتابی زندہ و متحرک جذبوں کی بقا و سلامتی کی ضامن ہے۔

## حاضری کی آرزو کا چہرۂ منور

بچپن کے قصرِ دلکشا کے شفاف جھروکوں میں یادوں کے ان گنت فانوس روشن ہوتے ہیں تو جس معصوم خواہش کا چہرہ تصور کے آئینہ خانے میں ہر سمت تشنہ آرزوؤں کی پیاس بجھاتا دکھائی دیتا ہے وہ درِ آقا ﷺ پر حاضری کی آرزو کا چہرۂ منور ہے کہ ان گنت چہروں کے ہجومِ بے اماں میں اسی چہرے پر صبحِ ازل کا غازہ ہے اور اسی کے سر پر دستارِ فضیلت سجائی گئی ہے اور یہی چہرہ میری ہی نہیں میرے عہد کی پہچان بھی بنا ہے، گردشِ ایام نصف صدی کا فاصلہ طے کر کے بیسیویں صدی کی چھٹی دہائی میں داخل ہوتی ہے تو شعور کی آنکھ بہت سے عکس اپنے دامن میں محفوظ کر لیتی ہے، گھر کی فضا اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے ذکرِ پاک کے چراغوں سے روشن ہے، در و دیوار بھی آرزوئے حضور ﷺ کے گجرے

پانیوں میں ڈوبے ہوئے ہیں، ساعتیں درود پڑھتی ہیں اور پوری کائنات وجد میں آ جاتی ہے۔ نعتِ حضور کے پھولوں کی خوشبو کا آنچل فکر و نظر کے ہر زاویے پر محیط ہو جاتا ہے۔ چشمِ تصور اکثر حضور رحمتِ عالم ﷺ کی بارگاہ میں لے جاتی ہے، مدینے کے درو دیوار جانے پہچانے سے لگتے ہیں، یوں لگتا ہے جیسے میں ایک بھٹکا ہوا آہو ہوں اور دشتِ طیبہ کی آرزو میں زندگی کی پگڈنڈیوں پر رواں دواں ہوں۔ زندگی کا سفر نشیب و فراز کا سفر ہے۔ دشوار، کٹھن اور مشکل لمحات قدم قدم پر مزاحمت کی دیواریں چنتے ہیں، بچپن سے لے کر آج تک میرا معمول یہ رہا ہے کہ دشوار، کٹھن اور مشکل لمحات میں اللہ رب العزت کی بارگاہ میں دستگیری کی التجا کرنے اور مشکل کشائی کی درخواست گزارنے کے بعد آمنہؓ کے لال حضور ختمی مرتبت ﷺ کے درِ عطا پر بھی پلکوں سے دستک دینے کا اعزاز حاصل کرتا ہوں، آنکھیں بند کر کے ہونٹوں پر درودوں کے گلاب سجا لیتا ہوں اور پھر ادب و احترام کی تصویر بن کر درِ اقدس پر باریابی کی التماس گزارتا ہوں، خود کو مواجہ شریف کی دلکش فضا میں پاتا ہوں اور اپنے تمام مسائل اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ اپنے حضور ﷺ کی بارگاہ میں پیش کر کے نظرِ کرم کے لئے سرتاپا حرفِ انتظار بن جاتا ہوں۔

مجھے تو یہ سعادت اپنے بچپن ہی سے حاصل ہے
تصور میں درِ اقدس پہ جا کر چشم تر رکھنا

تصور کی تجلیات اور تمنائے حضوری کی چکا چوند

چشمِ تصور نے ہزار بار مدینے کی گلیوں کا طواف کیا ہے، قافلے والوں سے بچھڑ کر اس شہرِ خنک کی معطر اور معنبر گلیوں میں قصداً بھٹک جانے کی آرزو دل میں مچلتی رہتی ہے، میں نے ہر شب شہرِ پیغمبر ﷺ کے دریچوں کا چراغ بننے کی تمنا کی ہے، دنیائے تصور میں کئی بار گردِ راہ بن کر زائرانِ کوئے وفا کے قدموں کو بوسہ دیا ہے، مضافاتِ مدینہ میں

ہوائے مدینہ سے اکثر ہمکلامی کی سعادت حاصل ہوئی ہے، سگانِ مدینہ کی رضا کی طلب کئی بار تمناؤں کی کیاری میں بادِ بہاری کی طرح محوِ خرام رہی ہے، کئی راتیں شہرِ نبی ﷺ کے در و بام سے لپٹ کر رویا ہوں، تخلیق کی توانائیاں اور خیال کی رعنائیاں، اس خطہء نور کے دائرہ تصرّف سے کبھی باہر ہی نہیں آئیں۔ ایک دیوانے نے اس شہرِ دلآویز کے مکینوں خصوصاً مدینے کی گلیوں میں کھیلنے والے بچوں کے قدموں سے اٹھنے والی دھول کو اپنی پیشانی کا جھومر بنایا ہے۔ شہرِ حضور ﷺ کے چرند پرند سے والہانہ محبت کی ہے، اس قریہء بے مثال کے آسمانوں کی بلائیں لی ہیں، اس خطہء دیدہ و دل کی خاکِ مقدس کی آنکھوں نے کئی بار اپنے دامن میں چھپانے کی سعادت حاصل کی ہے، شہرِ رسول ﷺ کے در و دیوار سے ایک عجیب سی شناسائی کیف بن کر لہو کی گردش میں مقیم رہی ہے ؎

جب میں پہنچوں گا مدینے کے گلی کوچوں میں
ایک عالم مرا پہلے سے شناسا ہو گا

چشمِ تصور میں درِ اقدس کی حاضری کا یہ عمل بھی تمنائے حضوری کو ثمر بار بنانے کی ایک شعوری کوشش ہے۔ میں اکثر چشمِ تصور میں دیکھتا کہ میں ایک پرندہ ہوں اور ہوائے مخالف کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ازل سے مدینے کی جانب اڑ رہا ہوں۔ طیبہ کے اشجار پر بسیرا کرتا ہوں، گنبدِ خضرا کی تابانیوں سے دامنِ آرزو کو بھرتا ہوں۔ مدینہ منورہ میں ایک چھوٹے سے گھر کی آرزو غلامانِ پیغمبر ﷺ کے دلوں میں سوز و گداز کی ان گنت شمعیں جلا جاتی ہے۔ میں نے بھی مدینے کی گلیوں میں ایک چھوٹے سے گھر کی آرزو کر رکھی ہے:

بعد مرنے کے چلے جائیں گے سب سے چھپ کر
ایک گھر ہم نے مدینے میں بنا رکھا ہے

## تمنائے حضوری کی کونپلیں کب نمو پذیر ہوئیں!

یہ مضمون میری نعت کا بھی موضوع ٹھہرا ہے اور کئی بار شعر کے قالب میں ڈھلتا رہا ہے۔ حیاتِ مقدّسہ کا ایک ایک واقعہ تخیل کے نئے نئے گوشوں کے دامانِ طلب کا مقدر بنتا۔ یہی تمنا پیدا ہوتی کہ کاش مجھے بھی حضور ﷺ کا عہدِ مبارک ملا ہوتا اور مَیں بھی اپنے احساسِ غلامی کو قافلہء شوق کا پرچم بناتا۔ مجھے نہیں معلوم کہ مَیں کب سے نعت کہہ رہا ہوں۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اور حافظہ ساتھ دیتا ہے چھٹی یا ساتویں جماعت میں مَیں نے شہرِ سخن کی فصیلوں پر جلتے چراغوں کی روشنی سے اپنے آئینہء دل میں حیرت کی تصویریں بنانا شروع کر دی تھیں۔ بچپن سے لڑکپن اور لڑکپن سے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتا تو درِ رسول ﷺ سے نسبتِ غلامی کا حوالہ مزید مستحکم ہوتا چلا گیا۔ ہفت روزہ ’’قندیل‘‘ لاہور میں میری ایک نعت پہلی بار شائع ہوئی۔ اس کا مطلع ہے:

خدا کے جلووں میں جلوہ فرما تھے آپ ﷺ شمس و قمر سے پہلے
اُنہی ﷺ کا چرچا تھا لامکاں میں ہجومِ شام و سحر سے پہلے

### عید میلاد کی مبارکباد کے کارڈ کا اجراء

ایک ایک لمحہ حضوری کی آرزو کی تڑپ کی چادر میں لپٹا ہوا تھا۔ ایل ایل بی اور ایم اے کے امتحانات پاس کرنے کے بعد جب عملی زندگی میں قدم رکھا تو احساسِ غلامی کی تابندگی کو بھی ظہور کے لئے نئے آفاق نصیب ہوئے، یہ ۱۹۶۹ء کا زمانہ تھا۔ میں اکثر سوچتا کہ ہم عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے مواقع پر عزیز و اقارب اور دوست احباب کو عید کارڈ روانہ کرتے ہیں، عید میلاد النبیؐ پر ایسا کیوں نہیں کرتے؟ اپنے چھوٹے بھائی محمد اسد چودھری کے آرٹسٹ دوست ڈاکٹر شاہد رضا کی خدمت میں التماس کی کہ حضور ﷺ کے روضے

کا ڈیزائن تیار کریں، انہوں نے بڑی محنت سے میری فرمائش پوری کی، بلاک بنوایا، زمزمہ پرنٹنگ پریس سے پہلی بار میلاد کارڈ چھپوائے اور تعارفی خط کے ساتھ تمام بڑے بڑے اشاعتی اداروں، اخبارات اور تمام اسلامی ممالک کے سفراء کو میلاد کارڈ روانہ کئے جس کا انتہائی خوشگوار ردِعمل ہوا۔ ''روزنامہ نوائے وقت'' میں میلاد کارڈ کے اجرا کی خبر نمایاں طور پر شائع ہوئی۔ دوسرے سال بعض اشاعتی اداروں کی طرف سے جواباً نو بہ نو میلاد کارڈ موصول ہوئے تو میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اِس روایت کو زبردست پذیرائی ملی ہے کہ ربیع الاول کے ماہِ مقدس میں میری پلکوں پر تشکر کے آنسوؤں کی کناری سی لگ جاتی ہے۔ میلاد کارڈ کے اس اشاعتی سلسلے کا اجراء بھی تمنائے حضوری کو عملی صورت میں دیکھنے کی ایک سعی تھی جو اللہ کے بے پایاں فضل و کرم سے کامیابی و کامرانی سے ہمکنار ہوئی۔

میلاد کارڈ کی پشت پر چند کلمات بھی درج ہوتے مثلاً سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد جو میلاد کارڈ شائع ہوا اس پر یہ عبارت درج تھی کہ یارسول اللہﷺ آپ کی امت کی بیٹیوں کی عصمت کلکتے کی منڈیوں میں نیلام ہو رہی ہے۔ ''خونِ رگِ جاں'' کا اعزازی نسخہ اور میلاد کارڈ روزنامہ ''جنگ'' کے قطعہ نگار اور ممتاز شاعر رئیس امروہوی کی خدمت میں بھی ارسال کیا۔ جواباً انہوں نے مجھے سقوطِ مشرقی پاکستان کے موضوع پر نظم لکھنے کی ترغیب دی۔ چنانچہ میں نے ''عظیم المیہ'' کے نام سے ایک طویل نظم لکھی۔ اِس نظم میں بھی حضوری کی تمنا اشکوں میں ڈوبے ہوئے شعری پیکر میں تجسیم ہوئی۔

۱۹۷۰ میں سقوطِ ڈھاکہ سے قبل میرا پہلا مجموعہ کلام ''خونِ رگِ جاں'' کے نام سے شائع ہوا۔ اگرچہ اس میں ملی نظمیں شامل تھیں، اور سقوطِ ڈھاکہ کے آثار لاشعوری طور پر شعر کے قالب میں ڈھل گئے تھے تاہم تمنائے حضوری کی چمک ''خونِ رگِ جاں'' کی

منظومات میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔

## محافلِ نعت کا آغاز

اور پھر شہر اقبال کی ثقافتی اور مجلسی زندگی میں اظہارِ عقیدت کے نئے نئے دروازے وا ہوئے۔ تمنائے حضوری کو ایک نیا آہنگ ملا۔ ہر سال شبِ میلاد نعتیہ محفلِ مشاعرہ کے انعقاد کا آغاز ہوا، ان محافل میں عبدالعزیز خالد، حفیظ تائب، حافظ لدھیانوی، آسی ضیائی، حافظ محمد افضل فقیر، خالد بزمی، ہلال جعفری، راز کاشمیری، عباس اثر، اصغر سودائی، تاب اسلم، راجا رشید محمود، منیر قصوری، عابد نظامی، حسرت حسین حسرت، پروفیسر محمد اکرم رضا، جان کاشمیری، آفتاب احمد نقوی، انور جمال، خلیق ممتاز، کلیم سیالکوٹی، قمر یزدانی، قمر تابش، سید گلزار بخاری، اسلم ملک، ساغر جعفری، ابرار حسین ابرار، اعزاز احمد آذر، رشید آفریں، رفیق ارشد، از ہر منیر، شفیق مشفق، آثم میرزا، اطہر سلیمی، یونس رضوی، وارث رضا، میر عزیز، طارق اسماعیل، شفیع ضامن، محبوب شفیع، منظور کاسف، محمد یونس حسرت، حکیم افتخار فخر، اکرام سانبوی، جمیل نظامی، سردار شاہ جہان پوری، مرتضیٰ جعفری، آثم فردوسی، حکیم نیاز اور ارشد طہرانی جیسے ممتاز شعرا شریک ہوتے، نعتیہ کتب کی تقریبات رونمائی کا اہتمام بھی کیا جاتا۔ ازاں بعد مہمانانِ گرامی اور عمائدینِ شہر میلاد ڈنر میں شرکت کرتے۔ کشور دیدہ و دل میں حضوری کے چراغوں کا اجالا ہوتا کہ کاش ہمیں بھی حضور ﷺ کا مقدس زمانہ ملا ہوتا۔ طارق اسماعیل کا یہ شعر:

عالمِ وجد میں رقصاں مرا پَر پَر ہوتا
کاش میں گنبدِ خضرا کا کبوتر ہوتا

روح کی پہنائیوں میں رچ بس سا گیا۔ یہ شعر آج بھی قلب ونظر میں محبتِ

رسول ﷺ کی کہکشاں بکھیر رہا ہے، شعراء کے اکثر اشعار میں حاضری اور حضوری کی تمنا مچلتی دکھائی دیتی، شہرِ حضور ﷺ میں پہنچنے کی آرزو پَر پھیلاتی تو کیف و سرور کے ان گنت دروازے خود بخود کھل جاتے۔ خوشبوئے اسم محمد ﷺ پَر فشاں ہوتی تو ہرطرف اجالے بکھر جاتے، گدازِ عشقِ رسول ﷺ کی مشعل شبِ تنہائی میں تنہائی کا احساس نہ ہونے دیتی۔

## منہاج القرآن کی رفاقت اور درِ مصطفیٰ ﷺ سے بلاوا

غائبانہ طور پر پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری کے نام اور کام سے متعارف ہو چکا تھا۔ ٹی وی پر فہم القرآن میں انہیں دیکھا اور سنا تو یوں لگا جیسے چشمِ شوق اسی عاشقِ رسول کی منتظر تھی۔ ۱۳ جنوری ۱۹۸۵ کو لاہور میں خلیل الرحمٰن بھٹی جو بعد میں تحریک منہاج القرآن کے ناظم اعلیٰ بھی بنے، کے توسط سے پروفیسر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ڈاکٹر محمد عتیق افضل، عارف امین چودھری، چودھری محمد نعیم اور راقم ملاقات کرنے والوں میں شامل تھے۔ پروفیسر صاحب سے ملاقات کے بعد مسجد رحمانیہ میں مفتی محمد خان قادری جو اس وقت پروفیسر صاحب کے دستِ راست تھے، سے ملاقات ہوئی، ڈاکٹر صاحب اور عارف صاحب نے ان کے پاس دس دس ہزار روپے جمع کروائے۔ استفسار پر انہوں نے بتایا کہ ہم پروفیسر صاحب کے ساتھ عمرے پر جا رہے ہیں۔ چشمِ تصور نے گنبدِ خضرا کے جلووں کو بوسہ دیا۔ عرض کیا یارسول اللہ ﷺ نگاہِ کرم کا منتظر تو میں بھی ہوں۔ حضور ﷺ صبا کب حاضری کا پروانہ لے کر آئے گی۔ بہر حال اسی شام ہم واپس سیالکوٹ آ گئے۔ دوسرے روز والدِ مکرم الحاج چودھری عبدالحمید صاحب نے پروفیسر صاحب سے ملاقات کے بارے میں پوچھا تو میں نے انہیں بتایا کہ ڈاکٹر صاحب اور عارف صاحب نے عمرے کی ادائیگی کے لئے رقم جمع کرائی ہے۔ انہوں نے ایک لمحہ میرے چہرے کو پڑھا۔ فرمانے لگے تو تم

بھی تیاری کرو۔ بس پھر کیا تھا! مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ساری دنیا کی دولت میرے دامن میں ڈال دی گئی ہے۔ خوشی سے ساری رات سو نہ سکا۔ مفتی صاحب کے پاس میں نے بھی مطلوبہ رقم جمع کروادی لیکن بدقسمتی سے پروفیسر صاحب کے ساتھ میرا ویزہ نہ لگ سکا۔ یہ روداد میں اپنے سفر نامہ حجاز ''لبیک یارسول اللہ لبیک'' میں درج کر رہا ہوں، یہاں تفصیل کی گنجائش بھی نہیں۔ بہرحال رمضان المبارک کے آخری عشرے میں حضور ﷺ کے قدموں میں کھڑا تھا اور حاضری کے اعزاز سے سرفراز ہو رہا تھا۔

میرا اولین نعتیہ مجموعہ ''زرِ معتبر'' جس میں درِ اقدس کی حاضری تک کا نعتیہ کلام شامل ہے۔ ۱۹۹۵ میں اور دوسرا نعتیہ مجموعہ ''رزقِ ثنا'' ۱۹۹۹ میں شائع ہوا۔ ان مجموعوں کی نعتوں میں حاضری اور حضوری کی یہ تڑپ نمایاں ہے۔ ایک نعتیہ نظم ''سوال جس کا جواب تو ہے'' میں بھی براہِ راست اس آرزو کا اظہار ہوا ہے کہ یارسول اللہ! جب طائف کے بازاروں میں اوباش لڑکوں نے شقاوتِ قلبی کا مظاہرہ کیا تھا تو کاش میں بھی پتھروں کی بارش میں آپ ﷺ کے نقوشِ کفِ پا کو چوم رہا ہوتا، تمام پتھر اپنے سینے پر روک لیتا اور آپ ﷺ کے قدموں پر گر کر جان دے دیتا۔

کرۂ ارضی پر بسنے والی اولادِ آدم اکیسویں صدی کی دہلیز پر کھڑی تھی۔ بیسویں صدی دھیرے دھیرے اپنے اختتام کی طرف بڑھ رہی تھی۔ میری خواہش تھی کہ ۲۰۰۰ء میں اردو ادب کو تین نعتیہ مجموعے دوں، اس لئے کہ سلام شاد دو مجموعوں کی خطاطی کا کام تقریباً مکمل کر چکے تھے۔

## تمنا کی چنگاری شعلۂ جوالہ بن گئی

رمضان المبارک ۱۴۱۹ھ کا آغاز ہو چکا تھا۔ یہ جنوری ۱۹۹۹ کی ۱۵ تاریخ تھی۔

جمعۃ الوداع اور ۲۶ رمضان المبارک، اُس شب لیلۃ القدر تھی۔ ایک روحانی رتجگا دل و جاں پر محیط تھا۔ مَیں اپنی رہائش گاہ (ٹاؤن شپ لاہور) سے بہ ذریعہ ویگن ماڈل ٹاؤن میں واقع تحریکِ منہاج القرآن کے مرکزی سیکرٹریٹ کی طرف آ رہا تھا۔ سفر کے دوران ایک قطعہ ہوا، دفتر تک پہنچتے پہنچتے کئی مصرعے قرطاسِ ذہن پر نقش ہو چکے تھے۔ یہ چھٹی کا دن تھا۔ ڈاکٹر فریدالدین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بند تھا۔ میں نے اندر سے چٹخنی چڑھا لی اور اپنے کیبن میں آ گیا۔ قریۂ شعور میں احساسات کے قافلے اتر رہے تھے:

دست بوسی سے کبھی مجھ کو نہ فرصت ملتی
شہرِ سرکار ﷺ کے بچوں کا کھلونا ہوتا

ان دو مصرعوں نے مجھے اندر سے ریزہ ریزہ کر دیا، میں دیر تک دھاڑیں مار مار کر روتا رہا۔ یہاں خدا کے سوا مجھے دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔ حضور ﷺ کے عہدِ مبارک میں ہونے کی آرزو لفظوں کے پیرہن میں ڈھل گئی۔ حضوری کی مختلف کیفیات ذہن میں مرتب ہونے لگیں۔ الفاظ باوضو ہو کر دست بستہ سوچ کی راہداریوں میں کھڑے تھے اور پھر چند روز میں ۱۵۰ قطعات پر مشتمل طویل نظم ''تمنائے حضوری'' حیطہء ادراک سے حیطہء شعور میں آ چکی تھی۔

سکون اور اطمینان کا دریا میرے چاروں طرف موجزن تھا۔ عشقِ مصطفےٰ ﷺ کے پانیوں میں تَر اپنے ہونٹوں کو چوم رہا تھا وہ ہونٹ جنھوں نے مجھے فکر و نظر کے شاداب موسموں اور مخمور ساعتوں کے گدازِ جاں سے ہمکنار کیا ہے۔ میں نے اپنے ہاتھوں کے ساتھ اپنے قلم کو بھی بوسہ دیا اور اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔

حضوری کی یہ کیفیات مختلف اوقات میں مختلف انداز میں دیدہ و دل کو منور کرتی

رہی ہیں۔ یہی کیفیات سرمایۂ حیات اور زادِ سفر ہیں کہ ان کیفیات کا ایک ایک لمحہ ذکرِ رسول ﷺ کی سرشاریوں کا آئینہ دار رہا ہے۔

۱۹۹۹ء کا نومبر تقریباً خاموشی سے گزر رہا تھا ۸ نومبر میرا یوم پیدائش بھی ہے۔ میں عمر عزیز کے ۵۹ ویں سال میں داخل ہو چکا تھا۔ تحریکِ منہاج القرآن کے مرکزی سیکرٹریٹ میں واقع رازی ہال کے کمرہ نمبر ۱۲ میں مقیم تھا۔ اُن دِنوں مَیں پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی شہرآفاق تالیف ''سیرت الرسول'' کی جلد نہم (معجزات رسول) کی ترتیب و تدوین کا کام کر رہا تھا۔ نجانے کیوں میں ایک عجیب سی الجھن میں گرفتار ہو گیا۔ موت کا خوف مہیب بادلوں کی طرح میرے ذہن پر چھایا ہوا تھا۔ مجھے ہر طرف موت رقص کرتی ہوئی نظر آتی، میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایسا کیوں ہے؟ نہ میں جسمانی طور پر کسی عارضے میں مبتلا تھا اور نہ کوئی پریشانی دامن گیر تھی، میری چھٹی حس بتا رہی تھی کہ کچھ ہونے والا ہے۔ اشعار میں اِس انجانے خوف کا اظہار بھی ہو رہا تھا:

اُن ﷺ کی ثنا کے واسطے مانگی تھی زندگی
لیکن اسے بھی ملکِ عدم کی تلاش ہے

### چھٹی حس اور حادثے کا خوف

۱۲ نومبر کو اسلام آباد میں بم کے دھماکے ہوئے تو تشویش لاحق ہوئی کہ خدا خیر کرے، میرا بیٹا محمد حسنین مدثر اسلام آباد کے ایک تعلیمی ادارے میں ایم بی اے کی تیاری کر رہا تھا، اسلام آباد میں میری ہمشیرہ آپا عزیز، ان کے بیٹے میاں محمد عالمگیر اور ان کے بیوی بچے مقیم ہیں، راولپنڈی میں آپا حمیدہ کا گھرانہ آباد ہے۔ عارف شفیع، عظمیٰ اور ان کے بچے ہیں۔ میں نے طارق ریسٹورنٹ میں ۹ بجے کا خبرنامہ دیکھا تو اطمینان ہوا کہ کوئی

جانی نقصان نہیں ہوا۔

خبریں سن کر میں اپنے دفتر میں آیا، رات گیارہ بجے تک کام کرنا میرا معمول ہے۔ ابھی میں اپنے دفتر میں پہنچا ہی تھا کہ ایک عجیب سی کیفیت میں خود کو پایا۔ یوں لگا جیسے میں بے ہوش ہو رہا ہوں۔ یہ کیفیت تین چار سیکنڈ رہی، پھر سنبھل گیا۔ میں گھبرا کر اپنے دفتر سے باہر آ گیا۔ عزیز دوست محمد یونس مل گئے، انہیں صورت حال سے آ گاہ کیا۔ انہوں نے فوراً ڈاکٹر کو فون کیا۔ ڈسپنسر نے آ کر بلڈ پریشر چیک کیا اور بتایا کہ تشویش کی کوئی بات نہیں، بلڈ پریشر تھوڑا سا زیادہ ہے۔ اپنے کمرے میں جائیں میں ایک گھنٹے کے بعد دوبارہ آپ کو چیک کروں گا۔ میں یونس صاحب کو ساتھ لے کر کمرے میں آ گیا۔ رفتہ رفتہ میری طبیعت سنبھل رہی تھی۔ یونس صاحب نے میری استدعا پر اپنا بستر میرے کمرے ہی میں بچھا لیا۔ ڈسپنسر دوبارہ آیا، میرا بلڈ پریشر ۱۴۰ تک آ چکا تھا اس لئے وہ مطمئن ہو کر چلا گیا۔ میں نے اپنے ذہن کو ذکرِ حضور کی سدا بہار وادیوں میں گم کر دیا۔ یونس صاحب کو بیسیوں نعتیہ قطعات اور اشعار سنا ڈالے۔ میرے نبی ﷺ کا ذکرِ جمیل سوچ کے زخموں پر مرہم بن گیا۔ مجھے بے پناہ ذہنی سکون نصیب ہوا۔ البتہ نیند غائب ہو گئی۔ ایک انجانا سا خوف میرے دل و جاں پر محیط تھا۔ نمازِ فجر ادا کرنے کے بعد دفتر جانے کی تیاری کرنے لگا اور ناشتے کے بعد اپنی ڈیوٹی پر پہنچ گیا۔ اپنے ذہنی کرب کا ذکر کئی احباب سے کیا۔ اپنی چھٹی حس کے نامعلوم خدشات سے اپنے تحریکی ساتھیوں علامہ مسکین فیض الرحمٰن، حاجی غلام مصطفیٰ ملک، شوکت علی قادری، طاہر حمید تنولی، محمد علی قادری، محمد افضل قادری، عبدالجبار قمر، عبدالستار، علی اکبر الازہری، محمد فاروق اور سرفراز خاں کو آ گاہ کیا۔

میجر ریٹائرڈ انوار الحسین علوی سے فون پر رابطے کی کوشش کی لیکن ملاقات نہ ہو

سکی۔ ناصر اقبال نے مشورہ دیا کہ چند روز کے لئے سیالکوٹ چلا جاؤں۔ دوپہر کو کھانے پر طبیعت پھر خراب ہوگئی۔ سائرہ میموریل ہسپتال جا کر اپنی شوگر چیک کروائی تو وہ مطلوبہ لیول سے خطرناک حد تک کم تھی، رات ڈاکٹر اخلاق احمد بھٹہ صاحب کے ہاں گزاری، ہمشیرہ نسیم نے بھی یہی مشورہ دیا کہ چند روز کے لئے گھر چلا جاؤں۔ چنانچہ میں اسی روز گھر کے لئے روانہ ہوگیا۔''سیرت الرسول'' کا مسودہ میرے پاس تھا کہ ہفتے عشرے میں اسے مکمل کرلوں گا۔ سیالکوٹ میں ڈاکٹر محمد عتیق افضل، ڈاکٹر اعجاز رسول اور اپنے چھوٹے بھائی ڈاکٹر جنید حمید کے زیر علاج رہا۔ بلڈ پریشر تو ٹھیک ہوگیا۔لیکن موت کے خوف سے نجات نہ مل سکی۔ لاہور جانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ چھٹی حس عجیب وغریب منظر دکھا رہی تھی۔ بہر حال میں نے فیصلہ کرلیا کہ ۲۲ نومبر کو لاہور جا کر اپنی معمول کی زندگی شروع کردوں گا۔ کرب کے ان لمحات کو میں لمحاتِ حضوری میں تبدیل کر دینے کا آرزومند تھا۔ بار بارسینکڑوں نعتیہ اشعار پڑھتا رہا۔ میں نے ان لمحاتِ کرب میں اپنے رب سے اپنے گناہوں کی معافی مانگی کہ مولا تو قادرِ مطلق ہے اگر میرا آخری وقت آ گیا ہے تو میں تیری رضا کے آگے سر جھکاتا ہوں، تو میری خطاؤں سے درگزر کر، میرے مالک ان دنوں میں ''سیرت الرسول'' پر کام کر رہا ہوں، اِس کی تین جلدیں شائع ہونا باقی ہیں۔مولا! مجھے یہ کام مکمل کرنے کی مہلت دے دے، یا باری تعالیٰ! ساری عمر تیرے نبی ﷺ کی ثنا میں گزری ہے۔ تین چار نعتیہ مجموعے زیرِ ترتیب ہیں،''لبیک یارسول اللہ لبیک'' کے نام سے سفر نامہ حجاز مکمل کرنا چاہتاہوں، مولا! مجھے ان کتابوں کی اشاعت کے لئے وقت دے دے، ۲۲نومبر۱۹۹۹ (سوموار) کی صبح اپنی اہلیہ ساجدہ بیگم سے کہا کہ لاہور جانے کو میرا جی نہیں چاہتا۔ ایک انجانا سا خوف میرے ہم رکاب تھا۔ بہر حال اہلیہ کو خدا حافظ کہا، بچے اس وقت سو رہے تھے اور لاری اڈے پر پہنچ گیا۔

### حادثہ ہو گیا

فلائنگ کوچ تیار کھڑی تھی۔ فرنٹ سیٹ خالی تھی، سو میں اس پر بیٹھ گیا۔ ڈرائیور نے اپنی پچھلی نشست پر بیٹھی خواتین سے کہا کہ آپ فرنٹ پر آ جائیں۔ لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ گاڑی لاہور کے لئے روانہ ہوئی، شہر سے نکلتے ہی حسبِ معمول مجھے اونگھ آ گئی اور پھر ہماری فلائنگ کوچ ایک خوفناک حادثے کا شکار ہو گئی۔ آنکھ کھلی تو ڈسکہ ہسپتال میں تھا۔ مجھے اپنے برادران محمد ارشد چوہدری، محمد امجد چودھری، اطہر حمید، اکمل حمید اور ڈاکٹر جنید حمید کے چہرے نظر آئے۔ اپنے بھانجے خالد شفیع اور شاہد شفیع کو بھی میں نے پہچان لیا۔ نیم غنودگی کے عالم میں اپنے داماد مختار احمد اور ان کے بڑے بھائی منظور احمد مغل بھی دکھائی دیئے۔ محمد اسلم چوہدری اور محمد اجمل چودھری بھی موجود تھے۔ امی جان، میری اہلیہ، ہمشیرہ تسنیم کوثر، تنویر کوثر اور میری بھانجیاں صبیحہ اور ادیبہ بھی نظر آئیں تو احساس ہوا کہ میں زندہ ہوں۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ میں پچھلے دنوں موت کے تصور سے کیوں کانپ اٹھتا تھا۔ میری چھٹی حس بار بار مجھے متوجہ کرتی کہ کچھ ہونے والا ہے۔ شدید چوٹیں آئی تھیں۔ ہنسلی کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔

### ''سیرت الرسول'' کا مسودہ

حادثے کے فوراً بعد نیند کے عالم میں مَیں بے ہوش ہو چکا تھا لیکن بے ہوشی کے عالم میں بھی ''سیرت الرسول'' کا مسودہ میرے سینے سے جدا نہیں ہوا۔ یہ بھی حضوری کی ایک کیفیت تھی۔ اگر مجھے ''سیرت الرسول'' کی اقلیمِ اشاعت میں بازیابی کی سعادت نصیب نہ ہوئی ہوتی تو ممکن ہے نعتیہ نظم ''تمنائے حضوری'' بھی لاشعور سے شعور تک کا سفر طے نہ کر پاتی۔ دوسرے دن ذرا سنبھلا تو میں نے پوچھا کہ میرے پاس تو سیرت الرسول کا

مسودہ بھی تھا، وہ کہاں ہے؟ چنانچہ برادرانِ عزیز اطہر حمید اور اکمل حمید پہلے جائے حادثہ پر پہنچے اور پھر ڈسکے کے ہسپتال میں متعلقہ ڈاکٹر سے مسودے کے بارے میں پوچھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی میز کی دراز میں سے مسودہ نکال کر ان کے سپرد کیا اور ۲۴ نومبر کو ہی میں نے یہ مسودہ اپنے ایک تحریکی ساتھی کے ہاتھ لاہور بھجوا دیا۔ برادر عزیز محمد اظہر چوہدری بتاتے ہیں کہ مَیں تیمارداری کرنے والوں کو نیم بے ہوشی کے عالم میں بھی اپنے نعتیہ اشعار ہی سناتا اور ''تمنائے حضوری'' سے اقتباسات پیش کرتا رہا۔ اللہ رب العزت کے بے پایاں فضل و کرم کا کن الفاظ میں شکر ادا کروں کہ کرب کے ان لمحات میں بھی میرے لبوں پر اس کے محبوب ﷺ کی ثنا کے پھول کھلتے رہے ہیں۔ تمنائے حضوری کا یہی دلکش اسلوب میرا توشہءآخرت بھی ہے:

لمحاتِ حاضری کی تمنا لئے ہوئے
ایک ایک لمحہ عمر رواں کا بسر ہوا

لاہور، ۲۸ مئی ۲۰۰۰ء
ریاض حسین چودھری

# غزل کاسہ بکف ساکت کھڑی ہے

# اُن ﷺ کی گلیوں میں

[ریاض حسین چودھریؒ نے اپنے جہانِ فن کی شب تاب کتاب ''غزل کاسہ بکف'' کے لئے یہ تحریر لکھی جس میں ان کے شعور نعت اور نقد ونظر کے ویژن کے خد و خال نمایاں طور پر سامنے آئے۔]

نعت وہ صنفِ سخن ہے جو دیگر تمام اصنافِ سخن کے سر کا تاج ہے۔ نعت محض صنفِ سخن ہی نہیں لوح وقلم کی مسلسل سجدہ ریزیوں کا بھی نام ہے۔ یہ کائناتی سچائیوں کی آئینہ بردار اور کائنات کی سب سے عظیم اور محترم شخصیت کے اوصافِ مقدسہ کا عکسِ جمیل بھی ہے۔ ہر صنفِ سخن منتظر رہتی ہے کہ اُسے خوشبوئے نعت کو اپنی سانسوں میں سمونے کا اعزاز حاصل ہو۔ لغت چشم براہ رہتی ہے کہ اس کے برہنہ سر پر ثنائے رسول کا عمامہ سجایا جائے، غزل، قصیدہ، پابند نظم، نظمِ آزاد، نظمِ معریٰ، قطعہ، رباعی، مسدس، مخمس وغیرہ سے لے کر ہائیکو، ثلاثی، کوثریہ اور دیگر اصناف تک کا دامن بہارِ نعت کے سدا بہار پھولوں سے مہک رہا ہے اور دیارِ دیدہ و دل میں روشنی ہو رہی ہے۔ ہدایتِ آسمانی کی آخری دستاویز قرآنِ حکیم بھی ایک نعتِ مسلسل ہے اور یہ کتابِ آخر نثر میں ہے۔ دستِ قدرت نے بابِ ثنا میں حرفِ زوال لکھا ہی نہیں، غزل کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ زیادہ تر نعت اسی ہیئت میں لکھی گئی ہے۔ غزل اپنی اس خوش بختی پر جتنا بھی ناز کرے کم ہے۔

شعرائے نعت کا غزل پر احسان ہے کہ انہوں نے نعت گوئی کے لئے غزل کی ہیئت کو اپنایا ہے اور غزل کا مقدر کہ اس نے ثنائے رسولﷺ کے ان سرمدی اثاثوں کو اپنے دامن میں محفوظ کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔ غزل ایک سدا بہار صنفِ سخن ہے۔ اردو اور فارسی نعت نے اسے حیاتِ ابدی بخشی ہے۔ ہزار سال بعد بھی غزل کی ہیئت میں کہی جانے والی نعت ہی مقبول ترین نعت ہو گی اور اسے عوام اور خواص دونوں میں زبردست پذیرائی حاصل رہے گی۔ نعت عشقِ نبی ﷺ اور اتباعِ رسول ﷺ کے تخلیقی اور جمالیاتی اظہار کا نام ہے، حضور ختمی مرتبت ﷺ کی ذاتِ گرامی سے والہانہ اور غیر مشروط محبت اور اتباع کو معیارِ ایمان قرار دیا گیا ہے، یہی محبت اور اتباع خالقِ حقیقی تک رسائی کا وسیلہ جلیلہ ہے اور غزل اسی معیارِ ایمان کے ابلاغ کے لئے اپنی تمام تر تخلیقی توانائیاں وقف کئے ہوئے ہے۔ نعت اسلامی تہذیب، تمدن اور ثقافت کا ایک دلآویز مظہر بھی ہے۔ کیونکہ اسلامی تہذیب، تمدن اور ثقافت کا مرکز و محور آقائے محتشم ﷺ ہی ہیں جن کے سرِ اقدس پر خود خدائے بزرگ و برتر نے محبوبیت کا تاج سجایا اور ان کی خاطر ان کے ذکرِ جمیل کو بلند کرنے کا اعلان آخری الہامی صحیفے میں کیا۔ کتابِ مقدسہ کے اوراق کو خالقِ کائنات نے اپنے محبوب رسول ﷺ کے تذکار سے مصوّر فرمایا ہے ہر طرف تاجدارِ کائنات ﷺ کے محامد و محاسن کی قندیلیں روشن ہیں۔ کائنات کا تمام حسن و جمال سردارِ انبیاء ﷺ کے قدمین کی خیرات ہے۔ نعت دراصل حکمِ ربی کی تعمیل ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: میں اور میرے فرشتے آپ ﷺ پر ہر گھڑی درود و سلام بھیجتے ہیں، اے ایمان والو! تم بھی میرے محبوب ﷺ پر خوب خوب درود بھیجو۔ نعت کی اساس بھی درود و سلام پر رکھی گئی ہے۔ غزل باوضو ہو کر ہماری ثقافتی اکائی کے تحفظ کی علامت بنی ہوئی ہے۔ نعت درود و سلام کا پیکرِ شعری ہے۔ غزل درود و سلام

کے اسی پیکرِ شعری کی تمنائی ہے۔ غزل کی ساری رعنائیاں حضور ﷺ کی نعت کا خام مواد بنتی ہیں۔ یقیناً یہ ایک حقیقت ہے اور محض جذباتی یا شاعرانہ سوچ نہیں کہ روئے زمین پر آج تک کوئی ایسی ساعت نہیں اتری جس کے شاداب ہاتھوں میں خوشبوئے اسمِ محمد ﷺ کا پرچم نہ ہو، سفرِ ثناء ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گا۔

جب کائنات میں اللہ کے سوا کوئی نہ تھا تو سب سے پہلے نورِ محمدی ﷺ تخلیق ہوا، بعد میں کائناتِ رنگ و بومعرضِ وجود میں آئی، کائنات کی وسعتیں اس وقت بھی درود و سلام کا پرچم اٹھائے ہوئے تھیں اور لامکاں کی وسعتیں اس وقت بھی درود و سلام کے زمزموں سے گونج رہی ہوں گی جب ہر چیز موت کی آغوش میں سو چکی ہوگی۔ صرف اللہ کی ذات باقی ہوگی وہ جو ابتداؤں کی ابتدا اور انتہاؤں کی انتہا ہے، جو ہمیشہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ ہمیشہ رہے گا۔ غزل نے نعت کے دامنِ صد رنگ کی خلعتِ فاخرہ اوڑھ کر اپنی ہی سلامتی اور بقا کا اہتمام کیا ہے۔

غزل جب جہانِ نور کی تلاش میں ابہام اور تشکیک کے مقفل دروازوں پر دستک دیتی ہے تو معانی کی ان گنت دنیاؤں کے منظر ناموں کی دھند خود بخود چھٹنے لگتی ہے اور اسے نئے آفاق کی تسخیر کی بشارت ملتی ہے۔ جب یہی غزل اپنے تہذیبی اور ثقافتی شعور کے ساتھ ہوائے مدینہ کی انگلی پکڑ کر درِ سرکار ﷺ پر حاضری کے شرف سے مشرف ہوتی ہے تو اس کے مقدر کا ستارا اوجِ ثریا پر چمکنے لگتا ہے اور ابلاغ کی چاندنی لفظ کے ظاہر ہی کو نہیں اس کے باطن کو بھی منور کر دیتی ہے۔ غزل تاجدارِ کائنات ﷺ کے درِ عطا پر کاسہ بکف حرفِ التجا بن کر کھڑی ہے اور حضور ﷺ کی نعلین پاک کی خیراتِ مطہرہ کی تمنائی ہے۔ غزل سے نعت تک کا تخلیقی سفر رنگوں، روشنیوں اور خوشبوؤں کا سفر ہے، کائناتی سچائیوں اور

جمالیاتی توانائیوں کی معراج ہے۔ غزل جب نبی مکرم ﷺ کی بارگاہِ بیکس پناہ میں چشمِ کرم کی ملتجی ہوتی ہے تو اس کی آنکھیں ہی نہیں پوری کائناتِ حسن روشنیوں سے بھر جاتی ہے۔ ہوا چراغ بانٹنے کا منصب سنبھالتی ہے اور خوشبوئیں نعت گو کے قلم کا طواف کرنے لگتی ہیں۔ بگڑے غزل گو کو نعت گوئی کے معتبر اور معطر کوچے میں زبردستی دھکیلنے کی سازش ایک گھناؤنا جرم تھی، یہ ابلیسی سازش بیمار ذہنوں کی اختراع تھی۔ اگرچہ یہ شیطانی فلسفہ اپنے ہی ملبے تلے دفن ہو چکا ہے لیکن اس کی باقیات کسی نہ کسی انداز میں آج بھی ذہنوں میں فتور برپا کرنے کے مکروہ عمل میں مصروف رہتی ہیں۔ منظر نامہ اب اتنا واضح اور روشن ہے کہ ابہام اور تشکیک کی گرد کو رختِ سفر باندھنے کے سوا کوئی اور تدبیر نہیں سوجھتی، غزل نسیمِ نعت کے ہر مقدس جھونکے کی پذیرائی کے لئے حرفِ سپاس بن کر تخلیق کی رہگذر پر دست بستہ منتظر رہتی ہے۔ قدم قدم پر غلامی کے چراغ جل رہے ہیں، قدم قدم پر خود سپردگی کی شبنم گر رہی ہے، قدم قدم پر رعنائیِ خیال دم بخود ہے۔ قدم قدم پر دھنک کے رنگ اپنا دامن بچھا رہے ہیں اور قدم قدم پر صبا چراغِ آرزو لئے نغمہ سرا ہے۔ غزل نے اپنا سارا حسن نعت کے قدموں پر نثار کر دیا ہے اور عملاً مذکورہ بیہودہ رائے زنی کی نفی کر دی ہے۔ نعت دراصل غزل کے لئے پروانۂ نجات ہے، میں یہاں غزل کے مضامین اور موضوعات کا حوالہ دینے کی جسارت نہیں کر رہا، صرف غزل کے جمالیاتی وژن کی بات کر رہا ہوں۔ جب یہ جمالیاتی وژن شاعر کے تخیل کو اپنے حصارِ حسن میں لے لیتا ہے تو قصرِ نعت کے دروازے خود بخود وا ہونے لگتے ہیں، غزل کا رچاؤ اس کی ایمائیت اور اس کی نرماہٹ فنی بالیدگی کے آئینہ خانوں میں عکس ریز ہونے لگتی ہے تو شاعر کو اذنِ ثنا عطا ہوتا ہے۔ حریمِ غزل تو نعت گو کا تربیتی کیمپ ہے جہاں اس کی تخلیقی صلاحیتوں کو جلا ملتی ہے کہ جب شاعر بارگاہِ

حضور ﷺ میں دل کے آبگینوں کا نذرانہ پیش کرنے کی سعادت حاصل کرے تو اس کا تخلیقی وجود بھی ادب و احترام اور شعری وژن کے احرامِ مقدسہ میں لپٹا ہوا ہو، چمن زارِ غزل میں جذبات و احساسات کی حنا بندی کے بغیر منصبِ نعت سنبھالنا بہت بڑی ادبی جسارت ہے۔ اس بے ادبی کے قریب بھی نہیں پھٹکنا چاہیے۔

حقیقت یہ ہے کہ پہلے دیارِ غزل میں تخلیق کار کی تخلیقی صلاحیتوں کی پرورش ہوتی ہے، اس کا احساسِ جمال رفتہ رفتہ پروان چڑھتا ہے۔ جب وہ فنی باریکیوں سے آگاہی حاصل کر لیتا ہے تو فنی پختگی اس کے قلم کو اعتماد کے نور سے ہمکنار کرتی ہے۔ تب کہیں جا کر اسے نعت گوئی کا اعزاز حاصل ہوتا ہے، نمازِ عشق ادا کرنے سے پہلے اشکوں سے وضو کرنے کا سلیقہ آئے تو اقلیمِ نعت میں باریابی کی اجازت ملتی ہے، زبردستی شہرِ نعت میں گھس آنے والے دراندازوں کی ادبی موت کا منظر ہم اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھتے رہتے ہیں۔

تاریخِ ادب شاہدِ عادل ہے کہ ایک اچھا غزل گو ہی اچھا نعت گو ثابت ہوتا ہے۔ غزل کی کوملتا سے دامن چھڑا کر دل کے شگفتہ پھولوں کی آبیاری کا تصور تخلیقی حوالوں سے انحراف کے سوا کچھ بھی نہیں، ہم جانتے ہیں کہ منحرف چہرے اپنے تشخص کے لئے سرگرداں رہتے ہیں لیکن ان کے ہاتھ کچھ بھی نہیں آتا۔ جمالیاتی قدروں سے فرار حاصل کر کے ممدوحِ کبریا کی بارگاہِ صد احترام میں شائستگی، سنجیدگی اور متانت کی قدروں کو کہاں تک تحفظ کی ردا دی جا سکتی ہے۔ نعت محض اوزان اور بحور کے حوالے سے اپنی پہچان نہیں رکھتی بلکہ نعت اندر کی روشنی کے بھرپور ابلاغ کا نام ہے۔ کبھی کبھار غزل میں نعت کا شعر ہو جاتا ہے اسی طرح نعت میں بھی غزل کے شعر کے در آنے کو ناممکنات کے زمرے میں نہیں ڈالا جا سکتا لیکن ایسے اشعار بلا واسطہ نہ سہی بالواسطہ طور پر نعت کے حیطۂ ادراک میں بھی آ سکتے

ہیں اور نعت کا مجموعی تاثر مرتب کرنے میں اپنا بھرپور کردار بھی ادا کر سکتے ہیں۔ غزل اور نعت کی تخلیقی اور جمالیاتی کڑیاں بہرحال کہیں نہ کہیں جا کر آپس میں ضرور ملتی ہیں۔ ایک سچے نعت نگار کو ان کڑیوں کو مربوط بنانے کی سعی میں مصروف رہنا چاہیئے کہ یہی تخلیقی عمل نعت کے ادبی مقام کے تعین میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ اس حقیقت کو چراغِ راہ بنانا ہوگا کہ نعت درود و سلام کے پیکرِ شعری کو کہتے ہیں۔ اقلیمِ نعت میں کسی قسم کی بے تکلفی کو داخلے کی قطعاً اجازت نہیں۔ ادب! ادب! کہ ادب پہلا قرینہ ہے......

# تاریخِ کائنات کا سب سے بڑا دن

(ریاض حسین چودھریؒ نے آقائے محتشم ﷺ کے یومِ ولادت کے حوالے سے ۵۰۰ بنود پر مشتمل طویل نعتیہ نظم ''طلوعِ فجر'' کہی جو جنوری ۲۰۱۴ء میں شائع ہوئی۔ ہر بند ۱۲ مصرعوں پر مشتمل ہے۔ اس کا پیش لفظ محترم ڈاکٹر اسحٰق قریشی صاحب نے لکھا ہے جس میں وہ ریاض کو ''نقشِ حسّان'' قرار دیتے ہیں۔ ریاض نے اس لازوال کتاب کا تعارف ''تاریخِ کائنات کا سب سے بڑا دن'' کے عنوان سے لکھا ہے۔)

12 ربیع الاول: تاریخِ کائنات کا سب سے بڑا دن ہے۔ یہ دن خالقِ کائنات کے سب سے بڑے بندے اور محبوب رسول ﷺ کی دنیا میں تشریف آوری کا دن ہے۔ شبِ میلاد کتابِ ارتقا کا دیباچہ ہے۔ صناعِ ازل نے آقائے محتشم ﷺ کے سرِ اقدس پر عظمتوں اور رفعتوں کا تاج سجایا، پرچمِ شفاعت عطا کیا، سیدہ آمنہؓ کے لال ﷺ کو قبائے رحمت سے نوازا اور نبی مکرم ﷺ کو خاتمیت کی خلعتِ فاخرہ سے سرفراز فرمایا۔ محبوب ﷺ اس آئینہ خانے کے ہر عکس کو وجود تیرےؐ ہی وجودِ مسعود کے تصدق میں ملا ہے۔ تجھے پیدا کرنا مقصود نہ ہوتا تو یہ چاند ہوتا نہ ستارے، زمین ہوتی نہ آسمان؛ دامنِ ارض وسماوات میں کچھ بھی نہ ہوتا، بلکہ خود ارض وسماوات بھی نہ ہوتے؛ محبوب ﷺ جو کچھ بھی ہے وہ تیرے ہی قدموں کی خیرات ہے۔

خدائے بزرگ و برتر اپنے ملائکہ کے ساتھ نبیِ رحمت پر درود بھیجتا ہے اور ایمان والوں کو حکم دیتا ہے کہ تم بھی میرے نبی ﷺ پر خوب خوب درود و سلام بھیجا کرو۔ ربِّ

کائنات نے رسولِ کائناتﷺ کو مہمانِ عرش ہونے کی فضیلت سے نوازا۔ زمین کے سارے خزانوں کی کنجیاں اپنے محبوبﷺ کو عطا کیں، قیامت کا دن حضور رحمتِ عالمﷺ کی عظمتوں کے ظہور کا دن ہے۔ اللہ رب العزت اپنے حبیبﷺ کو مقامِ محمود پر فائز فرمائے گا۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک ایک لاکھ چوبیس ہزار نبیؑ اور رسولؑ اپنی امتوں کے ساتھ تاجدارِ کائناتﷺ کے خیمۂ عافیت کی تلاش میں نکلیں گے، خورشیدِ قیامت سوا نیزے پر آگ برسا رہا ہوگا، نفسا نفسی کا عالم ہوگا، شافعِ محشرﷺ حوضِ کوثر پر پیاسوں کو پانی پلا رہے ہوں گے، رحمتِ حضورﷺ ہم گنہ گاروں کی تلاش میں ہوگی، سب سے پہلے آقا حضورﷺ کی شفاعت قبول کی جائے گی۔ سب سے پہلے یتیم عبداللہ جنت الفردوس میں داخل ہوں گے، 12 ربیع الاول کو ظہورِ مصطفیٰﷺ نہ ہوتا تو یہ سب کچھ بھی نہ ہوتا۔

اللہ اکبر، اللہ سب سے بڑا ہے۔ حضورﷺ آپؐ آئے تو گلشنِ ہستی میں بہار آ گئی، بنجر زمینوں کی تشنگی کا مداوا ہوا اور شاخِ آرزو پر کلیاں مسکرانے لگیں؛ حضورﷺ آپؐ آئے تو کرۂ ارضی پر عدل کا نفاذ عمل میں آیا، حقوق انسانی بحال ہوئے، آدابِ زندگی ترتیب دیئے گئے، انسان کی خود ساختہ خدائی کا خاتمہ ہوا۔ ظلمتِ شب نے رختِ سفر باندھا اور دخترِ حوا کے پیروں کی زنجیریں کٹیں؛ حضورﷺ آپؐ آئے تو اُفقِ عالم پر امنِ دائمی کی بشارتیں تحریر ہوئیں، وسائلِ قدرت پر شخصی اجارہ داریوں کے بڑے قفل ٹوٹے، آمریت کی تدفین عمل میں آئی اور قدم قدم پر جمہوری شعور کی آبیاری کا اہتمام ہونے لگا۔ نمرودیت اور فرعونیت کے قصرِ انا زمیں بوس ہوئے؛ حضورﷺ آپؐ آئے تو استحصال کی ہر شکل پر ضربِ کاری پڑی، انسان کی تذلیل کا ہر خیمہ جلادیا گیا، ریاستی دہشت گردی کو رزق زمین بنادیا گیا، خوفِ خدا سے جبینیں منور ہوئیں، ذہنوں میں تعمیر ہونے والے عقوبت خانے مسمار ہوئے، فتنہ وشر کے مراکز بند کردیئے گئے، خودنمائی اور خودستائی کی آمرانہ خصلتوں کو اپنے ہی ملبے تلے دفن کردیا گیا، ایک انسان کے قتل کو پوری انسانیت کے قتل کے برابر ٹھہرایا گیا؛ حضورﷺ آپؐ آئے تو معبودانِ باطلہ کی پرستش کا دور اختتام پذیر ہوا، توہم پرستی کو ذہنِ انسانی سے کھرچ ڈالا گیا۔

جبینوں کو سجدوں کا نور عطا ہوا۔ فکرونظر کو خدائے وحدہ لاشریک کی بندگی کے شعور سے ہمکنار کیا گیا اور ہر طرف توحید کے پرچم لہرانے لگے؛ حضورﷺ آپؐ آئے تو تکبر اور غرور کی مشعلیں ہمیشہ کے لیے بجھادی گئیں، قانون کی حکمرانی کو یقینی بنایا گیا اور جبرِ مسلسل کی آہنی دیوار کو نیست و نابود کردیا گیا؛ حضورﷺ آپ آئے تو انفرادی اور اجتماعی سطح پر خود احتسابی کا عمل معمولاتِ روز و شب کا عنوان بنا، نسلی تفاخر کا طلسم ٹوٹا، رنگ و نسل کے بت پاش پاش ہوئے، اللہ کا دین تمام ادیانِ باطلہ پر غالب آکر رہا اور اخلاقی قدروں پر مشتمل نیو ورلڈ آرڈر مرتب ہوا۔ ایوانِ کسریٰ کے چودہ کنگرے گر گئے، آتش کدۂ فارس بجھ گیا، خوشبوؤں کو نئے پیرہن عطا ہوئے، شرفِ انسانی بحال ہوا، آپﷺ کی تشریف آوری ہر شعبۂ زندگی میں انقلاب آفریں تبدیلیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئی:

نسلِ آدم نیند سے بیدار ہوجائے ریاضؔ
دامنِ ارض و سما جاگے کہ آئے ہیں حضورؐ

12 ربیع الاول تجدیدِ عہد کا دن ہے۔ انفرادی اور اجتماعی سطح پر اپنے محاسبے کا دن ہے۔ عظمتِ رفتہ کی بازیابی کے سفر پر نکلنے کا دن ہے۔ اپنی ثقافتی اکائی کو تحفظ کی ردا دینے کا دن ہے۔ آج کا دن محبتیں تقسیم کرنے کا دن ہے، ناراض دوستوں کو گلے سے لگانے کا دن ہے، فرقہ واریت کے خیمۂ بے اماں کو نذرِ آتش کرنے کا دن ہے، از سرِ نو مکینِ گنبدِ خضرا سے رشتۂ غلامی کو استوار کرنے کا دن ہے۔

قدرت نے روشنی کے قلم سے لکھا ہے دن
کتنا عظیم ارض و سما کو ملا ہے دن
تاریخِ کائنات کی سب سے بڑی ہے رات
تاریخِ کائنات کا سب سے بڑا ہے دن

پاکستان قریۂ عشقِ محمدؐ ہے، ہم غلامانِ رسولؐ ہاشمی کا حصارِ آہنی ہے۔ پاکستان

عالمِ اسلام کی پہلی دفاعی لائن ہے۔ یومِ میلاد وطنِ عزیز کی سلامتی کے لیے بارگاہِ خداوندی میں التجاؤں اور دعاؤں کا دن ہے، امتِ مسلمہ پر آنے والی ہر خراش پر مرہم رکھنے کا دن ہے، یہ دن پوری کائنات کے لیے عیدِ مسّرت ہے۔

12 ربیع الاول کی دلنواز ساعتوں کو ہم غلاموں کا سلام پہنچے۔

# فاضل بریلویؒ کا شعری وژن

(یہ مضمون ''نعت رنگ'' کے مولانا احمد رضا خانؒ نمبر میں ۲۰۰۵ء میں شائع ہوا)

گلشنِ مدینہ کے تصور میں مہکنا، شب کے پچھلے پہر اشکِ مسلسل کے جھرنوں کا گرنا، کشتِ دیدہ و دل میں بادِ بہاری کا چلنا، درودوں کی تتلیوں کا سلاموں کی رم جھم میں شاخ در شاخ خوشبوئے اسمِ محمدؐ سے ربطِ خاص رکھنا، چشمِ تمنا کا طوافِ گنبدِ خضرا میں مصروف رہنا، اسمِ گرامی کو چوم کر قلم کا وجد میں آنا، شمعِ رسالت کے پروانوں کا شبِ تنہائی کے لمحاتِ منتظر میں عشقِ مصطفیٰ کی سرشاریوں سے ہمکنار ہونے کا شرفِ عظیم حاصل کرنا، کیفِ حضوری میں ڈوبی ہوئی ساعتِ عجز کا رقص میں آنا، درود و سلام کی وادیِ پُر بہار میں تخیل کا افق در افق دیوانہ وار اڑتے ہی رہنا، فضائے نعت میں سانس لینے کے اعزاز لازوال پر بارگاہِ خداوندی میں سجدۂ شکر بجا لانا اور حبِ رسول کی متاعِ عزیز کو عنوانِ زندگی بنا کر خاکِ درِ حضورؐ سے پیرہن آرزو بنانا ہر کسی کے مقدر میں کہاں، طوقِ غلامی ہر گردن کی زینت کب بنتا ہے، کشکولِ گدائی ہر کسی کے ہاتھ میں کب سجتا ہے، یہ اعزاز تو عطائے ربِ قدیم ہے، یہ سعادت تو محض توفیقِ خداوندی سے ملتی ہے، ہم خوش قسمت ہیں کہ ہمیں حضورؐ کی امت میں پیدا کیا گیا، اپنے بختِ رسا کی بلائیں کیوں نہ لیں کہ ہم جان نثاروں کو آقائے محتشمؐ کے حلقۂ غلامی میں رکھا گیا، رونے والی آنکھ عطا کر کے ہمیں ثنائے محمدؐ کے منصبِ جلیلہ سے نوازا گیا۔ لوح و قلم اپنے بختِ ہمایوں پر مسرور ہوں، کلکِ مدحت ثنا کی وادیوں میں گم ہوجائے اور امت کے تمام حروف دست بستہ درِ اقدس کی حاضری سے مشرف ہوں اور خدا اور اس کے ملائکہ کے ہم زبان ہوں تو مکینِ گنبدِ خضراؐ پر درود و سلام بھیجیں اور اسی درود و سلام کو پیکرِ شعری عطا کر کے توصیفِ مصطفیٰ کے چراغ جلائیں۔

نبیؐ آخرالزماں حضور رحمتِ عالمؐ کے محامد و محاسن کا بیان سنتِ انبیا ہی نہیں سنت ربِ ذوالجلال بھی ہے، تمام الہامی صحائف کے اوراق نبی مکرمؐ کی تشریف آوری کا مژدہ سنا رہے ہیں۔ ان کتبِ سماوی کا ایک ایک لفظ صبحِ میلاد کی تابانیوں سے جگمگا رہا ہے، قرآن حکیم سمیت تمام آسمانی کتب میں میلادِ انبیاء کا تذکرہ موجود ہے، پیدائشِ انبیاء کے ایام پر سلام بھیجا گیا ہے۔

ہدایتِ آسمانی کی آخری دستاویز قرآن مجید فرقانِ حمید حضورؐ کی ایک نعتِ مسلسل ہی تو ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے اخلاقِ محمدیؐ کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا کیا تم قرآن نہیں پڑھتے؟ حیاتِ مصطفیٰ آیاتِ ربانی ہی کی عملی تفسیر کا نام ہے درود بر رسولِ اول و آخر ایک ایسا عمل ہے جس میں اللہ رب العزت بھی اپنے بندوں اور ملائکہ کے ساتھ شریک ہوتا ہے، اسی درود و سلام کے شعری پیکر کو نعت کہتے ہیں، حضرت حسان بن ثابتؓ، حضرت کعب بن زہیرؓ اور حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کو شاعرِ دربارِ رسالت ہونے کا اعزاز حاصل ہے، ان جلیل القدر صحابہؓ نے نعتِ سیدالمرسلینؐ سے دفاعِ مصطفیٰ کا کام بھی لیا اور دشمنانِ اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کے مخالفین کی شعری حوالے سے بھی مذمت کی، قلم کے محاذ پر دادِ شجاعت دینا جہاد ہے، یہ جہاد آج بھی جاری ہے اور کل بھی جاری رہے گا۔ جزیرۃ العرب کے ثقافتی اور ادبی پس منظر میں نعت کے شعراء نے دین کی ترویج اور دین کے فروغ کے لیے موثر کردار ادا کیا۔ برصغیر میں اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں بریلویؒ نے نعتِ حضورؐ کے اسی اساسی رویے کو اپنایا، جنگِ آزادی کے بعد برطانوی استعمار نے اسلامیانِ ہند کو مناظروں کی کھلی چھٹی دے رکھی تھی، حضورؐ کی ذاتِ اقدس کو مباحث کا موضوع بنادیا گیا تھا، نور و بشر اور حاضر و ناظر جیسے اختلافی مسائل کو ہوا دے کر اسلام کے عظیم الشان فکری، نظری اور عملی نظام کو منہدم کرنے کی سازش کی جارہی تھی، ہندو سامراج اس سازش میں برابر کا شریک تھا، اغیار مسلمان کی سادہ لوحی کا تماشا دیکھ رہے تھے اقبالؒ کے الفاظ میں ابلیس کی منصوبہ بندی یہ تھی کہ:

وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا
روحِ محمدؐ اس کے بدن سے نکال دو

برہمنی سامراج بھی اسی روحِ محمدؐ کے خلاف صف آراء ہورہا تھا، برصغیر کی فضا میں نفرت کی چنگاریاں سلگ رہی تھیں، ہندو سامراج اسلامیانِ ہند سے اپنی ہزار سالہ غلامی کا انتقام لینے کی تاک میں تھا اسلام دشمن تحریکوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

جنگِ آزادی 1857ء کے بعد اسلامیانِ ہند کو ابتلاء و آزمائش کے جس دور سے گذرنا پڑا تھا وہ ہندو اور انگریز کی نہ ختم ہونے والی سازشوں کی ایک الگ داستان ہے، علمائے حق کو کالے پانی کی سزائیں سنائی گئیں۔ لیکن یہ وہی عہدِ بے امان ہے جس میں قدرت نے اسلامیانِ ہند کی فکری رہنمائی کے لیے ایسے نابغانِ عصر پیدا کیے جنہوں نے ہر محاذ پر عزم و عمل کے ان گنت چراغ روشن کیے اور اسلامیانِ ہند کو قعرِ مذلّت سے نکالنے کی بھرپور جدوجہد کی جو بالآخر قیامِ پاکستان کی صورت میں ظہور پذیر ہوئی۔ عشقِ مصطفیٰ کے چراغ صبحِ آزادی کے پیامبر بن گئے۔ ان نابغانِ عصر میں اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں بریلویؒ کا نام کئی حوالوں سے سرِ فہرست دکھائی دیتا ہے۔ دوقومی نظریئے کی عملی تفسیر سیاسی بیداریوں کے موسم میں مینارۂ نور بن گئی۔ فاضل بریلویؒ دیوانہ وار میدانِ عمل میں کود پڑے اور برطانوی استعمار اور برہمنی سامراج کی سازشوں کو ناکام بنانے کے لیے قلم کے محاذ پر سینہ سپر ہوگئے، کانگریس کی گود میں بیٹھ کر حکومتِ الٰہیہ کے خواب دیکھنے والے ''زعما'' کو آئینہ دکھایا۔ اعلیٰ حضرتؒ دیکھ رہے تھے کہ اگر عشق کی آگ بجھ گئی، تو عالمِ اسلام راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہوکر غیر مؤثر ہوجائے گا، اس کی ثقافتی اکائی بکھر جائے گی اور اس کا تہذیبی وجود تک ختم ہوجائے گا۔ ایک اور ''مغلِ اعظم'' ہمارے ذہنوں پر دینِ الٰہی

مسلط کردے گا، جرمِ ضعیفی کے اندھیرے پہلے ہی مسلم امہ کے ملی اثاثوں کو نیلام گھر کی زینت بنا چکے تھے، نبوت کے جھوٹے دعویداروں کی سرپرستی کرکے طاغوتی طاقتیں جو گھناؤنا کھیل کھیل رہی تھیں اس کی سنگینی کا ادراک علما اور مشائخ کو تھا اور وہ کفر کی تکذیب میں پیش پیش بھی تھے۔ بنارس کانفرنس کے مثبت اثرات کا حوالہ دیا جاسکتا ہے کہ اگر قائداعظم بھی مطالبہ پاکستان سے دستبردار ہوجائیں تب بھی علماء و مشائخ تحریک پاکستان کو اپنے منطقی انجام تک پہنچا کر رہیں گے۔ برطانوی سامراج اور برہمنی استعمار نے سیاسی، ثقافتی اور مجلسی سطح پر جو فضا تیار کررکھی تھی اس کا ردِعمل تحریک پاکستان کی صورت میں سامنے آچکا تھا، اسلام اور پیمبر اسلام کے بارے میں غلط فہمیوں، فکری مغالطوں اور علمی لغزشوں کے معاندانہ سلسلے کا آغاز ہوچکا تھا۔ اعلیٰ حضرت احمد رضا خان بریلویؒ نے نعتِ حضورؐ کے ذریعہ دین کی بقا اور سلامتی کے احساس کو ایک زندہ تحریک بنادیا، دفاعِ پیمبرؐ، دفاع اسلام ہے، فاضل بریلویؒ کی نعتیہ شاعری نے شعوری اور لاشعوری سطح پر اسلامیانِ ہند کی نظری اور فکری رہنمائی کا فریضہ سرانجام دیا، عظمت رفتہ کی بازیابی کا سفر اور تحریکِ پاکستان کا سفر دو مختلف چیزیں نہیں، پاکستان اسلامی تشخص کی تلاش کا دوسرا نام ہے۔ اس حوالے سے فاضل بریلویؒ کی نعت گوئی نے اجتہادی کارنامہ سرانجام دیا، دیکھتے ہی دیکھتے برصغیر کی فضا

مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام

سے گونجنے لگی اور دلوں کی کشتِ ویراں میں بادِ بہاری چلنے لگی، ہر شاخِ آرزو کا دامن صلِ علیٰ کے سرمدی پھولوں سے بھر گیا۔

حدائق بخشش فاضل بریلویؒ کے شہرہ آفاق نعتیہ دیوان کا نام ہے، ان کے مذکورہ سلام کو جو پذیرائی عوامی سطح پر حاصل ہوئی وہ اردو زبان میں کسی دوسری شعری تخلیق کو حاصل نہیں ہوسکی۔ حدائق بخشش کی پہلی نعت کا پہلا شعر ہی آقائے مکرمؐ کے درِ عطا پر سائلانِ کرم کو مژدۂ رحمت سنا رہا ہے کہ حضورؐ کے درِ اقدس پر دامن پھیلانے والا کبھی خالی ہاتھ نہیں لوٹا، مرادوں کے سکّے اس کے کشکولِ آرزو میں ضرور ڈالے جاتے ہیں، ہادیٔ

برحقؐ کا درِ رحمت آج بھی کھلا ہے، یہاں حشر تک نور کا باڑا بٹتا رہے گا۔

واہ کیا جود و کرم ہے شہِ بطحاؐ تیرا
نہیں سنتا ہی نہیں مانگنے والا تیرا

گویا ہر عہد کے متلاشیانِ حق کو یہ تاکید کی جارہی ہے کہ جھک جاؤ دہلیز مصطفیٰ پر، یہ تاکید عین منشائے ایزدی کے مطابق ہے کہ اگر تم اپنی جانوں پر ظلم کر بیٹھو تو میرے حبیبؐ کی بارگاہِ ادب میں حاضر ہوجاؤ اور یہ کہ اگر تمہیں امن وسکون کی تلاش ہے تو حضورؐ کی چوکھٹ پر حرفِ سوال بن کر جھک جاؤ۔ فاضل بریلویؒ کی نعت کا یہ اساسی رویہ حدائق بخشش کے ورق ورق پر رجائیت کے سورج آویزاں کر رہا ہے۔ ان کا نعتیہ آہنگ عطائے مصطفیٰ کی صدائے ذی وقار سے گونج رہا ہے اور اعتماد و اعتبار کے نئے ضابطے تحریر کررہا ہے۔ نبیٔ محتشمؐ کی رحمتِ بے پایاں ہم گنہ گاروں کی تلاش میں رہتی ہے اور حضورؐ کا دریائے رحمت خود پیاسوں کی جستجو میں رہتا ہے۔ نبیٔ اول و آخرؐ کی عظمتوں اور رفعتوں کی طرف ہم غلامانِ رسولِ ہاشمیؐ کو متوجہ کیا جارہا ہے، ہمیں مقامِ مصطفیٰؐ کی بلندیوں کو حیطۂ شعور میں لانے کا سبق دیا جارہا ہے۔ اللہ رب العزت قرآن مجید میں اپنے بندوں کو آدابِ مصطفیٰ سکھا رہا ہے، خبردار! تمہاری آواز میرے نبیؐ کی صدائے مقدسہ سے پست رہے، آقائے دو جہاں کو زمین کے خزانوں کی کنجیاں عطا کی گئیں۔ محبوبؐ، اگر تو چاہے تو ان پہاڑوں کو سونے کا بنادیا جائے اور جہاں تو جائے یہ تیرے ساتھ جائیں؟ خدائے بزرگ و برتر قدم قدم پر اپنے محبوبؐ کی دلجوئی فرماتا ہے: محبوبؐ آپؐ دلگیر نہ ہوں ہم جسے چاہیں ہدایت دیں جسے چاہیں نہ دیں، محبوبؐ آپؐ دل میلا نہ کریں، محبوبؐ! ہم نے تجھے کل جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے، مَیں عطا کرنے والا ہوں اور تو میری نعمتوں کو میری مخلوقات میں تقسیم کرنے کے منصب پر رونق افروز ہے۔ فاضل بریلوی کی نعت قرآن و حدیث سے استدلال کرتے ہوئے فکر ونظر کے دامن میں روشنی کے پھول سجاتی نظر آتی ہے۔

مَیں تو مالک ہی کہوں گا کہ ہو مالک کے حبیبؐ
یعنی محبوب و محبّ میں نہیں میرا تیرا

پیغمبرِ امنؐ کے دامنِ عافیت کی کسے تلاش نہیں، ماہِ عربؐ کی کالی کملی ہی تو ہم عاصیوں کی پردہ پوشی کرے گی فاضل بریلویؒ کس شاعرانہ مہارت اور مومنانہ فراست سے اس مضمون کو پیرہنِ شعر عطا کررہے ہیں۔

چور حاکم سے چھپا کرتے ہیں یا اس کے خلاف
تیرے دامن میں چھپے چور انوکھا تیرا

فاضل بریلویؒ کے نعتیہ کلام کو اپنے دور کے سماجی، سیاسی، تاریخی اور جذباتی پس منظر میں نقد ونظر کی کسوٹی پر پرکھنے کی ضرورت ہے۔ اُس پرآشوب دور کی تاریخ خود بخود مرتب ہوتی چلی جائے گی، کوزے میں دریا کو بند کرنے کا محاورہ تو ہم نے سن رکھا ہے لیکن قطرے میں سمندر کو بند کرنے کی مثال فاضل بریلویؒ کے نعتیہ کلام میں دکھنے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ تہذیبی تناظر میں فاضل بریلویؒ کے کلام کو دیکھا جائے تو قاری رعنائیِ خیال کی ایک نئی دنیا میں پہنچ جاتا ہے، فاضل بریلویؒ کے ہاں جوفنی باریکیاں ہیں، اپنائیت کا جو ایک جہان آباد ہے، زبان کی جو لطافتیں ہیں، ان پہلوؤں پر اربابِ نقد ونظر کو یکسوئی سے برسوں کام کرنا ہوگا، معانی کا بیکراں سمندر قاری کے ذہن کو آغوشِ تفہیم میں لے لیتا ہے۔ سنجیدگی اور متانت کی فضا روح و دل پر محیط ہوجاتی ہے۔

فخرِ آقاؐ میں رضؔا اور بھی اک نظمِ رفیع
چل لکھا لائیں ثنا خوانوں میں چہرہ تیرا

فاضل بریلویؒ کا آقائے مکرمؐ کے ثنا خوانوں میں کیا مقام ہے اس کا فیصلہ یقیناً وقت دے چکا ہے، وقت کی عدالت کا فیصلہ کسی نام نہاد نقاد کی توثیق کا محتاج نہیں ہوا کرتا۔

تخیل کی بلند پروازی فاضل بریلویؒ کے نعتیہ آہنگ کا ایک اور وصفِ جمیل ہے، خیال حلقۂ احترام ہی میں دست بستہ دکھائی نہیں دیتا بلکہ ان کی ڈکشن کا ہر لفظ باوضو ہوکر ہونٹوں پر مدحتِ مصطفیٰ کے گلاب سجاتا نظر آتا ہے۔ جذبات نگاری ان کی نعتیہ شاعری کے قصرِ تخلیق کا بنیادی پتھر ہے جس پر عظیم الشان نعت محل تعمیر کیا گیا ہے، شاعر کا کمال یہ ہے کہ ان کے جذبات حدِ اعتدال سے نہیں بڑھتے بلکہ سراسر تصویرِ عجز بن کر درِ حضورؐ پر سر جھکائے باریابی کے منتظر رہتے ہیں، جذبے بھی بارگاہِ نبوی میں آہستہ سانس لینے کا شعور رکھتے ہیں، فاضل بریلویؒ کے شعری وژن میں ادب و احترام کی چاندنی ہر طرف پرفشاں ہے۔

الٰہی! منتظر ہوں وہ خرامِ ناز فرمائیں،
بچھا رکھا ہے فرش آنکھوں نے کمخواب بصارت کا

شاعر امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔ محبتِ رسولؐ تمناؤں کی فصیل پر کرنوں کے پھول سجاتی رہتی ہے۔ یقینِ کامل کے چراغ قدم قدم پر لو دے رہے ہیں، تاجدارِ عرب وعجمؐ کا دیوانہ اپنے گناہوں پر شرمسار ضرور ہے لیکن بے یقینی کی ایک شکن بھی اس کے ماتھے پر نمودار نہیں ہوتی، وہ کسی مرحلے پر بھی خوفزدہ نہیں ہوتا۔ گھبراہٹ نام کی کوئی چیز اس کے قریب نہیں پھٹکتی، اُسے یقین ہے کہ آقائے محتشمؐ کا دستِ عطا ہر وقت کھلا ہے۔

رضائے خستہ جوشِ بحرِ عصیاں سے نہ گھبرانا
کبھی تو ہاتھ آجائے گا دامن اُنؐ کی رحمت کا

اُنؐ کے دامانِ کرم ہی سے تو وابستگی کا نور ملتا ہے۔ شجر سے پیوستہ رہ کر ہی تو شامِ ہجر کا موسم کٹتا ہے۔ کیا بے ساختہ پن ہے۔ الفاظ کا جیسے نزول ہورہا ہے تصنع یا بناوٹ کا کہیں نام و نشان بھی نہیں، محبتِ رسول میں ملاوٹ اور ریاکاری کا تصور بھی کفر کی سرحدوں تک لے جاتا ہے، یہ بے ساختہ پن فاضل بریلویؒ کو منفرد لہجہ عطا کرتا ہے اور

آوازوں کے جنگل میں ان کی آواز کو پہچاننے میں ذرا سی بھی مشکل پیش نہیں آتی، یہ وہ لہجہ ہے جو شاعر کے نعتیہ آہنگ کو حضوری کی لذتوں سے مخمور کر جاتا ہے۔ اس بے ساختہ پن کی ایک اور مثال دیکھئے۔

سائلو! دامن سخی کا تھام لو
کچھ نہ کچھ انعام ہو ہی جائے گا

زبان و بیان کی یہ نزاکت اپنی مثال آپ ہے، اعلیٰ حضرت کی سوچ کا ہر دائرہ آقائے مکرمؐ کی ذاتِ اقدس کے گرد مؤدت کے پھول سجاتا ہے۔

اعلیٰ حضرتؒ کے شعور نے جب آنکھ کھولی تو برطانوی استعمار اپنی پوری عسکری قوت کے ساتھ تاجِ دہلی پر مسلط ہو چکا تھا۔ جنگِ آزادی کا سارا نزلہ اسلامیان ہند پر گرا دیا گیا تھا۔ چانکہ کی اولاد اپنی روایتی بزدلی کا ثبوت دیتے ہوئے غیر ملکی حکمرانوں کے چرنوں میں بیٹھی ماتھا رگڑ رہی تھی۔ کفر و الحاد کی آندھیاں زور و شور سے چل رہی تھیں۔ ذہنوں میں ابہام و تشکیک کے کانٹے بوئے جارہے تھے، برہمنی سامراج اور برطانوی استعمار مسلمانانِ ہند کے خلاف سازشوں میں مصروف تھے، نت نئے فتنوں کو ہوا دی جارہی تھی۔ فکری مغالطوں کا طومار باندھا جارہا تھا۔ برطانوی سرکار کی سرپرستی میں مشنری ادارے برصغیر کے طول و عرض میں غیر ملکی حکمرانوں کو اپنی تبلیغی سرگرمیوں کے حوالے سے تقویت پہنچا رہے تھے۔ رفاہِ عامہ کی آڑ میں اسلامیان ہند کے گرد گھیرا تنگ کیا جارہا تھا۔ خود مسلمانوں میں فرقہ واریت کو ہوا دی جارہی تھی۔ انگریز حکمران حضورؐ کی امت کو مزید خانوں میں تقسیم کر رہے تھے، کانگریس الگ اپنی گود میں قوم پرست مہمانوں کو ''پناہ'' دے رہی تھی۔ اس اندوہناک صورت حال میں اور فکری بانجھ پن کے موسم ناروا میں مولانا حالیؒ بجا طور پر مکینِ گنبدِ خضرا کی بارگاہ میں مصروفِ التجا تھے، امت کا ہر شاعر حالیؒ کا احسان مند ہے کہ اس نے نعتیہ ادب کو اتنا عظیم شعر دیا:

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے
امت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے

اس شعر کے حوالے سے مولانا الطاف حسین حالؔی نے نعت میں باقاعدہ استغاثے کی بنیاد رکھی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اکیسویں صدی کے ابتدائی برسوں کی نعت بھی حالؔی کے اس حصار التجا سے باہر نہیں آسکی اور نہ وہ اپنے اس اعزاز سے کبھی دستبردار ہونے کا تصور ہی کر سکے گی، آنے والی ہر صدی کی نعت حضورؐ کی بارگاہ میں استغاثہ پیش کرنے کے بعد آقائے محتشمؐ کی نظرِ کرم کی ملتجی رہے گی، فاضل بریلویؒ کی آواز ابھری۔

البحر علاء الموج طغیٰ من بیکس و طوفاں ہوش ربا
منجدھار میں ہوں بگڑی ہے ہوا موری نیا پار لگا جانا

فاضل بریلویؒ کے ہاں استغاثے کا رنگ نمایاں ہے۔ اُن کی شاعری آج بھی درِ حضورؐ پر دامن پھیلائے امید کرم کے پھول کھلا رہی ہے۔ ان کی نعت کا ہر حوالہ حضورؐ کی ذاتِ اقدس سے شروع ہوکر حضورؐ کی ذاتِ اقدس پر ختم ہوجاتا ہے۔ پُر شکستہ لمحات میں نظریں سوئے مدینہ اٹھ جاتی ہیں اور شاعر جھولی پھیلا کر درِ اقدس پر دست بستہ کھڑا ہوجاتا ہے۔

نگاہِ کائنات اُس شہرِ خنک کے در و بام کا آج بھی طواف کر رہی ہے جہاں گنبدِ خضرا اپنی تمام تر تابانیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے، جہاں صبح و شام ملائکہ کا ہجوم رہتا ہے جہاں ہر روز سردارِ انبیاء کا دربار پُر انوار سجتا ہے جہاں ہوائیں درود پڑھتی ہیں اور خوشبوئیں سلاموں کے چراغ ہتھیلیوں پر لیے اُن مخمور راستوں پر زائرینِ مدینہ کی پذیرائی کے لیے کھڑی رہتی ہیں، عشاقِ مصطفیٰ کو اپنے آقاؐ کے شہرِ بے مثال سے جدائی کا تصور بھی تڑپاتا رہتا ہے، فاضل بریلویؒ کی نعتیہ شاعری بھی مواجہہ شریف میں عرضِ تمنا کے پھول لیے تصویرِ ادب بن کر کھڑی ہے، کیا تڑپ سی تڑپ ہے۔

جان و دل ہوش و خرد سب تو مدینے پہنچے
تم نہیں چلتے رضا سارا تو سامان گیا
ٹھوکریں کھاتے پھرو گے اُنؐ کے در پر پڑے رہو
قافلہ تو اے رضا اول گیا آخر گیا

مدینہ منورہ سے جدائی کا تصور بساطِ تاسف پر فراق و ہجر کے نئے نئے گل بوٹے بناتا ہے، حضوری کی کیفیتیں سمٹتی ہیں تو شاعر کا قلم خون کے آنسو رونے لگتا ہے۔

مدینہ چھوڑ کر ویرانہ ہند کا چھایا
یہ کیسا ہائے حواسوں نے اختلال کیا

درِ حضورؐ سے جدا ہوتے وقت کشکولِ التجا آنسوؤں سے بھر جاتا ہے، فضا سسکیوں اور ہچکیوں سے معمور ہوجاتی ہے جیسے بال و پر نوچ کر دستِ قضائے شاعر کو ہجر کے قفس میں ڈال دیا ہو، جیسے فراق کے موسم نے ابھی سے اسے اپنی گرفت ناروا میں لے لیا ہو جیسے نہ ابھی شاعر نے روئے گل دیکھا، نہ ابھی بوئے گل سونگھی اور نہ ابھی چمن کی بہاریں لوٹیں کہ موسم خزاں نے آن لیا۔ اُس شہرِ بے مثال سے جدائی کا سانحہ شاعر برداشت نہیں کر پاتا، اُسے ہر طرف یاس و حسرت کے پھول کھلے دکھائی دیتے ہیں۔ شاعر اپنے معبودِ حقیقی کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہوکر گڑ گڑانے لگتا ہے۔

الٰہی سن لے رضا جیتے جی کہ مولیٰ نے
سگانِ کوچہ میں چہرہ مرا بحال کیا

سگانِ کوچہ میں کسی کا چہرہ بحال ہوجائے تو اُس کے لبوں پر کلماتِ تشکر و امتنان کا ہجوم کیوں نہ اُمڈ آئے۔ سگانِ کوچہ یار میں اپنے چہرے کو دیکھنا کتنا بڑا اعزاز ہے اس کا اندازہ ظاہر بین لوگ لگا ہی نہیں سکتے، صرف لفظی ترجمہ کرکے دین کی روح کو سمجھنے والے

احباب اس اعزاز کے ادراک سے بھی محروم رہتے ہیں۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ نبیٔ آخرالزماں کا اسم گرامی سن کر پلکوں پہ چراغ سے کیوں جلنے لگتے ہیں، آنکھوں میں ساون بھادوں کا موسم کیوں اتر آتا ہے، اعلیٰ حضرت کا یہ وہ اعزازِ لازوال ہے جسے اپنی تمام تر خوش عقیدگی کے باوجود بھی اُن سے نہیں چھینا جاسکتا۔ اعلیٰ حضرت کی فکر کے خود ساختہ شارحین اکثر اعلیٰ حضرت کو سگِ رسول ہونے کے اعزاز سے محروم کرکے اپنی سادگی اور لاعلمی کا مظاہرہ کر بیٹھتے ہیں۔ مثلاً اعلیٰ حضرت کا ایک شعر ہے:

کوئی کیوں پوچھے تیری بات رضؔا
تجھ سے کتّے ہزا پھرتے ہیں

لفظ کتّے کو 'کِتے' میں تبدیل کرکے سمجھا جاتا ہے کہ ہم نے اعلیٰ حضرت کے احترام کو ردائے تحفظ دی ہے حالانکہ سگِ درِحضورؐ ہونا ہی اعلیٰ حضرت کا اعزاز ہے، اعلیٰ حضرت کے خود ساختہ ''ہمدرد'' انہیں اس اعزاز لازوال سے کیوں محروم کردینا چاہتے ہیں، کم از کم میری سمجھ میں یہ بات نہیں آسکی، یہ منطق بڑی عجیب ہے کہ اعلیٰ حضرت خود تو اپنی ذات کو سگانِ کوچہ اقدس میں شمار کرسکتے ہیں لیکن ہم احتراماً ایسا نہیں کرسکتے، یہ کیسی وفاداری ہے، یہ کیسی جان نثاری ہے، یہ کیسی وابستگی ہے؟ اعلیٰ حضرت کا سب کچھ تو اُن کے آقا و مولاؐ ہی ہیں، آؤ سگان کوئے پیمبرؐ سے دوستی کا ہنر سیکھیں، آؤ حضورؐ کی غلامی کا پٹکا اپنے گلے میں ڈال کر اور احترامِ رسولؐ کا عمامہ اپنے سروں پر سجا کر درِحضورؐ پر شرفِ حاضری سے مشرف ہوں، یہی اعلیٰ حضرت کی شاعری کا مرکزی نقطہ ہے اور یہی ان کے علمی سفر کی معراج ہے، شیخ الاسلام پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہرلقادری جب حج یا عمرہ کے لیے تشریف لے جاتے ہیں تو منہاج القرآن کے اکثر طلبا لکھ کر انہیں اپنے جذبات سے آگاہ کرتے ہیں کہ جب آقائے مکرمؐ کی بارگاہِ بیکس پناہ میں حاضری کی سعادت حاصل ہوتو نام لے کر ہمارا سلام عرض کیجئے گا۔ ایک دفعہ ایک طالب علم نے پروفیسر صاحب کو کاغذ کے ایک پرزے پر لکھ کر دیا کہ جب مقدر جاگے شہرحضورؐ میں داخلے کا اعزاز ملے تو اِدھر اُدھر

نظر دوڑایئے گا، اگر کوئی کتا حضورؐ کی گلیوں میں پھرتا نظر آجائے تو اُسے میرا نام لے کر پکار لیجئے گا، شمع رسالت کے پروانو! اس معصوم آرزو کی عملی تفسیر بن جاؤ، سگانِ کوچہ مصطفیٰؐ میں اپنا چہرہ بحال کرالو۔

عہدِ رسالت مآبؐ کے شعرا نے نعت سے دفاعِ رسول کا کام بھی لیا ہے بلکہ صحابہؓ کی نعت کا مقصدِ وحید ہی دفاع رسول ہے۔ بالواسطہ اور بلاواسطہ بھی، یہود و نصاریٰ، کفار ومشرکین اور جزیرۃ العرب کی تمام اسلام دشمن قوتیں اسلام اور پیغمبر اسلام کا راستہ روکنے کے لیے اپنے تمام مادی وسائل کے ساتھ صف آراء ہورہی تھیں، شعرائے دربارِ مصطفیٰؐ نے دشمنانِ اسلام کی مذمت میں بھی اشعار کہے اور ان کے بے بنیاد مخالفانہ پروپیگنڈے کی شعری سطح پر بھرپور تردید کی۔ فاضل بریلویؒ بھی دفاعِ مصطفیٰؐ میں سینہ سپر ہوجاتے ہیں اور حضورؐ کے دشمنوں پر برقِ رعد بن کر گرتے ہیں، کسی مصلحت کو پاؤں کی زنجیر نہیں بننے دیتے اس لیے کہ پارۂ نان کو اپنا دین نہیں سمجھتے، شاہانِ وقت کے در پر جبیں سائی ان کے مسلکِ عشق میں سرے سے شامل ہی نہیں۔

اف رے منکر یہ بڑھا جوشِ تعصب آخر
بھیڑ میں ہاتھ سے کم بخت کے ایمان گیا

منکرینِ نبیِ آخرالزماںؐ روزِ محشر کس منہ سے شفاعتِ حضورؐ کے طلب گار ہوں گے، قیامت کا دن رسولِ اول و آخرؐ کے اختیارات کے عملی نفاذ کا دن ہے، یہ دن تاجدارِ کائناتؐ کی عظمتوں اور رفعتوں کے ظہور کا دن ہے۔ فاضل بریلویؒ کی نعتیہ شاعری کا ایک ایک لفظ باوضو ہوکر ثنائے حبیبِ کبریا میں مصروف ہے۔ آنسوؤں کے کتنے ہی قلزم درِ اقدس پر بہہ رہے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ فاضل بریلویؒ منکرینِ شان رسالت کے لیے شمشیر بے نیام ہیں، وہ کبھی مقام رسالت کا تحفظ کرتے دکھائی دیتے ہیں کبھی اختیارات مصطفیٰ کے مخالفین کے ساتھ پنجہ آزمائی کرتے نظر آتے ہیں، کبھی ختم نبوت کے ڈاکوؤں کی سرکوبی کے لیے سربکف نکلتے ہیں اور کبھی تصرفاتِ حضورؐ کے منکرین کے خلاف صف آرائی

کرتے ہیں۔ عقائد کی واضحیت نے ان کے شعری سفر کو آئینوں کی طرح شفاف بنادیا ہے، منافقت اور ریاکاری کے پرندوں کو ان کی اقلیم سخن میں پر مارنے کی بھی اجازت نہیں، منکرین رسول بھول جاتے ہیں کہ آقا علیہ السلام کے سرِ اقدس پر ہی تاجِ لولاک سجایا گیا ہے، یہ کائناتِ رنگ و بو صدقہ ہے حضورؐ کے قدموں کا، فاضل بریلویؒ فرماتے ہیں:

محمدؐ برائے جناب الٰہی
جنابِ الٰہی برائے محمدؐ
اجابت نے جھک کر گلے سے لگایا
بڑھی ناز سے جب دعائے محمدؐ
خدا کی رضا چاہتے ہیں دو عالم
خدا چاہتا ہے رضائے محمدؐ

فاضل بریلویؒ کا یہ نعتیہ آہنگ جدید اردو نعت کو بھی کئی حوالوں سے سندِ جواز عطا کرتا ہے۔ روایت کا تسلسل برقرار نہ رہے تو فنی ارتقا بھی رک جاتا ہے اور تخلیقی صلاحیتوں کو زنگ سا لگ جاتا ہے، جدید اردو نعت بھی اپنے روشن ماضی کی امین و پاسدار اور وارث ہے۔ فاضل بریلویؒ کی تخلیق اور فنی نمود کا ذائقہ اکیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں کہی جانے والی نعت میں بھی دیکھا جاسکتا ہے، ''مصطفیٰ جان رحمت'' کی شگفتگی اور تازگی آج بھی جوں کی توں برقرار ہے۔ اس عظیم سلام پر فرسودگی اور بوسیدگی کا سایہ بھی نہیں پڑنے پایا۔ آج سے کوئی چالیس سال قبل جناح ہال سیالکوٹ میں بچوں کی ایک تقریب کے دوران شمس حیدر کے ایک سوال کے جواب میں مَیں نے کہا تھا کہ مجھے اپنے آباء سے وراثت میں دو چیزیں ملی ہیں، ایک حبِ رسولؐ اور دوسری پاکستان کے ذرے ذرے سے محبت، یہی دو محبتیں میری پہچان ہیں یہی دو محبتیں میری شناخت ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ اعلیٰ حضرت احمد رضا خان بریلویؒ کا سلام ''مصطفیٰ جان رحمت پہ لاکھوں سلام'' اور پاکستان کا

قومی ترانہ سنتے سنتے عمر رواں بیت جائے، حاضرین پر اس جواب کا یقیناً خوشگوار اثر مرتب ہوا تھا۔

جدید اردو نعت کا کینویس وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے، مضامینِ نو کا ایک سیلِ بیکراں ہے جو نعت کے بحرِ توصیف میں موجزن ہے، بعض لوگ نعت کو جدید و قدیم کے حوالے سے نہیں دیکھتے مثلاً میرے عزیز دوست سید آفتاب احمد نقوی شہید کا موقف یہ تھا کہ نعت نعت ہوتی ہے اسے جدید و قدیم کے خانوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ مَیں ڈاکٹر شہید سے کہا کرتا تھا کہ یقیناً نعت نعت ہی ہوتی ہے اور اسے نعت ہی ہونا چاہیے لیکن یہ کیسے ممکن ہے کہ شاعر اپنے گرد و پیش سے آنکھیں بند کرے، ادبِ عالیہ کے پس منظر میں اپنے عہد کی تاریخ ہی نہیں جغرافیہ بھی دکھائی دیتا ہے، جمالیاتی قدروں کی پاسداری کا معاملہ الگ ہے، کیا حفیظ تائب کی نعت اپنے ڈکشن، مضامین، سوچ اور اظہار کے حوالے سے فاضل بریلویؒ کی نعت سے مختلف نہیں؟ کیا دو صدیاں گذر جانے کے بعد ذہنی اور فکری سطح پر کوئی تبدیلی بھی رونما نہیں ہوئی؟ کیا شعر کا ثقافتی منظر نامہ قدموں کی شکست و ریخت کا عینی شاہد نہیں؟ اگر ان سوالوں کا جواب نفی میں نہیں اور یقیناً نفی میں نہیں تو پھر قدیم و جدید کی تقسیم بھی بالکل جائز ہے اور فطری تقاضوں سے ہم آہنگ ہے، اگر آج فاضل بریلویؒ زندہ ہوتے تو ان کی نعت عصرِ نو کے تمام مسائل و مصائب کا بھی ضرور احاطہ کرتی، ان کی نعت یقیناً کئی حوالوں سے حدائق بخشش میں درج نعتیہ کلام سے مختلف ہوتی، زمانی اور مکانی فاصلے فن کے ارتقائی مراحل میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں، ان کے حیطۂ اثر کا انکار ممکن ہی نہیں، کرامت علی شہیدی، محسن کاکوروی، علامہ اقبال، احسان دانش، حفیظ جالندھری، احمد ندیم قاسمی، حافظ مظہرالدین، عبدالعزیز خالد، ابوالخیر کشفی، عاصی کرنالی، خالد احمد، اقبال کوثر، راجا رشید محمود، ریاض مجید اور صبیح رحمانی کی نعت میں ثقافتی، تہذیبی، مجلسی، عمرانی، فکری اور عصری حوالوں سے کچھ تو فرق ہوگا، فن کوئی جامد شے تو نہیں۔

حضرت علیؓ کے ایک قول کا مفہوم کچھ یوں ہے کہ اپنے بچوں کو وہ تعلیم نہ دو جو

تم نے حاصل کی تھی اس لیے کہ تمہارا زمانہ اور تھا اور تمہارے بچوں کا زمانہ اور ہے۔ یہ ترقی پسندانہ رویہ تو آج کا کوئی ''روشن خیال'' مفکر بھی پیش کرنے کی کم کم ہی جرأت کر سکے گا۔ سچ تو یہ ہے کہ کوئی تخلیق کار بھی اپنے عہد کے اجتماعی رویوں کو نظر انداز کر کے تخلیقِ حسن کے تخلیقی عمل سے نہیں گذر سکتا، یہی حال فاضل بریلویؒ کی نعتیہ شاعری کا بھی ہے۔ اپنا اور اپنے عہد کا حوالہ دیتے وقت وہ خواہ مخواہ احساسِ کمتری کا شکار نہیں ہوتے بلکہ ایک بڑے تخلیق کار کی طرح وقت کا ہر چیلنج قبول کرتے ہیں، قدم قدم پر اعتماد کے چراغ روشن کرتے دکھائی دیتے ہیں، کسی مرحلہ پر بھی ان کے پائے استقلال میں لغزش نہیں آنے پائی، معذرت خواہانہ لہجہ اختیار کرنا ان کی سرشت ہی میں شامل نہیں۔

آج کا نعت نگار حضورؐ کی ذاتِ اقدس کے حوالے سے اپنی اور اپنے عہد کی پہچان کا آرزو مند ہے۔ کبھی وہ اپنے ذاتی دکھوں کے حوالے سے آقائے رحیم و کریم کے درِ عطا پر پلکوں سے دستک دیتا ہے اور کبھی اپنے عہد کے اجتماعی مسائل کے حوالے سے نبیٔ رحمت کی بارگاہِ بے کس پناہ میں عرض گزارتا ہے۔

اس لیے جدید اردو نعت شاعر کی اپنی ذات کے کئی حوالوں سے اعتماد و اعتبار کے نئے مفاہیم کی آئینہ دار بن گئی ہے۔ بعض لوگ اس پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں کہ نعت تو حضورؐ کی توصیف و ثنا کا نام ہے اس میں شاعر کی ''مَیں'' کہاں سے آ گئی۔ اس اعتراض کا مختصر سا جواب یہ ہے کہ مسائل و مصائب کی آگ میں جلتا ہوا انسان شہرِ خنک کی شاداب ہواؤں کا دامن نہیں ڈھونڈے گا تو اور کیا کرے گا؟ وہ کشکولِ آرزو میں حروفِ التجا سجا کر اپنے سخی کے در پر صدا نہیں لگائے گا تو اور کہاں جائے گا کہ اللہ تک رسائی کا ہر راستہ بھی تو دہلیزِ مصطفیٰ کو چوم کر آگے بڑھتا ہے، شہرِ حضورؐ میں چھوٹے سے گھر کی تمنا بھی اسی سلسلے کی ایک دلآویز کڑی ہے اس نکتے کی مزید وضاحت بھی کی جا سکتی ہے لیکن طوالت کا خوف دامن گیر ہے، خوشگوار حیرت ہوتی ہے کہ فاضل بریلویؒ کے نعتیہ وژن میں بھی اپنی ذات کا حوالہ بڑے بھرپور انداز میں آیا ہے اور یہ حوالہ انتہائی عجز و انکساری سے

جمالیاتی قدروں کی پاسداری کے منصبِ جلیلہ پر رونق افروز نظر آتا ہے۔

ملکِ سخن کی شاہی تم کو رضا مسلم
جس سمت آگئے ہو سکّے بٹھا دیئے ہیں

مَیں یادِ شہ میں رو دوں عناول کریں ہجوم
ہر اشکِ لالہ فام پہ ہو احتمالِ گل

مفت پالا تھا کبھی کام کی عادت نہ پڑی
اب عمل پوچھتے ہیں، ہائے نکمّا تیرا

کرم نعت کے نزدیک تو کچھ دور نہیں
کہ رضائے عجمی ہو سگِ حسانِ عرب

مانا کہ سخت مجرم و ناکارہ ہے رضا
تیرا ہی تو ہے بندۂ درگاہ بے خبر

انسان انفرادی اور اجتماعی دونوں حوالوں سے رحمتِ حضورؐ کا متلاشی اور طلبگار ہے، ان حوالوں کا ہر زاویہ جدید اردو نعت میں ضرور آئے گا، یہ نعت کے فنی ارتقاء کا تقاضا بھی ہے، تیزی سے بدلتے ہوئے ثقافتی اور مجلسی پس منظر کی بنیادی ضرورت بھی ہے۔ یہ ''میں'' کوئی شجرِ ممنوعہ نہیں، پیغمبرؐ اور امتی کے درمیان ایک مجلسی رابطہ ہے، پروانے شمع پر نہیں گریں گے تو اور کہاں جائیں گے؟ ہر عہد کی نعت کسی نہ کسی حوالے سے ذاتی اور اجتماعی دکھوں کے اظہار کا وسیلہ بنتی رہتی ہے، امت مسلمہ جس قدر وقت کے دباؤ کا شکار ہوگی یہ حوالہ اتنی ہی شدت کے ساتھ ابھرے گا کیونکہ مکینِ گنبدِ خضرا سے رشتہ غلامی از سرِ نو

استوار کئے بغیر ہمیں کہیں اور جائے پناہ نہیں مل سکتی، فاضل بریلویؒ کی نعت بھی اسی حوالے کے فطری بہاؤ سے اغماض نہیں برتتی۔

جب تخلیق کے سوتے خشک ہونے لگتے ہیں، جب ذوقِ شعر غمِ روزگار کی گرفت میں آکر سسکنے لگتا ہے اور جب آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہونے کے اعزاز سے محروم ہونے لگتی ہیں تو مَیں ''حدائق بخشش'' کے چشمۂ آبِ حیات سے روح کی تشنگی کا مداوا کرتا ہوں۔

کس کے جلوہ کی جھلک ہے اجالا کیا ہے
ہر طرف دیدۂ حیرت زدہ تکتا کیا ہے

جوں جوں آگے بڑھتا ہوں، قفلِ جمود ٹوٹنے لگتے ہیں... حشر کا دن ہے، نفسا نفسی کا عالم ہے، ایک شخص فرشتوں کے گھیرے میں ہے، وہ مڑ مڑ کر کسی کی راہ دیکھ رہا ہے، کسی کے نام کی دہائی دے رہا ہے، ادھر سے شافعِ محشر حضورؐ رحمتِ عالمؐ کا گذر ہوتا ہے، نبیِٔ رحمتؐ فرشتوں سے دریافت فرماتے ہیں کہ یہ شور کیسا ہے؟ کون مصیبت میں گرفتار ہے، فرشتے عرض کرتے ہیں یارسول اللہ، ایک مجرم ہے آپؐ کے نام کی دہائی دے رہا ہے، حضور رحمتِ عالمؐ فرماتے ہیں چلو چل کر دیکھتے ہیں کیا ماجرا ہے؟ یہاں فاضل بریلویؒ کا قلم ورق پر روشن ستارے رقم کرنے لگتا ہے۔

کس کو تم موردِ آفات کیا چاہتے ہو
ہم بھی تو آکے ذرا دیکھیں تماشا کیا ہے

اُنؐ کی آواز پہ کر اٹھوں میں بے ساختہ شور
اور تڑپ کر یہ کہوں اب مجھے پروا کیا ہے

فرشتو! خبردار مجھے اب ہاتھ نہ لگانا، وہ دیکھو! میرے حامی، غم خوار آقاؐ تشریف

لا رہے ہیں۔ اس موقع پر بے ساختہ پیر نصیرالدین نصیر کا یہ مصرہ ہونٹوں پر مچل اٹھتا ہے۔

دیکھے تو مجھ کو نارِ جہنم لگا کے ہاتھ

اور اعلیٰ حضرت کے شہرہ آفاق سلام کا یہ شعر کتابِ تفہیم کے نئے ورق الٹنے لگتا ہے۔

ایک میرا ہی رحمت پہ دعویٰ نہیں
شاہ کی ساری امت پہ لاکھوں سلام

آنکھیں اشکبار ہوجاتی ہیں کشتِ دیدہ و دل میں بادِ بہاری چلنے لگتی ہے، ہونٹوں پر اسمِ محمدؐ کے گلاب رتجگوں کا موسم سمیٹ لیتے ہیں اور شہرِ سخن کے بند دروازے خود بخود کھلنے لگتے ہیں، ایک عرصہ تک میں سمجھتا رہا کہ یہ اشعار فاضل بریلویؒ کے تخیل کا تمثیلی روپ ہیں لیکن ایک دن اس مضمون کی حدیث میری نظر سے گذری تو میں چونک پڑا۔ فاضل بریلویؒ قرآن و سنت سے استدلال کرتے وقت کس احتیاط سے کام لیا کرتے تھے، واقعی نعت کہنا دو دھاری تلوار پر چلنے کے مترادف ہے، اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں بریلویؒ جیسے محتاط لوگ ہی اونٹوں پر کجاوے ڈالنے کا حق رکھتے ہیں، ملکِ سخن کی شاہی انہی پر ختم ہوتی ہے۔ فاضل بریلویؒ کی نعت کے ان گنت رنگ لمحۂ موجود کی فضائے نعت میں بھی آباد ہیں، خیمۂ شعر کی طنابیں زمین ہی نہیں آسمان میں بھی پیوست ہیں، ثنائے حضورؐ کو حرفِ زوال سے آشنا ہی نہیں ہونے دیا گیا۔

تخیل کی بلند پروازی، جذبات واقعات نگاری اور وارداتِ قلبی کی پیکر تراشی کے عناصر فاضل بریلویؒ کے نعتیہ کلام کو انفرادیت کا رنگ عطا کرتے ہیں، ندرتِ بیان نے سونے پر سہاگے کا کام کیا ہے۔ نکتہ آفرینی سے اثر پذیری تک خودسپردگی کے ان گنت مناظر تخلیق ہوتے نظر آتے ہیں منظر کشی اس قدر مکمل ہے کہ جزئیات تک روزِ روشن کی طرح روشن ہیں۔

سرکارؐ ہم کمینوں کے اطوار پر نہ جائیں
آقا حضورؐ اپنے کرم پر نظر کریں

اللہ کیا جہنم اب بھی نہ سرد ہوگا!
رو رو کے مصطفیٰ نے دریا بہا دیئے ہیں

وہ سوئے لالہ زار پھرتے ہیں
تیرے دن اے بہار پھرتے ہیں

جس کے تلووں کا دھوون ہے آبِ حیات
ہے وہ جانِ مسیحا ہمارا نبیؐ

لے رضؔا سب چلے مدینے کو
مَیں نہ جاؤں ارے خدا نہ کرے

لیکن رضؔا نے ختمِ سخن اس پہ کر دیا
خالق کا بندہ خلق کا آقاؐ کہوں تجھے

خوف نہ رکھ رضا ذرا تو، تو ہے عبدِ مصطفیٰ
تیرے لیے امان ہے، تیرے لیے امان ہے

کریم اپنے کرم کا صدقہ لئیم بے قدر کو نہ شرما
تو اور رضا سے حساب لینا رضا بھی کوئی حساب میں ہے

مَیں اک محتاج بے وقعت گدا تیرے سگِ در کا
تری سرکار والا ہے ترا دربار عالی ہے

شفاعت کرے حشر میں جو رضاؔ کی
سوا تیرے کس کو یہ قدرت ملی ہے
قرآن سے مَیں نے نعت گوئی سیکھی
یعنی رہے احکام شریعت ملحوظ

زمینی حقائق کا ادراک نہ ہوتو آسمانی حقائق کا شعور بھی حاصل نہیں ہوتا، فاضل بریلویؒ کی نعت کا ایک ایک شعر کیفِ سرمدی کے آبِ مقدس میں ڈوبا ہوا ہے، وادیٔ تخیل میں بادِ بہاری نہ چلے تو شعر نہیں ہوتا، فاضل بریلویؒ کے چمن زارِ نعت میں یہ باد بہاری مسلسل چل رہی ہے، عوامی سطح پر جو عظیم الشان پذیرائی ان کے نعتیہ کلام کو ملی ہے وہ کسی اور کے حصہ میں نہیں آئی۔ اسلوب اتنا دلکش کہ حرف حرف لو دے رہا ہے۔ برجستگی کہ اپنے نقطۂ کمال کو چھو رہی ہے، زبان و بیان کی نزاکتوں کا کیا کہنا، الفاظ کا چناؤ بہت ہی سوچ سمجھ کر کرتے ہیں، آپ نے سچ مچ قریۂ نعت میں فصاحت و بلاغت کے دریا بہادیئے ہیں، زبان و بیان کی باریکیوں پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ سلاست، روانی اور اثر پذیری عوامی سطح پر قبول عام کی سند سے سرفراز ہورہی ہے۔

فاضل بریلویؒ کے ہاں محاورات کا استعمال مثالی ہے۔ مفاہیم کی ایک نئی دنیا آباد ہے، تراکیب کی بندش اپنی مثال آپ ہے۔ ندرتِ فکر کے کیا کہنے، اردو غزل کی ایمائیت اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ کلام رضا میں جلوہ گر ہے، اپنی تمام تر نازک خیالی کے باوجود ادب و احترام کا دامن کہیں بھی ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پایا۔ فاضل بریلویؒ نے شعوری اور لاشعوری دونوں سطحوں پر بارگاہِ رسالت مآبؐ میں تصویرِ ادب بن جانے کی روایت کو زندہ رکھا ہے بلکہ ادب و احترام کے حصار میں غزل کے رچاؤ اور بہاؤ کو مقید

کرنے کا کارنامہ سرانجام دیا ہے، فاضل بریلویؒ نے ہر مرحلہ پر اپنے اس نقطۂ نظر کی پاسداری کی ہے کہ نعتِ حضورؐ لکھنا نہایت مشکل ہے لیکن نعت گوئی کو آسان سمجھ لیا گیا ہے، نعت کہنا دو دھاری تلوار پر چلنا ہے اگر بڑھتا ہے تو الوہیت میں پہنچ جاتا ہے اگر کمی کرتا ہے تو تنقیص ہوتی ہے، مختصر یہ کہ فاضل بریلویؒ کی نعتیہ شاعری تازہ ہوا کا ایک جھونکا ہے، آپ کا نعتیہ مجموعہ کلام حدائق بخشش ۱۳۲۵ھ ہجری میں شائع ہوا تھا۔ ایک صدی گذر جانے کے بعد بھی فاضل بریلویؒ کے ذخیرۂ شعر سے اکتسابِ شعور کر کے اس تازگی اور شادابی کو لمحاتِ جبر کی گرفت سے محفوظ رکھا جائے گا۔ آنے والی ہر صدی نعت کی صدی ہے تو نعت کے حوالے سے یہ فاضل بریلویؒ کی بھی صدی ہے کہ ان کی فضائے شعر میں موسمِ ناروا کی گرم ہواؤں کا چلنا ممکن ہی نہیں یہاں دائماً گنبدِ خضرا کی ہریالی خیمہ زن ہے۔

# امیر ملتؒ اور عشق رسولؐ

(۳۰ اگست ۱۹۹۸ء روزنامہ پاکستان)

امیر ملت حافظ پیر جماعت علی شاہؒ محدث علی پوری 1841ء میں پیدا ہوئے اور 1951ء میں آپ کا وصال ہوا، ایک سو دس برس کا یہ عرصہ جنوبی ایشیا میں فکری توانائیوں کے سیاسی آہنگ میں صورت پذیر ہونے کا زمانہ ہے، اسلامیان ہند کے نظریاتی تشخص کی آئینہ برداری کا عہد ہے، کھوئے ہوؤں کی جستجو میں نکلنے والے قافلوں کی کامرانیوں اور کامیابیوں کا دور ہے۔ 1857ء کی جنگ آزادی میں مغلیہ سلطنت کے اقتدار کا چراغ گل ہوا تو اسلامیان ہند کا سیاسی، معاشی، علمی، تہذیبی، مجلسی، سماجی اور ثقافتی زوال و انحطاط بھی اپنی انتہا کو پہنچ گیا لیکن ابتلاء و آزمائش کے اس دور میں بھی روحانیت کے چراغ زوال آمادہ تہذیب کے گرد روشنی کا حصار باندھے ہوئے، ہوائے مخالف کے مدمقابل سینہ سپر رہے، یاسیت کے بھنور میں بھی امید کی کرنیں پاتال کی گہرائیوں میں اترتی رہیں، تاریخ شاہد و عادل ہے کہ اسلامیان ہند کے گرد سیاسی، اقتصادی اور ثقافتی غلامی کا حلقہ تنگ کرنے کے بعد مسلمانوں کو ہر شعبہ زندگی میں پسماندگی اور فرسودگی کی دلدل میں دھکیل دیا گیا تھا، برہمنی سامراج اور برطانوی استعمار نے مسلمانوں کی عظمت رفتہ کی بازیابی کے ہر تصور کی راہ میں اونچی اونچی دیواریں چن دی تھیں اور روشنی کے سفر کو روکنے کے لیے اپنے تمام وسائل، سازشوں اور فتنوں کی بھٹی میں جھونک دیئے تھے، سب سے پہلا وار مسلمانوں کے تعلیمی نظام پر کیا گیا کہ مسلم امہ کے ذہن جدید کا روحانی اور وجدانی رشتہ اپنی عظیم ثقافتی اقدار سے کلیتاً منقطع کر دیا جائے۔ دوسرا وار مسلمانوں کے مرکز عقیدت پر کیا گیا کہ اگر مسلمان کے سینے میں عشق مصطفیؐ کے چراغوں کو بجھادیا جائے تو وہ راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہوکر کٹے ہوئے پھل کی طرح سامراج کی جھولی میں آگرے گا، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ برطانوی سامراج نے اسلام کے خلاف نت نئے فتنوں کی سرپرستی کی، قادیانیت کا

تھوہڑ کاشت کرکے زرخیز زمینوں کو زہر آلود کرنے کی سازش کی، حضورؐ کی ذاتِ اقدس کو مباحث اور مناظروں کا موضوع بنا کر مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے درمیان نفاق کا بیج بویا اور انہیں متحارب اور متصادم گروپ بنا کر ایک دوسرے کے سامنے لا کھڑا کیا۔ اس فتنہ پروری کا مقصد یہ تھا کہ امت مسلمہ کے اپنے نبیؐ سے غلامی کے اس رشتے کو کمزور کردیا جائے جو مسلمانوں کے اتحاد کی سب سے بڑی بنیاد ہے۔ معراج ایمان یہی ہے کہ روح محمدؐ کشور دیدہ و دل میں خوشبو بن کر مہکتی رہے۔

زخم کھا کر بھی اسلامیان ہند نے اپنے نظریاتی تشخص کی مشعل اپنے ہاتھ سے گرنے نہ دی۔ صوفیا اور اولیاء کرام کی مساعی جمیلہ سے کفرستان ہند میں شمع اسلام روشن ہوئی تھی۔ صدیوں بعد اس کی مخالفت کا فریضہ بھی انہی کو سرانجام دینا تھا، خانقاہوں سے نکل کر میدان عمل میں رسم شبیری کے روح پرور مناظر سامنے آنے لگے، بالآخر جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کو پاکستان کی صورت میں اپنی منزل قریب ہوئی اور 14 اگست 1947ء کو دنیا کے نقشے پر سب سے بڑی اسلامی مملکت کا ظہور ہوا۔ اس سارے عرصے میں ہر سمت تشکیک و ابہام کی دھند چھائی ہوئی تھی فکر ونظر کی پگڈنڈیوں پر مسلم لیگ کے شانہ بشانہ علماء اور مشائخ عزم وعمل کے دیئے سجا رہے تھے، قائداعظم کی ولولہ انگیز قیادت میں اسلامیان ہند ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو رہے تھے، ماضی قریب میں اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں بریلویؒ نے الحاد وکفر کی ہزار آندھیوں کے باوجود محبت رسولؐ کے چراغوں کی لو کو مدھم نہ ہونے دیا۔ امیر ملت حافظ پیر جماعت علی شاہ بھی اپنی دونوں ہتھیلیوں پر عشق مصطفیٰؐ کے چراغ جلا کر برصغیر کے دور دراز علاقوں میں عشق رسولؐ کی روشنی تقسیم کررہے تھے، خوش قسمتی سے یہ رہنمایان قوم ہنود و نصاریٰ کے بچھائے ہوئے دام فریب سے اسلامیان ہند کو بچانے میں کامیاب ہوگئے اور ان کے ایمان کو اتنی مضبوط دیواریں عطا کیں کہ قیام پاکستان کے بعد علماء کی طرف سے قرار داد مقاصد آئین پاکستان کا مستقبل حصہ قرار پائی لیکن اس قرار داد کے بعد علماء اور مشائخ پھر اپنے حجروں میں چلے گئے اور رسمِ شبیری ادا

کرنے کے لیے کوئی میدان عمل میں نہ رہا، جزوی کوششیں ضرور ہوئیں لیکن ہوس اقتدار نے نظریاتی اثاثوں کو جلا کر راکھ کر دیا اور ملت اسلامیہ کو سقوط ڈھاکہ کے المیے سے دوچار ہونا پڑا اور آج ہم باقی ماندہ پاکستان میں اپنے نظریاتی تشخص کی تلاش میں سرگرداں ہیں لیکن ہمیں اپنی منزل نہیں مل رہی۔اس سیاسی، سماجی اور معاشی صورت حال نے بیسویں صدی کے اوائل اور وسط میں پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے مہیب سائے میں مسلمانانِ ہند میں اس شعور آزادی کو جنم دیا جس نے تخلیقی سوتوں میں نئی جمالیات اظہار کو متشکل کیا اور حب رسول کو وہ جولانیاں عطا کیں جو امیر ملتؒ کے سیلان نور کی شکل میں برصغیر کی پہنائیوں کو روشن کرتی رہیں اور تخلیقی ادب میں شعور نعت کا خمیر اٹھاتی رہیں۔

انیسویں صدی کا نصف آخر اور بیسویں صدی کا نصف اول برصغیر کی زندگی کا ہنگامہ خیز دور ہی نہیں، تاریخی صداقتوں کے اثبات کا ایک فیصلہ کن موڑ بھی ہے، اس عہد میں اسلامیان ہند نے پسماندگی کی اتھاہ گہرائیوں سے ابھر کر علم وحکمت اور دانائی کی شمع کو پھر سے اپنے ہاتھ میں لینے کی سعی مشکور کی، سرسید احمد خان نے روایت علمی کے احیاء کے لیے جس سفر کا آغاز کیا تھا، وہ شاداب موسموں کی بشارت لے کر افق دیدہ و دل پر طلوع ہو رہا تھا، علم کی شمع پھر سے اپنے ظلمت کدوں میں روشن کر کے دراصل اسلامیان ہند نے شمع رسالتؐ کی اس روشنی سے تجدید عہد کیا جو روشنی آج سے چودہ سو سال پہلے غار حرا کی تاریکیوں میں چمکی تھی۔ امیر ملت نے مسلم علی گڑھ یونیورسٹی کی تعمیر کے لیے ایک خطیر رقم فراہم کر کے شعوری اور لاشعوری دونوں سطحوں پر حضور ختمی مرتبتؐ سے اپنے رشتہ غلامی کو زندہ و پائندہ رکھا۔ اس لیے کہ احساس غلامی عشق مصطفیؐ کے زمزموں ہی سے پھوٹتا ہے اور ایثار وقربانی کے پانیوں میں نمو پذیر ہوتا ہے، حضور قبلہ عالم، تحریک فروغ عشق رسولؐ کے داعی تھے، یہ تحریک تزکیہ نفس اور تطہیر قلوب کے مراحل سے گزر کر قدم قدم پر سرکار مدینہؐ کی محبت کے چراغ روشن کر رہی تھی اور کر رہی ہے، امیر ملت، حفیظ جالندھری کے ایک نعتیہ شعر پر نقدی سمیت اپنی واسکٹ اتار کر شاعر رسولؐ کی خدمت میں پیش کر دیتے ہیں، کسی

نعت خواں سے نعت سنتے ہیں تو عالم شوق وجد میں آجاتا ہے اور اسی وقت مدینے کی راہ گزر پر ہو لیتے ہیں۔ یہ نعت کا وجدان، نعت کا رنگ سیرت اور نعت کی عملی ہیئت ہے۔

آپ فنا فی الرسولؐ تو تھے ہی، اپنے مریدین کے دامن آرزو کو بھی آرزوئے مدینہ کی دولت سے مالا مال کرتے اور ان کے قصر ایمان میں بھی عشق مصطفیؐ کی دھنک کے تمام رنگ اتارتے رہے، وابستگان آستانہ محدث علی پوری آج بھی چہار دانگ عالم میں عشق رسولؐ کے جام لنڈھانے کے منصب جلیلہ پر رونق افروز ہیں، ایک جذبہ عشق رسولؐ کہ نعت کے پیرائے میں مجھے جس کے اظہار کی سعادت نصیب ہوئی ہے اور دوسرے اس خطہ دیدہ و دل سے غیر مشروط اور غیر متزلزل کومٹ منٹ، یہ قریہ محمدؐ جو مسلم امہ کی پہلی دفاعی لائن ہے اور جسے سچ مچ اسلام کا قلعہ بننا ہے، یہ دونوں محبتیں عطا ہیں قبلہ محدث علی پوری کی، کہ انہوں نے اپنے مریدوں کی تربیت اسی انداز سے کی۔ وہ خود عشق مصطفیؐ کی علامت بن گئے اور ان کے گھروں کے در و دیوار بھی درود پڑھتی ہوئی ساعتوں کے جھرمٹ میں گم ہوگئے۔ یہ حضور قبلہ عالم کا عشق رسولؐ ہی تھا کہ آپ نے حجاز ریلوے کی تعمیر میں دل کھول کر حصہ لیا۔ سرزمین محبوب کے لوگ قحط سالی کا شکار ہوتے تو شمع رسالتؐ کا یہ پروانہ شہر نبیؐ کی گلیوں کا یہ دیوانہ تڑپ اٹھتا، آپ وافر مقدار میں غلہ عرب میں بھجواتے کہ دیار حضورؐ کے باسیوں کے چہروں پر پژمردگی کا ہلکا سا بھی سایہ نہ پڑنے پائے، عرب یونہی آپ کو ابوالعرب نہیں کہا کرتے تھے۔ یہ امیر ملت کا عشق رسولؐ ہی تھا کہ مرزا غلام احمد قادیانی کے کفر کے رد میں دیوانہ وار میدان عمل میں کود پڑے، حضور قبلہ عالم کی پیش گوئی کے نتیجے ہی میں نبوت کا یہ جھوٹا دعویدار واصل جہنم ہوا۔ یہ ان کی محبت رسولؐ ہی کا کرشمہ تھا کہ شدھی تحریک کے سیلاب کو روکنے کے لیے سر پہ کفن باندھ کر علی پور سے نکل کھڑے ہوئے اور لاکھوں مسلمانوں کو ارتداد کی آگ میں جلنے سے بچایا، یہ آپ کا جذبہ وفائے نبیؐ ہی تھا کہ مسلم لیگ کی سرپرستی فرماتے ہوئے یہ جرأت مندانہ اور مجاہدانہ اعلان فرمایا کہ مخالفین پاکستان کو مسلمانوں کے قبرستانوں میں دفن نہیں ہونے دیا جائے گا۔ امیر

ملت کا معمول یہ تھا کہ اٹھتے بیٹھتے محبوب کی گلیوں کا ذکر کرتے رہتے، دیار ہجر میں رہ کر بھی ہوائے مدینہ سے ہمکلامی کا شرف حاصل کرتے، شہر حضور کے چرند پرند سے بھی ٹوٹ کر محبت کرتے، خاک مدینہ کو اپنی آنکھ کا سرمہ بناتے، حضورؐ کا اسم گرامی ہونٹوں پر آتا تو آنکھیں چھلک پڑتیں، کوئی مدینے کی گلیوں کا ذکر چھڑتا تو پلکیں بھیگ بھیگ جاتیں، روضہ اطہر کے کلید بردار آغا خلیل بھی آپ کے حلقہ ارادت میں شامل تھے، حضور قبلہ عالم کو روضہ اطہر کی مقدس معتبر اور معطر جالیوں کے پیچھے کئی بار شب گزارنے کی سعادت نصیب ہوئی۔

حج پر جاتے ہیں تو پہلے حضورؐ کی بارگاہ میں حاضری دیتے ہیں کہ یہی حکم خداوندی ہے، شہر حضور ﷺ میں دل کھول کر سخاوت فرماتے ہیں کہ ہمارا سب مال و دولت آقا حضورؐ کے قدموں کا دھوون ہی تو ہے۔ اہل مدینہ کی دعوتوں کا سلسلہ چل نکلتا تو عشق و خود سپردگی کے پیکر دلنواز میں ڈھل جاتا۔ فرماتے، مدینہ میرا وہ وطن جو نبی آخرالزمانؐ کا وطن ہے، وہ وطن جسے تاجدار کائناتؐ کے قدموں کو بوسہ دینے کا اعزاز ملا ہے، وہ وطن جو پوری کائنات کا مرکز نگاہ ہے، جہاں ہر آن اللہ کی رحمت برستی ہے۔

ہمارے عہد کے ارباب فکر و نظر اور اصحاب دانش کی سوچ مصلحتوں کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے، حرفِ حق زبان پر آنے سے پہلے ہی ہم بے ضمیری کے قفل اپنے ہونٹوں پر چڑھا لیتے ہیں، مبادا امریکہ بہادر کی جبین شکن آلود ہوجائے اور اس کی گڈ بکس میں سے ہمارا نام حذف کردیا جائے، جب کسی قوم کے سیاستدان اپنا نام میر جعفر اور میر صادق کے ساتھ بریکٹ کرانے پر رضا مند ہوجائیں تو پھر دنیا کی کوئی طاقت اس قوم کو اجتماعی خودکشی سے نہیں روک سکتی اور کچھ ایسی اندوہناک صورتحال سے ہمارے سیاستدانوں نے ہمیں دوچار کر رکھا ہے، ہم اپنے مفادات کے قیدی محض اس لیے بن کر رہ گئے ہیں کہ ہم عشق رسولؐ کو ایک تحریک بنا کر سینوں میں احساس غلامی کی آگ کو بھانبڑ بنانے میں ناکام رہے ہیں، اگر ہم نے جذبہ وفا کو ایک تحریک کا رنگ دیا ہوتا تو آج بے غیرتی اور

بےحمیتی کی چادر میں منہ چھپانے کی بجائے ہم عالم کفر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے للکارنے کے تاریخی عمل سے گزر رہے ہوتے۔ یہ وہ نعت ہے جو سیرت سے شروع ہوتی ہے اور سیرت پر ختم ہوتی ہے۔ سردار انبیاءﷺ کی سیرت پاک ہی ہماری نعت کا ظاہر و باطن ہے۔ امیر ملت نے ہمیں یہی درس دیا ہے اور اسی شعور نعت کی پرورش کی ہے۔

# صبیح رحمانی ایک منفرد نعت گو

(صبیح رحمانی کی نعتیہ شاعری،فکری وتنقیدی تناظر، مرتبہ: ڈاکٹر شمع افروز)

بیسویں صدی کی آخری دہائی کے نصف آخر میں اردو نعت کے تخلیقی اور فنی سفر کا جائزہ لیتے ہوئے ہم پر یہ خوش گوار حیرت منکشف ہوئی ہے کہ ثنائے رسولﷺ کی قندیل بدستور روشنی کے ساتھ رنگوں سے جھملا رہی ہے اور ماہ وسال کی گرد میں اس کا چہرہ کہیں بھی دھندلانے نہیں پایا۔ اخلاقی گراوٹ، ذہنی پراگندگی،فکری آلودگی اور جنسی بے راہ روی کے اس دورِ بے اماں میں جب کہ انسانی معاشرے کو حیوانی معاشرے میں تبدیل کرنے کی ابلیسی سازش تقریباً مکمل ہورہی ہے اورعریانی، فحاشی، بے غیرتی اور بے حمیتی کا عفریت ہر چیز کو نگل جانے کے لیے پھنکار رہا ہے، نعت دلوں میں گداز عشق، طہارت اور پاکیزگی کے چراغ سجا رہی ہے۔ کشور دیدہ و دل میں بادِ بہاری چل رہی ہے، یہ احساس اور یقین درِ دل پر دستک دے رہا ہے کہ اکیسویں صدی کے دروازے جب شاعر رسول پر وا ہوں گے تو اس کی دونوں ہتھیلیوں پر مدحت رسولﷺ کے چراغ اس طرح روشن ہوں گے کہ نئی صدی کے آنگن میں اترنے والے ہر لمحے کا ضمیر فاران کی چوٹیوں پر چمکنے والے آفتاب رسالتﷺ کی ضیا پاشیوں سے منور و تاباں ہوگا اور اس کے چہرے کے گرد کیف مسلسل کا ایک ہالہ ہوگا، وہ ہالہ جو ہم غلاموں کا سرمایہ حیات بھی ہے اور توشۂ آخرت بھی۔

آج کی نعت کا کینوس بہت وسیع ہو چکا ہے اور شاعر حضورﷺ کی ذات اقدس کے حوالے سے اپنی اور اپنے عہد کی پہچان کے مرحلے سے گزر رہا ہے۔ بعض لوگ نعت میں جدید و قدیم کی تفریق کے قائل نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ نعت، نعت ہوتی ہے اور بس۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ آج کی نعت اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں بریلویؒ کے دور کی نعت سے ظاہراً ہی نہیں باطناً بھی بہت مختلف ہے۔ ہر دور کی شاعری (بلکہ تمام فنون لطیفہ) کی اپنی

الگ پہچان ہوتی ہے، اس کا اپنا ایک الگ لہجہ اور ذائقہ ہوتا ہے، ہر عہد کے اپنے مسائل ہوتے ہیں، سوچ اور اظہار کے رویے ہی نہیں موضوعات بھی مختلف ہوسکتے ہیں۔ شاعرانہ اپروچ مختلف ہوسکتی ہے، قدیم و جدید نعت اپنے مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے مختلف قرار پاتی ہے، جدید اردو نعت اپنی شاندار اور توانا روایات سے انقطاع کا نام نہیں بلکہ اپنی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے تخلیق کے نئے افق تسخیر کرنے کا نام جدیدیت ہے۔ اس پس منظر میں ''جادۂ رحمت'' کے شاعر صبیح رحمانی کے شعری وژن کا جائزہ لیں تو اعتبار کے دونوں رنگ قدم قدم پر جلوہ گر دکھائی دیتے ہیں۔ ایک منفرد اسلوب ہی کسی تخلیق کار کی بقا کا خاصہ ہوتا ہے۔ صبیح رحمانی خوش قسمت شاعر ہیں کہ سفر کے پہلے مرحلے میں ہی انہیں قدرت نے اس اعزاز سے نوازا ہے۔ یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ آگے چل کر ان کے منفرد اسلوب میں مزید نکھار پیدا ہوگا۔

صبیح رحمانی نے جو شعری وژن تخلیق کیا ہے، اس میں روح پر سحاب کرم کے برسنے کا منظر دیدنی ہے۔ تشنہ ہونٹوں پر اُگی آرزوؤں کے وجد میں آنے کا موسم بھی ناقابل فراموش ہے، اپنے عہد کے آشوب نے ان کے لہجے کو کھردرا پن نہیں بلکہ سوز و گداز کی دولت سے سرفراز کیا ہے۔ شوق کی آنچ پر جذبوں کے پگھلنے کا عمل جب تخلیقی مراحل سے گزرتا ہے تو شاعر کی روح بھی رقص میں آجاتی ہے اور پھر قرطاس وقلم کی ساری توانائیاں ان کے سامنے دست بستہ کھڑی نظر آتی ہیں، ان کا قلم پوری روانی کے ساتھ ''جادۂ رحمت'' پر گامزن ہے۔ ''پہچان'' ایک خوبصورت حمدیہ نظم ہے، اپنے خالق کی ثنا کا کیا خوبصورت انداز ہے:

وہ جس نے موجوں کو تیشہ اندازیاں سکھا کر
رقم چٹانوں پہ راز ہائے ہنر کیے ہیں

شاعر ان چٹانوں پر رقم راز ہائے ہنر کی تلاش میں ہے، ایک جستجو اسے صحرا صحرا لیے پھرتی ہے، آج کی نعت ثنائے حبیب کبریا سے محراب جلیل کی طرف سفر کر رہی ہے۔

یہ سفر حکم خداوندی کے عین مطابق ہے اس لیے کہ اللہ تک رسائی حضور ﷺ کے وسیلہ جلیلہ کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ قلم دہلیز مصطفیٰ ﷺ کو چوم کر بارگاہِ خداوندی میں سجدہ ریز ہوتا ہے۔ یہی رویہ صبیح رحمانی کی نعتیہ شاعری کا اساسی رویہ ہے۔ شاعر بارگاہِ خداوندی میں التماس گزار ہے:

رفتہ رفتہ کھول مجھ پر راز ہائے جسم و جاں
دھیرے دھیرے مجھ پہ ظاہر تو مری پہچان کر

نئی تراکیب، نئے استعارے اور نئی علامتیں قدم قدم پر تازگی کے احساس کو دو چند کرتے چلے جاتے ہیں، شاعر حیرتوں کے سمندر میں گم ہے۔

تو ہے آئینہ ازل یا رب
اور میں ہوں ابد کی حیرانی

صبیح رحمانی الفاظ کا چناؤ بڑی احتیاط سے کرتے ہیں، جذبوں کو بے لگام نہیں ہونے دیتے اور جدت طرازی کے شوق میں فن کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ ان کی نعت میں سبک ندی کا ٹھہراؤ، دھیما پن ہے۔ اپنے عہد کے آشوب کی بات کرتے ہیں تو ان کے لہجے میں تلخی نہیں آتی بلکہ دھیما پن، اضطراب اور تشویش کی ہلکی ہلکی لہروں میں تبدیل ہو جاتا ہے، حرف زندہ کی تلاش میں نکلنے والے شاعر کی طرزِ نوا ملاحظہ فرمائیے:

حرا کے سوچتے لمحوں کو زندہ ساعتیں لکھ کر
صفا کی گفتگو کو آبشار آگہی لکھوں
قلم کی پیاس بجھتی ہی نہیں مدح محمد میں
میں کن لفظوں میں اپنا اعتراف تشنگی لکھوں

پندار آرزو کو کہیں بھی شکستہ لمحوں کے سپرد نہیں کرتے بلکہ اپنی تخلیقی اکائی کے تحفظ

کے لیے جمال کی ہر کیفیت کو گرفت میں لینے کی سعی کرتے ہیں اور اکثر اس میں کامیاب بھی رہتے ہیں، خود احتسابی کے عمل کو شعوری سطح پر بھی جاری رکھتے ہیں، رعنائیوں کے جھرمٹ میں خوبصورت خیال کا تعاقب کرتے دکھائی دیتے ہیں، بالکل ایک بچے کی طرح جو جگنوؤں اور تتلیوں کے تعاقب میں بہت دور تک نکل جاتا ہے اور جگنو کو مٹھی میں بند کرکے یا تتلیوں کے پر کتابوں میں سجا کر ایک عجیب طمانیت محسوس کرتا ہے، کاسۂ حرف و نوا میں تاثیر کی بھیک کے طلب گار صبیح رحمانی، کرمِ مصطفیٰ ﷺ کی بات کرتے ہیں تو ساری فضا جھوم اٹھتی ہے:

سرِ حشر ان کی رحمت کا صبیحؔ میں ہوں طالب
مجھے کچھ عمل کا دعویٰ کبھی تھا نہ ہے نہ ہوگا

شاعر اپنی ذات کو تصور رسول ﷺ میں گم کردیتا ہے، وہ عشق رسول ﷺ میں فنا ہوکر اپنی ہستی کی بقا کا تمنائی ہے۔

صبیحؔ ان کی ثنا اور تو کہ جیسے برف کی کشتی
کرے سورج کی جانب طے سفر آہستہ آہستہ

صبیح رحمانی کی فصل نوا اول سے آخر تک تر و تازہ رہتی ہے۔ شاداب ساعتیں اور مخمور لمحے ان کے مقدر میں لکھ دیئے گئے ہیں۔ ثنا کی کھیتی ہر وقت ہری بھری رہتی ہے، بہارِ نعت سے باغ سخن مرکز نگاہ بنا ہوا ہے۔

فرشتوں نے مری لوح عمل پہ روشنی رکھ دی
ثنا خوانِ محمد لکھ دیا اوّل سے آخر تک
روشنی گنبدِ خضرا کی ملی جنت میں
شہر طیبہ ترے انوار کہاں تک پہنچے

ان کی نسبت سے دعاؤں کا شجر سبز ہوا
ورنہ ٹلتا ہی نہ تھا بے ثمری کا موسم

انسانیت کا اوج ہے معراجِ مصطفیٰ
یہ روشنی کی سمت سفر روشنی کا ہے

عصر آلود فضا اور فضاؤں میں درود
خوشبوئے اسمِ محمد کی حدیں لامحدود

اپنے عصر سے روشنی کشید کرنا ہر تخلیق کار کا حق ہوتا ہے، بلکہ سچا شاعر ہی وہ ہے جو اپنے عہد کی نمائندگی کا فریضہ بھی سرانجام دے جو اپنے عہد کی سچائیوں کو تجسیم کرکے تخلیقی سطح پر اس کا اظہار بھی کرے۔ صبیح رحمانی نے بھی اپنے ہم عصروں سے اکتسابِ شعور کیا ہے۔ بعض اوقات ان کی فضائے نعت میں یہ آوازیں براہِ راست بھی در آئی ہیں، مجھے امید ہے کہ صبیح رحمانی تخلیق کی شاہراہ پر جوں جوں آگے بڑھیں گے توں توں ان کے فن پر نکھار اور ان کے لہجے میں مزید وقار آتا جائے گا، وہ نکھار اور وقار جو اس وقت بھی ان کی نعتیہ شاعری میں بدرجہ اتم موجود ہے، یہ عہد جس میں اتنی گھٹن ہے کہ لوگ دعا مانگنے پر مجبور ہیں۔ صبیح رحمانی کی نعت ہوائے تازہ کا ایک خنک جھونکا ہے۔ ان کی نعت وادیٔ جاں میں تازہ کاری کی ایک خوبصورت مثال ہے۔ صبیح رحمانی نے الفاظ کو معانی کے نئے پیراہن عطا کرنے کی شعوری اور لاشعوری دونوں سطحوں پر سعی کی ہے، میری دعا ہے کہ ان کا نخلِ تمنا ہمیشہ ہرا بھرا رہے اور یہ اپنے آنسوؤں سے کشتِ ثنا کی آبیاری کرتے رہیں۔ خدا کرے کہ مدحتِ پیمبر ﷺ میں ان کے قلم کی پیاس کبھی نہ بجھے اور اعترافِ تشنگی کرتے کرتے ان کا قلم آبِ کوثر میں ڈوب جائے۔

# نعتیہ اکائی: ایک نئی صنفِ سخن

سہ ماہی مدحت لاہور۔ مدیر: سرور حسین نقشبندی

ہمارے ہاں ایک مصرعی نظموں کی روایت پہلے سے موجود ہے۔ میں نے اس میں معمولی سی ہیتی تبدیلی کی ہے اور اس نئی صنفِ سخن کو ''اکائی'' کا نام دیا ہے۔ ''اکائی'' میں شامل تمام یک مصرعی نظمیں ایک ہی بحر میں ہوں گی۔ ان کی تعداد پر پابندی نہیں ہوگی۔ اسے شاعر کی صوابدید پر چھوڑ دیا جائے گا۔ اکائی میں شامل ہر ایک مصرعی نظم کا آغاز ایک یا ایک سے زیادہ الفاظ سے ہوگا۔ اس لفظ یا الفاظ کا انداز عموماً خطابیہ ہوگا۔ بہت سی یک مصرعی نظموں کو جب ایک مربوط نظم کی شکل دی جائے گی تو یقیناً اس کا ایک مجموعی تاثر بھی مرتب ہوگا۔ اکائی کا مرکزی خیال حمد و نعت کے مضامین سے ابلاغ پائے گا۔ اکائی کی ایک خوبی یہ ہے کہ اسے ترنم سے بھی پڑھا جاسکتا ہے۔ ''اکائی'' کی تازگی لینا ''ہوائے خوشگوار کا جھونکا ثابت ہوگی۔''

نعت کیا ہے؟ انقلاب نو کی بنیادوں کا ذکر

نعت کیا ہے؟ آبِ مدحت کے کٹوروں کی تلاش

نعت کیا ہے؟ آیتوں کی اک صدائے بازگشت

نعت کیا ہے؟ آپؐ کے در پر قلم کی حاضری

نعت کیا ہے؟ اک تہی دامن کا سامانِ سفر

نعت کیا ہے؟ میرے اندر کے مسلماں کا حرم

نعت کیا ہے؟ ایک اللہ کی عبادت کا شعور

نعت کیا ہے؟ امتحانِ عشق کا پہلا سوال
نعت کیا ہے؟ گنبدِ خضرا کے دامن کی ہوا
نعت کیا ہے؟ تختیٔ دل پر سخن کی روشنی
نعت کیا ہے؟ سرمدی تہذیب کا حسن و جمال
نعت کیا ہے؟ وجد میں آتے ہوئے جذبوں کی چھب
نعت کیا ہے؟ آپؐ کے روضے پہ رحمت کا نزول
نعت کیا ہے؟ طاقِ ایماں میں چراغِ آگہی
نعت کیا ہے؟ وادیٔ تخلیق کی شاداب رت
نعت کیا ہے؟ قادرِ مطلق کی منشائے عظیم
نعت کیا ہے؟ آخرِ شب چشمِ تر کا انکسار
نعت کیا ہے؟ ساقیٔ کوثر کے اذکارِ حسیں
نعت کیا ہے؟ آبِ زم زم سے لکھی انؐ کی ثنا
نعت کیا ہے؟ آپؐ کے اوصاف کی روشن سحر
نعت کیا ہے؟ شہرِ سرکارِ دو عالمؐ کا خیال
نعت کیا ہے؟ آنسوؤں اور التجاؤں کا ہجوم
نعت کیا ہے؟ جشنِ میلاد النبیؐ کا رتجگا
نعت کیا ہے؟ آفتابِ عشق کی پہلی کرن
نعت کیا ہے؟ ہر صدی میں آپؐ ہی کا اقتدار

نعت کیا ہے؟ دست بستہ چشمِ تر کی داستاں
نعت کیا ہے؟ امتِ عاصی کے زخموں کی تپش
نعت کیا ہے؟ تا ابد ان کی گلی کا احترام
نعت کیا ہے؟ دلکشی ہی دلکشی انوار کی
نعت کیا ہے؟ جملۂ جاں میں ادب کی کہکشاں
نعت کیا ہے؟ ہادیٔ اعظم کی توصیف و ثنا
نعت کیا ہے؟ خلدِ طیبہ کی ہوا سے دوستی
نعت کیا ہے؟ شہرِ دل میں گرمیٔ صلِ علیٰ
نعت کیا ہے؟ آپؐ کے در پر غلاموں کا سلام
نعت کیا ہے؟ تختِ دل پر تاجِ ارباب سخن
نعت کیا ہے؟ سیرتِ خیرالبشرؐ خیرالوریٰ
نعت کیا ہے؟ عشقِ سلطانِ مدینہ کا نصاب
نعت کیا ہے؟ پھول ہونٹوں پر درودِ پاک کے
نعت کیا ہے؟ ہادیٔ عالم کی سانسوں کا گداز
نعت کیا ہے؟ دینِ حق کی سربلندی کا شعور
نعت کیا ہے؟ شعر میں آقا کی عظمت کا بیاں
نعت کیا ہے؟ باوضو لفظوں کے تعظیمی سجود
نعت کیا ہے؟ عافیت کا سائباں ہر دور میں

نعت کیا ہے؟ آپؐ کے اوصاف کا عکسِ جمیل
نعت کیا ہے؟ جاں نثاری کی کتابِ لب کشا
نعت کیا ہے؟ حبِ سرکارِ مدینہ کا وجود
نعت کیا ہے؟ حرفِ تازہ کی صدائے یا نبیؐ
نعت کیا ہے؟ گلفشانی کی مقدّس ساعتیں
نعت کیا ہے؟ آرزوئے سرورِ کون و مکاںؐ
نعت کیا ہے؟ جھومتے رہنا درِ سرکارؐ پر
نعت کیا ہے؟ جالیوں کے روبرو حرفِ نیاز
نعت کیا ہے؟ اتحادِ ملتِ بیضا کا نام
نعت کیا ہے؟ میرا سرمایہ مرا زادِ سفر
نعت کیا ہے؟ میری نسلوں کا ابد تک افتخار
نعت کیا ہے؟ ہم غلاموں کی غلامی کا ظہور
نعت کیا ہے؟ فضل ربی کی مسلسل بارشیں
نعت کیا ہے؟ آپؐ کے لطف و عطا کا سلسلہ
نعت کیا ہے؟ خلدِ طیبہ کی ہوا کا انتظار
نعت کیا ہے؟ امتِ ناداں کی رودادِ الم
نعت کیا ہے؟ ہر سخنور کے سخن کی آبرو
نعت کیا ہے؟ آخرت میں میری بخشش کا سبب

# نعت خوانی اور ہوسِ زر

جناب ابرار حنیف کے مجلّہ ''کاروانِ نعت'' کے

نعت خوانی نمبر میں ۲۰۰۷ء میں شائع ہوا

یہ روحانی رتجگوں کا موسمِ دلکشا ہے۔ قریہ قریہ عشق رسولﷺ کی محفلیں سجائی جارہی ہیں، خوشبوئے اسم محمدﷺ فضاؤں میں پرفشاں ہے، لبوں پر صلِ علیٰ کے پھولوں کی بہار دیدنی ہے۔ ہوائے مدینہ سے ہمکلامی کا شرف ہم غلاموں کا مقدر بن رہا ہے۔ ارض و سما کی وسعتوں میں سیدہ آمنہؓ کے لال کی عظمتوں اور رفعتوں کا نقارہ بج رہا ہے۔ ہم کتنے خوش بخت ہیں کہ ہمیں محافلِ نعت کی سرمدی فضاؤں اور درود پڑھتی ساعتوں میں اپنی راتیں گزارنے کی سعادت حاصل ہورہی ہے۔

دن تو گذرا ہے تصور میں درِ سرکار ﷺ پر
رات کٹ جائے گی ذکرِ مصطفیٰ ﷺ کرتے ہوئے

محافل نعت کا انعقاد فروغِ عشق رسولﷺ کی ایک مقبولِ عام صورت ہے جسے ہر سطح پر حرفِ پذیرائی حاصل ہونا چاہیے لیکن اعتدال، توازن اور احتیاط کا دامن کسی صورت میں بھی ہاتھ سے نہیں چھوٹنا چاہیے۔ بدقسمتی سے ہماری دانستہ چشم پوشی کی وجہ سے بعض قباحتوں نے بھی سر اٹھایا ہے جن کا سر اگر اس وقت سختی سے نہ کچلا گیا تو آگے چل کر یہ قباحتیں ان گنت مسائل کا باعث بنیں گی اور نت نئے فتنوں کو جنم دیں گی۔ اللہ کرے ایسا نہ ہو اور ان شاء اللہ ایسا نہیں ہوگا کیونکہ خود احتسابی کا شعور بھی فروغ پارہا ہے۔ بہر حال ہمیں ابھی سے حفاظتی اقدامات پر غور کرنا چاہیے اور ہر ممکن حد تک ان قباحتوں میں اپنے جذبہ عشق کو ملوث نہیں ہونے دینا چاہیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ صرف نعت خواں حضرات ہی

کو قصور وار ٹھہرانا درست نہیں، منتظمین اور حاضرین کا بھی ناپسندیدہ امور میں برابر کا ہاتھ ہے۔ اس لیے ہم سب کو اصلاحی نقطہ نظر سے اپنا محاسبہ کرنا ہوگا۔

نعت خوانی کی آڑ میں ہوسِ زر کی تکمیل ایک گھناؤنا جرم ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ نعت خوانوں پر نوٹوں کی بارش کی قبیح رسم کا اب بڑی حد تک قلمع قمع ہو چکا ہے۔ نعت خوانوں، منتظمین اور حاضرین کی سمجھ میں یہ بات آ چکی ہے کہ ہم عشقِ رسول ﷺ کے نام پر کن فرسودہ اور فحش حرکات کی نقالی کر رہے تھے۔ اللہ اور اس کے رسولِ معظم ﷺ ہمیں معاف فرمائیں۔

نعت خوانوں کی خدمت ضرور کیجئے لیکن اس کے لیے کوئی باوقار طریقہ اپنایئے۔ پہلے سے طے شدہ ''معاوضے'' جیسی رسمِ بد کا خاتمہ بھی خود نعت خواں حضرات ہی کر سکتے ہیں۔ نعت خوانی کو ہوسِ زر کی بھینٹ چڑھانا کیا آقا علیہ السلام کے نزدیک پسندیدہ عمل ہوسکتا ہے۔ خود نعت خواں حضرات کو اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھنا چاہیے۔ بدنصیبی سے ہم نے اپنے ذاتی مفادات کے لیے اللہ اور اس کے رسول کے اسمائے مقدسہ کو بھی نیلام گھر کی زینت بنالیا ہے۔ اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لیے ہم ہر وہ کام کر گزرنے پر تیار ہیں جس کی شریعت محمدی ﷺ میں ممانعت کی گئی ہے۔ افسوس نہیں دکھ کی بات ہے کہ ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ نعت خوان اپنا ریٹ فکس(fix) کر کے چلتے ہیں جو کہ لاکھوں میں ہوتا ہے. آپ ان کی بودوباش ملاحظہ کریں تو مناظر ہوش ربا ہیں۔ یہ نعت خوانی نہ ہوئی کاروبار ہوا۔ یہ نعت اور نعت خوانی کی توہین ہے۔ مہتمم حضرات پر فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اس رجحان کی سختی سے حوصلہ شکنی کریں اور ایسے نعت خوان حضرات کو محافل میں بلائیں جنہیں نعت کے تقدس کا احساس ہو نہ کہ وہ ہوس زر کے پجاری ہوں۔

محافلِ نعت میں ادب اور تعظیم نعت کا حق ہے۔ محافلِ نعت میں تو نعت خوانوں، منتظمین اور حاضرین کو تصویرِ ادب بن کر بیٹھنا چاہیے لیکن بدقسمتی سے ان پاکیزہ محافل میں

بھی ہمارانمائش کا جذبہ عروج پر دکھائی دیتا ہے۔ ہماری حرکات وسکنات آدابِ رسولﷺ کے منافی ہوتی ہیں۔کیا حضرت حسان بن ثابتؓ اس طرح حضورﷺ کی بارگاہ میں نعت پڑھا کرتے تھے؟ اگر یہ احساس زندہ ہوجائے کہ ہم آقا حضورﷺ کی محفل میں کھڑے ہیں اور حضورﷺ خود ہماری نعت سن رہے ہیں تو پھر نہ تو یہ عجیب وغریب حرکات وسکنات ہوں گی اور نہ ''گلے اور سُر'' کے مظاہرے کی کوئی جرأت کرسکے گا۔

میرے حضور ﷺ مری نعت سن رہے ہیں ریاضؔ
چمک رہا ہے ستارا میرے مقدر کا

اپنے مقدر کے ستارے کو چمکائیے، باوضو ہوکر اور حضوری کی تمام تر کیفیتوں میں ڈوب کر بیٹھئے اس یقین کے ساتھ کہ مکینِ گنبدِ خضراﷺ دیکھ رہے ہیں کہ ان کے پروانے، ان کی گلیوں کے دیوانے ان کی یاد میں کس طرح تڑپ رہے ہیں۔ یہاں ذرا سی بھی شوخی سوء ادب شمار ہوگی۔ یہ احساس زندہ رہنا چاہیے کہ ہم حضورﷺ کی محفل میں بیٹھے ہیں۔ ہم جو امور شعوری اور لاشعوری طور پر سرانجام دے رہے ہیں کیا ان محافل کا تقدس ان امور کی اجازت دیتا ہے۔ اگر ہمارے حیطۂ شعور میں یہ بات آگئی تو تمام قباحتیں خود بخود ختم ہوجائیں گی۔

سیرِ گلشن کون دیکھے دشتِ طیبہ چھوڑ کر
سوئے جنت کون جائے در تمہارا چھوڑ کر
مر کے جیتے ہیں جو ان کے در پہ جاتے ہیں حسنؔ
جی کے مرتے ہیں جو آتے ہیں مدینہ چھوڑ کر

(مولانا حسن رضا خاں بریلویؒ)

لوح بھی تو قلم بھی تو، تیرا وجود الکتاب
گنبد آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب
شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب میرا سجود بھی حجاب

(حضرت علامہ محمد اقبالؒ)

یہاں یہ بات بھی ملحوظِ خاطر رکھنے کی ضرورت ہے کہ دکھاوا اور ریاکاری باطل ہے اور اس سے باقی کار ہائے خیر کا بھی ابطال ہوتا ہے۔ ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر دکھاوا کرنا اور نمائش کو فوقیت دینا ریاکاری کے زمرے میں آتا ہے جس سے ہر گونہ اجتناب ناگزیر ہے۔ اس سے تو محفل کا تقدس پائمال ہوتا ہے۔ خدا کرے ہم لوگ اس روش کو یک سر ترک کر کے خالصتاً رضائے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے محافل نعت کا اہتمام کریں اور بارگاہِ رسالت میں قبولیت پائیں۔ آمین۔

# اقبالؒ کی از سرِ نو دریافت

(فروری ۲۰۱۲، روزنامہ نوائے وقت)

اقبالؒ کا عظیم الشان فکری نظام کھوئے ہوؤں کی جستجو سے عبارت ہے، احیائے اسلام، اتحاد امت اور غلبۂ دین حق کی بحالی اقبال کے انقلابی سفر کے وہ مقاصد جلیلہ ہیں جن کے گرد شاعر مشرق کی سوچ ہمیشہ مصروفِ طواف رہی ہے اور وہ کسی مرحلے اور کسی سطح پر بھی ان مقاصد کو اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتا، اگر محض مرقدِ اقبالؒ کے مجاور بن کر ہم اپنے پیٹ کے ایندھن کی فراہمی کے تسلسل کو یقینی بنانے کی تگ و دو میں نہیں اور ہم ابتلا و آزمائش کے اس دور میں خلوص دل سے فکر اقبال کو اپنے قول و فعل کا مرکز و محور بنا کر اپنی خارجہ پالیسی کو اس طرح متعین کرنا چاہتے ہیں کہ اسلامی تشخص کی تلاش کے سفر میں اٹھائی جانے والی دیواریں بھی مسمار ہوجائیں بلکہ عالم اسلام کی بے پناہ افرادی قوت اور مادی وسائل کو یکجا کر کے عالم کفر کے خلاف ایک ایسے اسلامی بلاک کے قیام کی راہ بھی ہموار ہوجائے جس سے باطل کے ایوانوں میں زلزلہ طاری ہوجائے تو ہمیں ہر قدم پر فکر اقبال سے روشنی کشید کرنا ہوگی، اس وقت عالم اسلام اغیار کی ریشہ دوانیوں کا ہدف بنا ہوا ہے ہم اپنی حماقتوں اور کوتاہیوں سے دشمنانِ اسلام کی سازشوں کی شعوری اور لاشعوری دونوں سطحوں پر تکمیل کررہے ہیں، مسلم امہ پر بے غیرت اور بے حمیت حکمران مسلط ہیں۔ وہ اپنی خاندانی اور شخصی حکومتوں اور آمرانہ جمہوریتوں کو بچانے کے لیے اپنے بچوں کے مستقبل تک کو بھی گروی رکھنے سے دریغ نہیں کرتے۔ کیا یہ سچ نہیں کہ ہمارے سجدے ریاکاری کی علامت بن گئے ہیں، عبادت محض رسم بن گئی اور اس کی حقیقی روح ناپید ہوگئی ہے، اقبال نے اسی صورتحال کی سنگینی کا ماتم کرتے ہوئے کہا تھا:

تیرا امام بے حضور، تیری نماز بے سرور
ایسی نماز سے گذر ایسے امام سے گذر

علم کے فروغ اور جدید ترین ٹیکنالوجی کے حصول کے بغیر مسلم امہ بے توقیری کے جہنم سے نہیں نکل سکتی اور نہ قوموں کی برادری میں کھویا ہوا مقام ہی حاصل کرسکتی ہے۔ جہالت ہمارا ہی نہیں پورے عالم اسلام کا مسئلہ ہے۔ چند ایک ممالک کو چھوڑ کر اکثر اسلامی ممالک میں شرح خواندگی شرمناک حد تک کم ہے۔ جب ہم فروغ علم کے لیے اتنے غیر سنجیدہ ہیں کہ ہمارے قومی بجٹ کا 2% بھی تعلیم پر خرچ نہیں ہوتا تو ہم جدید سائنسی علوم کو کیسے فروغ دے سکیں گے اور جدید تر ٹیکنالوجی کا حصول کیونکر ممکن ہوگا۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ جب ہم اکیسویں صدی کی دہلیز کو عبور کریں تو ہماری دونوں ہتھیلیوں پر علم کے چراغ جل رہے ہوں کیونکہ اگلی صدی کفر اور اسلام کی کھلی جنگ کی صدی ہے۔ اس جنگ میں علم اور ٹیکنالوجی کا ہتھیار ایٹم بم سے بھی زیادہ مؤثر ثابت ہوگا لیکن افسوس نئی نسل کو رقص و سرود کا دلدادہ بنا کر ان کی بے پناہ تخلیقی اور تحقیقی صلاحیتوں کو مفلوج کیا جارہا ہے۔ ذہنِ جدید کو عریانی، فحاشی، بے حمیتی اور بے غیرتی کے انجکشن دے کر اسے شعور کی موت سے ہمکنار کرنے کی سازش کی جارہی ہے، جب شعور اور ادراک کے دیئے بجھ جائیں، سوچنے، سلجھنے اور آگے بڑھنے کا جذبہ ختم ہوجائے تو قوموں کے مقدر میں اندھیرے لکھ دیئے جاتے ہیں۔ اقبال نے اسی ابلیسی تہذیب کے علم داروں کو گندے انڈے کہہ کر انہیں اٹھا کر گلی میں پھینک دینے کی ہدایت کی تھی لیکن انہوں نے ان گندے انڈوں کو اپنے گلے کا ہار بنا کر اپنا مستقبل ان غلیظ ہاتھوں میں دے دکھا ہے جن پر اُس بازار کی ساری کثافت رقص کناں ہے، وقت ہماری بے بصیرتی کا ماتم کررہا ہے۔ ہم روحِ اقبال سے شرمسار ہیں کہ ہم ستاروں پر کمندیں ڈالنے اور کائنات کی تسخیر کا عزم کرنے کی بجائے شراب و شباب کے سمندر میں غرق ہونے کو ترجیح دے رہے ہیں اور ہماری نئی نسل اپنے شاندار ماضی سے کٹ کر یورپ کے بے روح اور بے سکون معاشرے سے اپنا مستقبل وابستہ کررہی ہے

حالانکہ یہ کھوکھلی تہذیب شاخ نازک پر آشیانہ بنا کر اپنے خنجر سے کب کی خودکشی کر چکی ہے، آج مسلم امہ ایک دوراہے پر کھڑی ہے، تذبذب کے عالم میں، حیرتوں کے سمندر میں گم:

آگ ہے، اولادِ ابراہیمؑ ہے نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

لیکن مسلم امہ کی ذہنی اور فکری پس ماندگی کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ ایسی دنیائے رنگ و بو میں کسی امتحان کے لیے بھی تیار نہیں، اقبالؒ نے اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا خواب دیکھا تھا، حرم کی پاسبانی کے لیے مسلمانوں کے یکجا ہونے کی تمنا کی تھی اور اسلامیان عالم کو یہ نکتہ سمجھایا تھا کہ دہر میں اسمِ محمدؐ سے اجالا کرنے کے لیے راہِ عشق میں دیوانہ وار نکل آؤ، اپنے بدن میں روحِ محمدؐ کو کبھی مرنے نہ دینا، اسے اپنے لہو کی حرارت میں زندہ رکھنا، یہی اسم گرامی اور یہی ذکر جمیل تمہیں عظمت کی بلندیاں عطا کرے گا۔ اگر عشقِ مصطفیٰ کی آگ بجھ گئی تو تم راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہو جاؤ گے اور راکھ کے ڈھیر میں دم توڑتی چنگاریاں زیادہ دیر زندہ نہیں رہ سکتیں اور رفتہ رفتہ یہ چنگاریاں بھی راکھ کا پیرہن اوڑھ لیتی ہیں لیکن ہم نے کیا کیا؟ حضور ختمی مرتبت کی ذاتِ گرامی کو بھی مباحث کا موضوع بنالیا اور ابلیس کی اس ہدایت پر پوری نیاز مندی سے عمل کرنے لگے۔

یہ فاقہ کش جو موت سے ڈرتا نہیں ذرا
روحِ محمدؐ اس کے بدن سے نکال دو

برطانوی استعمار اگر اپنے مذموم مقاصد کے لیے مناظروں کی فضا برقرار رکھ کر اسلامیان ہند کے ذوقِ ایمان پر شب خون مارا کرتا تھا تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے لیکن آزادی حاصل کرنے کے تقریباً پچاس سال بعد بھی ہم ان فلسفیانہ موشگافیوں اور فکری مغالطوں کی دلدل سے کیوں باہر نہیں نکل آتے، فرقہ واریت کا زہر ہماری رگ رگ میں سرایت کر چکا ہے، ہم نے حضورؐ کی نا آسودہ امت کو ان گنت خانوں میں تقسیم کر رکھا ہے،

مسالک کے تحفظ کے لیے تو ہم اپنی گردنیں کٹانے کے لیے تیار ہوجاتے ہیں لیکن دین کی سربلندی کے لیے سربکف چلنے کی خوئے دلنواز کو اپنانے سے کتراتے ہیں، سوویٹ روس کے بکھرنے کے بعد مغربی پروپیگنڈے کا رخ اسلام اور اسلامیانِ عالم کی طرف کردیا گیا ہے، بنیاد پرستی کی آڑ میں ہر جگہ اسلامی تحریکوں کا راستہ روکا جارہا ہے، اسلام کو مسجدوں، مدرسوں اور خانقاہوں تک محدود کرکے بطورِ نظام حیات اسلام کے نفاذ اور اس کے انقلابی کردار کے احیاء کے ہر امکان کو ختم کیا جارہا ہے، ''کارکنانِ قضا و قدر'' اب اسلام کا نام بھی معذرت خواہانہ انداز میں لیتے ہیں۔ اقبال نے اسی قسم کے مسلمانوں کے بارے میں کہا تھا کہ انہیں دیکھ کر تو یہودی شرما جائیں، معلوم نہیں ہمارا شعور کب جاگے گا۔ ہماری دینی غیرت کب بیدار ہوگی، پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ چکا ہے، آج اقبالؒ کی روح مضطرب ہے، بے چین ہے اور ہر لمحہ ہماری انفرادی اور اجتماعی حرکتوں پر کڑھتی رہتی ہے کہ جس عمل سے زندگی بنتی ہے وہ عمل بے عملی کی برف تلے کب کا دفن ہوچکا ہے، روحِ محمدؐ کو پھر زندہ و بیدار کرنے کی ضرورت ہے، خوشبوئے اسم محمد کے پرچم لے کر نکلو کہ منظر نامہ بانجھ ساعتوں اور بنجر لمحوں سے پہلے ہی بھر چکا ہے۔ سوز و گداز کی مشعلیں بجھ چکی ہیں۔ اقبال کی روح پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ

قوت عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمدؐ سے اجالا کردے

یہی وہ نعتِ رسول ﷺ ہے جو اقبال کے نظام فکر کی روح ہے۔ ''پست کو بالا کرنا'' اور ''دہر میں اسمِ محمد ﷺ سے اجالا کرنا'' قوت عشق کے بغیر ممکن نہیں۔ نعت قوتِ عشق سے ہے اور قوتِ عشق سے نعت ہے۔ ادب رسول ﷺ اس کا پہلا زینہ ہے، اطاعتِ رسول اس کا دوسرا زینہ ہے، تعظیمِ رسول اس کا تیسرا زینہ ہے اور نصرتِ رسول اس کا چوتھا زینہ ہے اور توصیف و ثنائے خواجہ اور درود و سلام اس عملِ مسلسل کی ایمانی بنیاد ہے۔ نعت اسی کیفیت عشق کا جمالیاتی اظہار ہے جو خود رو پھولوں کی طرح شاخِ سخن پر کھلتا چلا جاتا ہے

جیسے اقبال پر کلام کی آبشار اترتی تھی۔اقبال کی از سرِ نو دریافت اس کے نظام فکر کے احیا اور اس کی نعت رسول ﷺ کی ترویج سے ممکن ہے جس کا تعلق وجدانی اور لدنّی کیفیات سے ہے۔

مگر ہمارے نظام فکر کی ہچکیاں تو زمینی حقائق سے ظاہر ہو رہی ہیں۔ روز و شب پر جمود طاری ہے، ایک خوفناک سکوت جو موت کی علامت ہے، ہمارے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں، طوفانوں سے آشنائی تو بہت بعد کی بات ہے، امید کی ایک کرن ابھر کر نجانے کس خرابے میں کھوگئی۔ کمیونزم کی موت کے بعد تب وسط ایشیا کی مسلم ریاستیں آزاد ہوئیں، ستر سالہ سیاہ رات کی کوکھ سے امام بخاری کی سرزمین طلوع ہوئی تو وہ پر امید نظروں سے پاکستان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اسلامی بلاک کے قیام کے آثار روز روشن کی طرح واضح ہو چکے تھے، وسط ایشیا کی مسلمان ریاستیں، ایران، افغانستان، ترکی اور پاکستان مل کر ایک عظیم اقتصادی، سیاسی اور عسکری قوت بن کر ابھر سکتے تھے، یہ ممالک آگے بھی بڑھے لیکن اڑنے سے پہلے ہی ان کے پر کاٹ دیئے گئے۔ کہاں یہ محسوس ہو رہا تھا کہ مصطفوی انقلاب کا سورج طلوع ہوا کہ ہوا، اور کہاں یہ عالم کہ وسط ایشیا دوبارہ روس کی طرف دیکھنے لگا، افغانستان میں خانہ جنگی کرا کر سامراج نے دو مقاصد حاصل کئے۔ ایک یہ کہ مجوزہ اسلامی بلاک کے قیام کے بارے میں پہلی سی گرمجوشی باقی نہ رہی اور تجارتی مراسم غیر محفوظ راستوں کی وجہ سے ٹھوس بنیادوں پر استوار نہ ہوسکے، دوسرے یہ کہ افغانستان کو خانہ جنگی میں الجھا کر یہاں اسلامی حکومت کے قیام کے امکانات کو ختم کردیا گیا، بوسنیا، چیچنیا اور کشمیر کے مسلمانوں کا خون اپنا خوں بہا طلب کرتا رہا لیکن مسلم امہ کے حکمران مصلحتوں کی زنجیر پہن کر آنکھیں بند رکھ کر امریکہ سے نیک چلنی کی سند حاصل کررہے تھے۔ مولانا جمال الدین افغانی سے اقبالؒ تک مشاہیر امت نے اتحاد امت کا جو خواب دیکھا تھا وہ شرمندۂ تعبیر ہوئے بغیر ہماری کوتاہیوں سے بکھر گیا، اقبال نے تنبیہ کردی تھی کہ

فطرت افراد سے اغماض بھی کرلیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

ہم اپنے اجتماعی گناہوں کے جہنم میں جلتے رہے، ملت کے گناہوں کی دلدل اتنی گہری ہوچکی ہے کہ جانکنی کے عالم میں بھی ہم صدائے احتجاج بلند کرنے سے قاصر ہیں اور مخالف ہواؤں کے رخ پر سفر جاری رکھ کر اپنی منزل سے بتدریج دور ہورہے ہیں۔

اقبالؒ نے 1930ء میں الہ آباد میں اپنے خطبے میں دوقومی نظریہ پیش کیا تھا۔ بانی پاکستان نے کہا تھا کہ دوقومی نظریہ اس وقت وجود میں آ گیا تھا جب ہندوستان میں پہلے غیر مسلم نے اسلام قبول کیا تھا، دوقومی نظریہ حق و باطل کی آویزش کا نام ہے۔ دوقومی نظریے کی وضاحت مطلوب ہو تو طائف کے اوباش لڑکوں کے ہاتھوں سے ہونے والی بارشِ سنگ میں پیغمبر اعظمؐ کی استقامت کو دیکھو اور ان کے مقدس ٹخنوں سے بہنے والے خون سے بننے والی تحریروں کو پڑھنے کی کوشش کرو، دوقوی نظریے کی مزید وضاحت مطلوب ہوتو شعب ابی طالب کی گھاٹی میں کھلے آسمان تلے رسولِ آخر کے گھرانے پر ٹوٹنے والے آلام و مصائب کی زبان سمجھنے کی سعی کرو، اپنے عہد کی دانش کی آواز سنو کہ تبلیغ دین اور اقامت دین کا ہر راستہ طائف کی وادیوں سے ہوکر گزرتا ہے، دوقومی نظریے کے خلاف اگر تمام کڑیوں کو مربوط کیا جائے تو ایک خوفناک سازش کا انکشاف ہوتا ہے، وہ یہ کہ دو قومی نظریے کے حوالے سے قوم کو ایک فکری انتشار میں مبتلا کردیا جائے، پاکستان کے ذرے ذرے سے محبت کرنے والے اہل وفا کے ایمان کو متزلزل کردیا جائے، جب بنیادوں ہی میں پانی بھر جائے گا تو ان بنیادوں پر تعمیر ہونے والی عمارت، خاکم بدہن، کسی وقت بھی زمین بوس ہوجائے گی۔ اگر ایسا نہ بھی ہوتو پاکستان کوایک سیکولر سٹیٹ بنانے کی راہ ہموار ہوجائے گی، پاکستان کے اسلامی تشخص پر یہ پہلا وار نہیں۔ حشرات الارض کی طرح رینگنے والے کیڑوں نے خود ساختہ دانشوروں کے روپ میں ایک عرصے سے یہ پروپیگنڈا شروع کررکھا ہے کہ پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ کا نعرہ تو بچوں کا نعرہ تھا

اور یہ کہ تحریک پاکستان ہندو کی اقتصادی غلامی سے نجات حاصل کرنے کے لیے برپا کی گئی تھی۔ بعض بدبخت حلقے یہ بھی کہتے رہے ہیں اور ان کی فکری نسلیں آج بھی اس خطہ دیدہ و دل پر آباد ہیں کہ پاکستان تو انگریز کے ذہن کی اختراع ہے۔ یہ لوگ آج بھی ہندو کی آغوش میں بیٹھ کر حکومت الہیہ کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ ان کا نعرہ ہے کہ قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔ علامہ اقبال نے اس باطل نظریے کی گرفت کرتے ہوئے کہا تھا کہ

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسول ہاشمی

ہندو اگر کسی چیز سے خائف ہے تو وہ یہی دوقومی نظریہ ہے، وہ جانتا ہے کہ اگر دوقومی نظریہ زندہ رہا تو بھارت میں کئی پاکستان معرضِ وجود میں آسکتے ہیں، سقوطِ مشرقی پاکستان پر اندرا گاندھی نے دوقومی نظریے کے بارے میں جو زہر اگلا تھا وہ پوری ہندوقوم کے ذہن کی عکاسی تھی، حالانکہ دوقومی نظریہ ایک آفاقی سچائی ہے، مسلمان اور ہندو دو الگ تہذیبوں کے نمائندہ ہیں، لال بجھکڑ قسم کے دانشور لاکھ راگ الاپتے پھریں کہ ہندو اور مسلمان میں کوئی فرق نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہندو ہندو ہے اور مسلمان مسلمان۔ کیا یہ لوگ بھول گئے کہ قیام پاکستان سے قبل ریلوے اسٹیشنوں پر ہندو پانی اور مسلمان پانی کی صدائیں گونجا کرتی تھیں، کسی مسلمان کا ہندو سے چھو جانا اسے بھرشٹ کر دیتا تھا۔ کیا ہندو اور مسلمان آپس میں شادیاں کرتے ہیں؟ اگر نہیں تو ہندو اور مسلمان ایک قوم کیسے ہو سکتے ہیں، کیا مسلمانوں اور ہندوؤں کے ہیروز ایک ہیں؟ کیا ہندو محمد بن قاسم اور سلطان محمود غزنوی کے لیے اپنے دل میں جگہ پیدا کر سکتے ہیں؟ بوسنیا، چیچنیا اور کشمیر میں دوقومی نظریہ بھی روز روشن کی طرح جگمگا رہا ہے۔ اگر کسی کے پاس پڑھنے والی آنکھ ہی نہیں تو اس میں ابدی سچائیوں اور تاریخی صداقتوں کا کیا قصور؟ پاکستان جیسے نظریاتی ملک میں دوقومی نظریے سے انحراف کی سزا موت ہونی چاہیے، پاکستان کوئی لاوارث چراہ گاہ نہیں کہ اپنے کھونٹے سے دستی تڑوا کر آنے والے ہر باولے کتے کو اس مقدس سرزمین کی بے حرمتی کی

اجازت دے دی جائے۔ پاکستان کسی کی ذاتی جاگیر نہیں کہ اس کے اقتدارِ اعلیٰ کو کسی کی انا پر قربان کردیا جائے۔ روحِ اقبال ہم سے مخاطب ہے، ہمیں خبردار کررہی ہے کہ آج پورا یورپ امریکہ اور یہود و ہنود چراغ مصطفوی کو بجھانے کے لیے سازشوں کا جال بچھا رہے ہیں، اقوام متحدہ امریکہ کی داشتہ کا کردار ادا کررہی ہے، ہماری ثقافتی اکائی کا تحفظ تبھی ممکن ہے جب ہم یاسر عرفات کا کردار اپنانے سے صاف انکار کرکے اپنی ملّی انا کو بکھرنے سے بچا لیں لیکن ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے معجزوں کے منتظر ہیں۔ آج اگر بھارت دوسرا ایٹمی دھماکہ بھی کرلے تو مغربی دنیا بھارت سے چشم پوشی کا وہی وطیرہ اپنائے گی جس کا عملی مظاہرہ اس نے پرتھوی کے تجربے پر کیا ہے۔ ہمیں جرأت مندانہ قدم اٹھا کر ایٹمی دھماکہ کردینا چاہیے۔ آزادی انہی قوموں کا مقدر بنتی ہے جو تلوار اٹھانا جانتی ہیں، آزادی طشتری میں رکھ کر کمزور قوموں کو تحفتاً پیش نہیں کی جاتی، اس ارض دعا کی تشنہ زمینیں، شاداب موسموں اور خنک پانیوں کے لیے ایٹمی توانائی کا مطالبہ کرتی ہیں ایک مضبوط پاکستان ہماری نہیں پورے عالم اسلام کی ضرورت ہے، جرمِ ضعیفی کی سزا بہت کڑی ہوتی ہے، لمحوں کی خطا کا خمیازہ کئی کئی نسلوں کو بھگتنا پڑتا ہے، اقبال نے کہا تھا۔

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

تاریخ کا طالب علم جانتا ہے کہ اقتصادی بالادستی ہی سیاسی بالادستی کا پیش خیمہ ہوتی ہے لیکن آج ہم اقتصادی اور سیاسی محکومی کی زنجیر خود پنے ہاتھوں سے پہننے کی حماقت کررہے ہیں۔ نیو ورلڈ آرڈر کے ذریعہ تیسری دنیا کے غریب ممالک جن میں مسلم ممالک کی اکثریت ہے کے گرد سیاسی اور اقتصادی غلامی کے حصار کو تنگ کیا جارہا ہے تاکہ غریب اقوام کشکولِ گدائی لیے سامراجی طاقتوں کی دہلیز پر سجدہ ریز رہیں اور کبھی سر اٹھا کر چلنے کا تصور بھی نہ کرسکیں۔ اقبال کا سارا فکری نظام اس آمرانہ سوچ کے خلاف ہے۔ یہ نظام ہمیں انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر خودی کی بیداری کا درس دیتا ہے، اگر ہم اسلامیانِ عالم

کے سر پر وقار اور تمکنت کا تاج دیکھنے کے آرزومند ہیں تو عظمتِ رفتہ کی بازیابی کے لیے پہلے مرحلے پر ہمیں اقبال کو از سر نو دریافت کرنا ہوگا، اگر ہم مصطفوی انقلاب کے سورج کو طلوع ہوتے دیکھنا چاہتے ہیں تو مصطفوی انقلاب سے پہلے فکری اور ذہنی انقلاب کے لیے فکری اقبال کا احیاء ضروری ہے۔

اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

# جدید اردو نعت کی صورت پذیری کا موسم

(نعت رنگ، شمارہ ۱۷)

بیسویں صدی کا اختتام اور اکیسویں صدی کا آغاز کائناتِ نعت میں اظہار و ابلاغ کے نئے آفاق کی تسخیر کے عزمِ نو اور ولولۂ تازہ سے ہوا ہے۔ اس تخلیقی، تہذیبی اور وجدانی سفر کے ابتدائی مراحل ہی میں تفہیمِ نعت کے امکانات کی نئی دنیاؤں کی دریافت کے آثار دکھائی دینے لگے ہیں، افقِ دیدہ و دل پر جدید احساسِ نعت کا بھرپور طلوع ان امکانات کو واضح اور روشن کررہا ہے۔ روحانی رتجگوں کا یہ موسمِ دلکشا لوح وقلم کے گرد نور کے ان گنت ہالوں کی صورت پذیری پر مامور نظر آتا ہے، بیسویں صدی کے آخری عشرے میں لکھے جانے والی نعت دراصل اکیسویں صدی کی جدید نثر اردو نعت کے منشور کا ابتدائیہ ہے، نعت میں شعوری اور لاشعوری سطح پر محسوس کی جانے والی انقلابی تبدیلیاں محض ہیئت کی تبدیلیوں تک ہی محدود نہیں بلکہ فکر ونظر کے الجھے ہوئے زاویہ ہائے نگاہ کی گرہ کشائی کے امکانات بھی حیطۂ عمل میں آرہے ہیں۔ تخلیق کی شاہراہ پر رتجگوں کا یہ ہجوم نئے دن کی روشنیوں کو بھی اپنے دامن میں سمیٹ رہا ہے۔ بیسویں صدی بلاشبہ نعت کی صدی تھی اور اکیسویں صدی بھی نعت ہی کی صدی ہے بلکہ ہر صدی نعت ہی کی صدی ہے۔ آج تک روئے زمین پر ایک بھی ایسی ساعت نہیں اتری جس کی دونوں ہتھیلیوں پر خوشبوئے اسم محمدؐ کے چراغ روشن نہ ہوں، بیسویں صدی کے نصف آخر کو جدید اردو نعت کا سنہری دور کہا جاسکتا ہے۔ وجود مصطفیٰ کے حقیقی اعتراف کی نئی نئی صورتیں آئینہ خانۂ دل میں روشن ہوئیں۔

سیکھی یہیں مرے دل کافر نے بندگی
رب کریم ہے تو تریٔ رہگذر میں ہے
(فیض)

قیامِ پاکستان کے بعد نعت کی پذیرائی کے جس سرمدی موسم کا آغاز ہوا تھا وہ سرمدی موسم اب ہر شعبہ زندگی پر محیط نظر آتا ہے۔ قدرتی طور پر ایسا ہونا بھی تھا۔ ادب میں اشتراکیت اور جدیدیت کی تحریکیں نعت کے تخلیقی سفر کو روکنے کی سکت ہی نہ رکھتی تھیں اس لیے کہ نعت کے حوالے سے ہمارے ملی تشخص کی تلاش کا جواز از خود مہیا ہو رہا تھا، برطانوی استعمار کا طلسم ٹوٹا تو افق مدینہ سے اٹھنے والے ابرِ کرم نے ہر شے کو اپنے دامنِ رحمت میں سمیٹ لیا۔ جدید اردو نعت نے خنک موسموں کی اس فضا کے دلکش نظاروں میں اپنے تخلیقی سفر کو جاری رکھا۔ یہ تخلیقی سفر جاری ہے اور اس کائنات رنگ و بو کے روزِ آخر تک جاری رہے گا بلکہ روزِ آخر کے بعد بھی، جب تمام مخلوقات موت کی آغوش میں سو چکی ہوں گی اُس وقت بھی ربِ ذوالجلال قائم و دائم ہوگا اور لامکاں کی وسعتیں درود و سلام کے زمزموں سے گونج رہی ہوں گی۔

ہوائیں ماری ماری پھر رہی ہیں
تراؐ نقشِ کفِ پا ڈھونڈنے کو

(احسان دانش)

آج کا مدحت نگار بیک وقت ماضی، حال اور مستقبل میں سفر کر رہا ہے اس کا پورا وجود تصویرِ ادب بن کر مکین گنبدِ خضرا کے درِ عطا پر سرنگوں ہے اوراق جاں پر چاند ستارے رقم ہو رہے ہیں۔ آج کے شاعر کی لغتِ عمل کا ہر لفظ سر پر غلامی کا عمامہ باندھے تاجدارِ کائناتؐ کے حلقہ رحمت میں ہے اور اس شرفِ عظیم کے حصول پر کلماتِ تشکر و امتنان اس کے ہونٹوں پر مچل رہے ہیں۔ افکارِ تازہ کا ہجوم اس کی اقلیمِ فکر میں سمٹ آیا ہے۔ اعتماد کا نور اس کے چہرے پر چمک رہا ہے۔ جرأت مندی کا شعور اس کے لفظوں میں رچ بس گیا ہے۔

پورے قد سے جو کھڑا ہوں تو یہ تیراؐ ہے کرم
مجھ کو جھکنے نہیں دیتا ہے سہارا تیراؐ

(احمد ندیم قاسمی

یہ شعر پورے عہد کا نمائندہ شعر ہے جس میں حوصلوں اور امنگوں کے ہزاروں سورج ایک ساتھ چمک رہے ہیں۔ یہ دراصل حبِ رسول کی روشنی ہے اور ہر روشنی حضورؐ کے در کی کنیز ہے۔

پوری تاریخِ جہاں کی روشنی اتنی نہیں
لمحے لمحے میں اجالا جس قدر اُنؐ کا ہوا

(مظفر وارثی)

تحریک پاکستان ہمارے ملی تشخص کی تلاش کا دوسرا نام ہے۔ اردو نعت ہمارے ملی تشخص کی جزئیات تک کو حیطۂ شعور میں لاتی ہے۔ جدید اردو نعت کی صورت پذیری کے موسم کے ہزار رنگ دامنِ شعر میں بکھرے ہوئے ہیں، منظر نامہ سوچ اور اظہار کی رعنائیوں سے معمور ہے۔ نعت اب صرف حضورؐ کے شمائل، فضائل، خصائل اور خصائص تک محدود نہیں بلکہ سیرت اطہر کی روشنی بھی قصرِ توصیف کی فصیلوں پر چراغ جلا رہی ہے۔ ہر شعبۂ زندگی کے جملہ ثقافتوں کے جمالیاتی اظہار نے بھی جدید اردو نعت کے دامنِ صد رنگ میں پناہ تلاش کی ہے۔ خودسپردگی اور وارفتگی کے نئے ذائقوں سے آشنائی ذاتِ مصطفیٰ سے غیر مشروط وابستگی کا مظہر ہے، کوئے پیمبرؐ کی گدائی کا ادراک ایک زندہ اور فعال تحریک کی صورت اختیار کر گیا ہے۔

بے نیازی آپؐ کی وابستگی نے کی عطا
مَیں غنی کوئے پیمبرؐ کی گدائی سے ہوا

(حفیظ تائب)

حضورؐ سے والہانہ عشق کا بے ساختہ اظہار ہر دور کی نعت کا طرۂ امتیاز ہے، رات کے پچھلے پہر جب قلبِ مضطر یاد مدینہ کے آسودہ لمحوں سے ہمکنار ہوتا ہے اور محبت رسول کا سمندر آنکھوں میں سمٹ آتا ہے تو پلکوں پر آنسوؤں کی کناری سی لگنے لگتی ہے۔

حضورؐ کا دامنِ رحمت اولادِ آدم کے برہنہ سروں پر سایہ فگن ہے۔ بلاتفریق رنگ ونسل اکیسویں صدی کے ساکنانِ کرۂ ارض کو جہانِ نعت میں سانس لینے کا اعزاز حاصل ہے۔ درود وسلام کے پیکر شعری کا نام نعت ہے۔ نعت کائنات ہے اور ہم اس نعت کائنات میں زندہ ہیں۔ چشمِ تصور انگلی پکڑ کر خلد مدینہ میں لے جاتی ہے۔ ہوائے طیبہ سے ہمکلامی کا شرفِ عظیم حاصل ہوتا ہے۔ یہی ہمکلامی نعت کے پیرہن میں سجتی ہے، نعت خوانوں کو حضورؐ کی شفاعت کے دائرہ کرم میں لے جاتی ہے اور ہمارا توشۂ آخرت ٹھہرتی ہے۔

صبا نعتِ رسول پاک اپنے ہاتھ میں رکھو
شفاعت کی سند لے کر چلو دربارِ داور میں

(صبا اکبرآبادی)

روایت کو توڑنا کسی خود ساختہ اجتہادی بصیرت کا نتیجہ نہیں بلکہ اندر کے باغی انسان کی غلط منصوبہ بندی کا شاخسانہ ہے، روایت کا تسلسل برقرار نہ رہے تو تخلیقی سفر کی بہت سی درمیانی کڑیاں ٹوٹ کر جمالیاتی قدروں کے انہدام کا باعث بنتی ہیں۔ اس لیے روایت کے تسلسل کے بغیر سوچ کے مقفل دروازوں پر دستک دینے کا عمل رائیگاں جاتا ہے، لیکن روایت کی گرفت اتنی بھی سخت نہیں ہونی چاہیے کہ جدید حیثیت کے حوالے سے ادب میں تازہ ہواؤں کی آمد ہی رک کر رہ جائے اور لمحہ موجود کے آبگینے ٹوٹ کر خاک میں مل جائیں اور نئی لفظیات کے مرحلہ تخلیق کو جاری ہی نہ رکھا جاسکے۔ جدید اردو نعت کے شاعر کو اپنے عہد کی دانش سے اکتسابِ شعور کا ہنر آتا ہے اور وہ شجر سے پیوستہ رہ کر نئی بہاروں کو خوش آمدید کہنے کا منصب سنبھالتا ہے۔

دنیا میں احترام کے قابل ہیں جتنے لوگ
میں سب کو مانتا ہوں مگر مصطفیؐ کے بعد
(قتیل شفائی)

فروغِ اسمِ محمدؐ ہو بستیوں میں منیرؔ
قدیم یاد نئے مسکنوں سے پیدا ہو
(منیر نیازی)

قلم لرزتا ہے نعتِ رسولؐ لکھتے ہوئے
مگر یہ عجز بھی مظہر کسی کمال کا ہے
(شہزاد احمد)

اس بڑھاپے میں زیارت کی، ظفرؔ
ایک خواہش سی جواں ہوتی ہوئی
(ظفر اقبال)

ہمارے نام کے آگے بھی حرفِ بخشش لکھ
کہ سرفراز ہوں ہم جب تری کتاب کھلے
(محسن نقوی)

اسی جزوِ نورِ کل سے ہے تابندگی تمام
میں کیوں نہ اس کے سائے کو بھی روشنی لکھوں
(محسن بھوپالی)

بغیر دیدۂ بینا بغیر زادِ سفر
مری طرح درِ اقدس پہ کون جائے گا

(اقبال عظیم)

ہماری روح نے تعظیم کی محمد کی
ازل میں مسئلۂ ہست و بود سے پہلے

(درد اسعدی)

حرا سے سبز گنبد تک مسلسل
سفر اندر سفر ہے اور مَیں ہوں

(ڈاکٹر ابوالخیر کشفی)

بیدل وہ ایک نام جو اخبار میں چھپے
اخبار کا وہ اتنا تراشا بھی روشنی

(بیدل حیدری)

مجھے حیرت ہوتی ہے جب بعض معترضین یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ نعت کو جدید و قدیم کے خانوں میں تقسیم نہیں کرنا چاہیے۔ نعت نعت ہی ہوتی ہے۔ جدید یا قدیم نہیں۔ بلاشبہ نعت نعت ہی ہوتی ہے اور نعت کو نعت ہی ہونا چاہیے لیکن کیا عہد حفیظ کی نعت مولانا احمد رضا خاں کی نعت سے مختلف نہیں؟ کیا اکیسویں صدی کی آخری دہائی میں لکھی جانے والی نعت اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں لکھی جانے والی نعت سے سوچ، اظہار اور ڈکشن کے حوالے سے مختلف نہ ہوگی؟ کیا وہ عصری مسائل سے آنکھیں بند کر لے گی؟ اور پھر کیا نعت ایک صنفِ سخن نہیں؟ کیا نعت ارتقائی مراحل سے نہیں گذری یا نہیں گذرے گی؟ کیا نعت کا منظر نامہ لحہ بہ لحہ پھیلتا نہیں جا رہا؟ کیا فرد کے ذاتی مسائل ومصائب سے لے کر

اجتماع کے مسائل و مصائب کا ذکر نعت کے لیے شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتا ہے؟ یقیناً سوچ کی تنگناؤں میں مقید جملہ معترضین ان سوالوں کا جواب دینے سے قاصر ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نبی مکرمؐ کو کل جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے۔ یہ زمانہ جو گذر چکا ہے اور ہر زمانہ جو آنے والا ہے، حضورؐ ہی کا زمانہ ہے حضورؐ کی رحمت محدود نہیں بلکہ لامحدود ہے اور زمان و مکاں کی قید سے ماوریٰ ہے۔ لمحۂ موجود ہی نہیں، آنے والا ہر لمحہ آقائے محتشمؐ کے سائبانِ کرم میں سانس لے گا۔ آج کا نعت نگار اس کائناتی سچائی سے بخوبی آگاہ ہے، اس کا قلم وقت کے ماتھے پر حقیقت پسندی کی سوچ اتار رہا ہے۔

خالدؔ احمد تری نسبت سے ہے خالد احمد
تو نے پاتال کی قسمت میں بھی رفعت لکھی

(خالد احمد)

شان ان کی سوچیے اور سوچ میں کھو جایئے
نعت کا دل میں خیال آئے تو چپ ہو جایئے

(خورشید رضوی)

تختی لکھی تو اسی نام سے آغاز کیا
جس کو معبود نے ہر نام سے اوپر رکھا

(افتخار طرف)

مَیں اُس کا امتی ہوں جس کی خاطر
خدا نے روشنی تخلیق کی ہے

(نجیب احمد)

شبوں کی جاگتی نیندیں ہیں اعتکاف ترا
حرا کے سوچتے لمحے عبادتیں تیری

(انور جمال)

جس روز سے نکلا ہوں میں سانسوں کے سفر پر
منزل ہے مدینہ مرا رستہ ہے مدینہ

(اختر شمار)

میں رات کو سویا تھا لیے اُنؐ کا تصور
بدلا ہوا اک شخص اٹھا صبح سویرے

(شیخ صدیق ظفر)

نعت کیا ہے کسی نے جب پوچھا
حرف میں ہم نے روشنی رکھ دی

(قیصر نجفی)

لحد میں پوچھا نکیرین نے کہ کون ہو تم
حضورؐ! آپؐ کا بس نام حافظے میں رہا

(ریاض حسین چودھری)

کائنات کا ذرہ ذرہ صبحِ میلاد کا منتظر تھا۔ یہ صبحِ دلنواز طلوع ہوئی تو گلشن ہستی کا دامن آرزو رحمت کے پھولوں سے بھر گیا، صحنِ جاں میں بادِ بہاری چلنے لگی۔ تمام الہامی صحیفوں میں میلادِ مصطفیٰ کا ذکرِ معطر موجود ہے۔ تمام انبیاء نبی آخرالزماںؐ کی آمد کی خبر دیتے

رہے یہ موضوعِ دلکش کبھی پرانا نہیں ہوا۔ ماہ و سال کی گرد اس آئینے کو کبھی دھندلا نہیں سکی۔ نئی نعت نے بھی صبحِ میلاد کے سرمدی اجالوں سے اقلیمِ تمنا میں روشنیاں بکھیرنے کا منصب سنبھالا ہے۔

حضورؐ! آپؐ آئے
تو انسان کو ایسا منشور حاصل ہوا
ضوفشانی سے جس کی
کٹی بیڑیاں تیرگی کے فسوں کی
جھکے کج کلاہوں کے سر
اپنے خالق کے آگے (آثم میرزا)

حضورؐ کی آمد کائنات کی سب سے بڑی سچائی ہے۔ مصلحت اور منافقت کی ایک ایک زنجیر ٹوٹ کر انسان کے قدموں کو بوسہ دے رہی تھی۔ افقِ عالم پر امنِ دائمی کی بشارتیں تحریر ہو رہی تھیں۔ فرسودگی قدامت کے ملبے تلے دفن ہو رہی تھی۔ نئے دنوں کا روشن نصاب مرتب ہو رہا تھا۔ ظلمتِ شب نے رختِ سفر باندھا۔ اکناف عالم سیلِ نور میں ڈوب گئے۔ جبرِ مسلسل کی طویل رات رزقِ زمین بن رہی تھی۔

اب بھی ظلمات فروشوں کو گلہ ہے تجھ سے
رات باقی تھی کہ سورج نکل آیا تیراؐ

(احمد ندیم قاسمی)

ترے سب زماں، ترا کل جہاں، ترے مہر و مہ، تری کہکشاں
تو اِدھر سے اٹھ تو اُدھر سے آ، کبھی وہ جھلک کبھی یہ جھلک

(نعیم صدیقی)

جو حسن میرے پیشِ نظر ہے اگر اسے
جلوے بھی دیکھ لیں تو طوافِ نظر کریں

(حافظ مظہرالدین)

تخلیقِ کائنات کا وہ نقشِ اولیں
روحِ ازل کا آخری پیکر کہیں جسے

(حمایت علی شاعر)

کٹ کٹ کے گر رہی ہیں صفیں جھوٹ کی تمام
سچائیوں کے ہاتھ میں تلوار آپؐ ہیں

(جمیل ملک)

ہم پہ یہ راز کھلا مصحفِ سیرت پڑھ کر
آپؐ ہر لفظ میں انساں کا مقدر لائے

(قیصر بارہوی)

اللہ اللہ ساعتِ میلاد
قابلِ دید تھی زمیں کی پھبن

(منیر سیفی)

اک مہر جہاں تاب ابھرتا ہے حرم سے
اب جھوٹے خدا اپنے چراغوں کو بجھا دیں

(اقبال عظیم)

علم کا سورج اچھالا جہل کی تنسیخ کی
ذہن کے ہر بند دروازے کو وا اُس نے کیا
(محسن رضا)

پیوند لگائے ہوئے ملبوس میں سیفی
تہذیب و تمدن کا وہ محور تھا وہ کیا تھا
(منیر سیفی)

شفق کا رنگ، ستاروں کی ضو، قمر کی ضیا
حبیبِ پاک کے نور و ظہور کی رونق
(محمد علی ظہوری)

اس کو کہتے ہیں تکمیل انسانیت
ساری اچھائیاں ایک انسان میں
(محشر بدایونی)

آپؐ اعلیٰ نسب، آپؐ امی لقب، آپؐ کن کا سبب آپ محبوبِ رب
آپؐ کا جو ہوا وہ خدا کا ہوا آپؐ کی ذات ہے دلبری دلبری
(ابصار عبدالعلی)

جھکتی نہ درِ کعبہ پہ پیشانی عالم
یہ سجدے کہاں ہوتے اگر آپؐ نہ ہوتے
(گلنار آفریں)

جو سراپا خوشبوؤں کا شہر تھا، وہ ایک شخص
سب میں شامل تھا مگر سب سے جدا پیدا ہوا
(خلش مظفر)

یہ معجزہ ہے آپؐ کے اعجازِ نطق کا
لب بستہ گنگ نوعِ بشر نے صدائیں دیں
(سید ریاض حسین زیدی)

اُن کی نسبت سے دعاؤں کا شجر سبز ہوا
ورنہ ٹلتا ہی نہ تھا بے ثمری کا موسم
(صبیح رحمانی)

جسمانی تشدد سے لے کر ذہنی تشدد تک ہمارا تہذیبی منظر نامہ ان گنت بنجر موسموں کی ناروا ساعتوں کی گرفت میں تصویرِ غم بنا ہوا ہے اس لیے کہ ہم ذہنوں میں تعمیر کیے جانے والے عقوبت خانوں کو مسمار کرنے کی کسی تجویز پر غور کرنے کے لیے بھی تیار نہیں۔ بات بر زباں انا کی سولی پر لٹک رہی ہے۔ طنز اور تضحیک کے نشترِ تحقیر کے گہرے پانیوں میں آگ لگا رہے ہیں، سطحِ سمندر پر نفرتوں اور کدورتوں کے الاؤ سلگ رہے ہیں، اکیسویں صدی کے آغاز پر بھی بیسویں صدی کی آخری دہائیوں کی طرح مفادات کے قیدیوں نے ہوسِ زر کی بساط بچھائی ہوئی ہے۔نعت کے وسیع ہوتے ہوئے منظر نامے میں انسانیت کے آنسو سلگ رہے ہیں۔

تجھ کو پہچانا نہیں ابنائے دوراں نے ابھی
ہیں تری عظمت سے بے بہرہ ابھی اہلِ جہاں
(عبدالعزیز خالد)

وارث اس کا نہ ہو سکا کوئی
تخت خالی رہا محمدؐ کا
(ظفر اقبال)

جو انقلاب پیشِ نظر ہے حضورؐ کے
انساں کی ہے فلاح اسی انقلاب میں
(انجم رومانی)

جب بھی اس دنیا میں ظلم و جور کی وحشت بڑھی
عدل کے وہ بانی و معمار یاد آئے بہت
(خالد بزمی)

جب کسی بے بس کو دیکھا ظلم کا ہوتے شکار
اُس کو ظالم سے چھڑایا ہوگئی نعت رسولؐ
(ادیت رائے پوری)

بہار ہو کہ خزاں کارگہِ ہستی میں
انہیں کسی سے غرض کیا جو تیرےؐ ہوجائیں
(صہبا اختر)

عرشِ خدا پہ شانِ خدا جھومنے لگی
مردِ خدا کی عظمتِ کردار دیکھ کر
(شیر افضل جعفری)

تری جدائی میں رونے والے ہی میری بستی میں بچ رہے ہیں
مری زمیں پر ہوائے عالم عذاب تحریر کر رہی ہے
(اجمل نیازی)

جھوٹے خداؤں کی عملداری میں عصائے موسیٰ رکھنا شیوہ پیغمبری ہے۔ تاریخ انبیاء گواہ ہے کہ اللہ کے ان مقرب نبیوں اور رسولوں کی ساری جدوجہد ہی انقلابی جدوجہد ہے۔ یہی انقلابی جدوجہد آج بھی راہ انقلاب میں سورج اتار رہی ہے، آج کا انسان کسمپرسی کے عالم میں ہے، اس کی سوچ کے پرندوں کے پر کاٹ دیئے گئے ہیں، حرفِ دعا لبوں پر آنے سے پہلے ہی دم توڑ دیتی ہے۔ آج کی نعت کا شاعر ماحول کی سنگینی سے پوری طرح آگاہ ہے۔ وہ نعت میں بھی سر تاپا صدائے احتجاج بن جاتا ہے اور وقت کے یزیدوں، فرعونوں اور نمرودوں کو للکار رہا ہے۔ کبھی وہ براہ راست بھی اندر کا لاوا اگلتا ہے اور کبھی غزل کے حسیاتی اظہار سے کام لیتا ہے۔ علامت اس کے جذبوں کے اظہار کا ذریعہ بنتی ہے۔

گذاری ہے شبستانِ ہوس میں زندگی میں نے
پشیماں ہوں پشیماں ہوں پشیماں یارسول اللہ
(عبدالعزیز خالد)

خرد کی موشگافی سے جہنم بن گئی دنیا
زمیں گہوارۂ امن و سکوں اسلام سے ہوگی
(مرتضیٰ برلاس)

بھٹکی ہوئی دنیا کو ضرورت ہے تمہاری
ہاں بارِ دگر بارِ دگر شافع محشر
(انجم یوسفی)

وہ فکرِ نو کہ جسے آپؐ سے نہیں نسبت
ہے اُس کا سود بھی دل کے لیے زیاں کی طرح
(حفیظ الرحمٰن احسن)

درپیش ہے بے سمت مسافت کی اذیت
اس دور کا انسان ہے دانش کے بھنور میں
(انور مسعود)

کٹ تو سکتا ہوں مگر جھوٹے خداؤں کے حضور
تیرا کاشؔر ہوں، کبھی سر نہ جھکایا میں نے
(سلیم کاشر)

تہذیب کے داعی ہیں یہاں جابر و ظالم
یاد آتے ہیں اس حال میں بس آپؐ کے اشفاق
(سعید بدر)

اس عہد کے طائف میں گرا ہوں مرے آقاؐ
بس وردِ زباں رکھوں سر عام ترا نام
(محمود رحیم)

جدید اردو نعت مسلم امہ کی محرومیوں کا آئینہ ہے۔ اپنے پرشکوہ ماضی کا بھی اسے پورا ادراک ہے۔ دورِ انحطاط میں زوال آمادہ صدیوں کا نوحہ اس کی پلکوں پر آنسو بن کر سلگ رہا ہے۔

اداسی کے سفر میں جب ہوا رک رک کے چلتی ہے

سوادِ ہجر میں ہر آرزو چپ چاپ چلتی ہے
کسی نادیدہ غم کا کہر میں لپٹا ہوا سایہ
زمیں تا آسماں پھیلا ہوا محسوس ہوتا ہے
تو ایسے میں تری خوشبو
محمد مصطفیٰ صل علی کے نام کی خوشبو
دل وحشت زدہ کے ہاتھ پر یوں ہاتھ رکھتی ہے
تھکن کا کوہِ غم ہٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے
سفر کا راستہ کٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے

(امجد اسلام امجد)

بستی بستی قریہ قریہ صحرا صحرا خون
امت والے! امت کا ہے کتنا سستا خون

(نعیم صدیقی)

کبھی دنیا کے ہر بازار کو ہم نے خریدا تھا
بکاؤ مال اب دنیا کے بازاروں میں ہم بھی ہیں

(صبا اکبرآبادی)

لوگ ٹھکراتے ہیں جن کو سنگریزوں کی طرح
اُن غریبوں، بے نواؤں کا سہارا آپؐ ہیں

(تاب اسلم)

جنگِ کشمیر محمد کی رضا ہو یارب
تیغ حیدر کی ہو، لشکر ہو مدینے والا
(آصف ثاقب)

کئی کذّاب آئیں گے کئی دجال آئیں گے
گریباں دجل کا صد چاک کرنا عین ایماں ہے
(عنایت اللہ رشیدی)

وہ دھوپ میں ہے شدت یہ عصر جلدِ قیصؔر
سایہ طلب کرے گا دیوارِ مصطفیٰ سے
(قیصر نجفی)

اس صورتحال سے گھبرا کر شاعر لاشعوری طور پر عہد رسالت مآبؐ میں گوشہ عافیت تلاش کرنے لگتا ہے، حضورؐ کے عہد نور میں ہونے کی آرزو اس کے ہونٹوں پر مچلنے لگتی ہے۔ تحفظ کے ہاتھ اُس کے برہنہ سر پر عافیت کی چادر تان دیتے ہیں۔

میں اس حقیقت سے آشنا ہوں
کہ اپنا ہونا ہے اپنے بس میں
نہ اپنا مرنا ہے اپنے بس میں
مگر میں اکثر یہ سوچتا ہوں
کہ کاش میں بھی
اسی زمانے میں اور اسی سرزمیں پہ ہوتا
جہاں سراپائے نور بن کر

زمانے بھر کے لیے پیامِ حیات لے کر
تو جگمگایا

(حفیظ صدیقی)

چھوڑ کر جنتیں چلا آتا
تو مری قبر پر کھڑا ہوتا

(ڈاکٹر محمد طاہرالقادری)

آپؐ جس راہ سے گذرتے تھے
اُس میں میرا بدن بچھا ہوتا

(نجیب احمد)

مرے سوال کی لکنت پہ مسکراتے حضورؐ
کرم کا بہتا سمندر جواب میں ہووت

(ڈاکٹر خالد عباس الاسدی)

بولتا آپؐ کی گواہی میں
سر بہ سر نور میں بسا ہوتا

(اشرف جاوید)

کسی ننھے سے چرواہے کو دیکھوں اور پھر سوچوں
کوئی منظر کئی صدیوں پرانا یارسول اللہ

(سعیدہ ہاشمی)

مجھ کو ہونا ہی اگر تھا تو مرے رب کریم
اُنؐ کے بچپن میں قدمبوسی کا حیلہ ہوتا
پاؤں رکھ رکھ کے گھروندے وہ بنایا کرتے
میں خنک ریت کا بے نام سا ٹیلہ ہوتا

(ریاض حسین چودھری)

ہم نائن الیون کے بعد نام نہاد نئی دنیا کی آلودہ فضا میں سانس لینے پر مجبور ہیں۔ ہمارا اجتماعی وجود پرِ کاہ کی حیثیت بھی نہیں رکھتا۔ ہمارے گرد سیاسی اور معاشی غلامی کے حصار کو تنگ کیا جارہا ہے۔ سامراج جب چاہے ہماری معیشت کو ویرانے میں تبدیل کرسکتا ہے۔ نظریاتی اور جغرافیائی سرحدوں کا وجود ہوا میں تحلیل ہورہا ہے۔ بہت پہلے اکبر الہ آبادی نے کہا تھا۔

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

آج یہ شعر حرف بحرف سچ ثابت ہو رہا ہے۔ نصاب تعلیم میں اسلامی تشخص کے ہر آئینے پر پتھروں کی بارش کی جارہی ہے۔ پہلے اسلام کو مسجدوں اور خانقاہوں تک محدود کرنے کا منصوبہ تھا۔ اب اسلام کا تعاقب مساجد اور خانقاہوں کے اندر بھی ہوگا۔ سوویت روس میں کمیونسٹ انقلاب کے وقت مسلمانوں پر جو گذری تھی ان کی ثقافت کا جو حشر ہوا تھا آج معاملہ تو اس صورتحال سے بھی گھمبیر ہوتا جارہا ہے۔ ظلم کا سورج سوا نیزے پر آپہنچا ہے، تمام اخلاقی قدریں پامال ہوچکی ہیں۔ شرف انسانی کی بحالی کا تصور مغربی سامراج کے غبارِ انا میں گم ہوتا جارہا ہے۔ افق عالم پر لکھی دائمی امن کی بشارتوں کے بارود کے سیاہ دھویں نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ ہم اپنی اجتماعی قبروں کے لیے یزیدان وقت کے حضور اپنی درخواستیں گزار رہے ہیں۔ انسان کے بنیادی حقوق کی بازیابی

کا خواب قصہ پارینہ بن چکا ہے۔ عدل کا کٹا سر نیزے کی نوک پر سجادیا گیا ہے۔ حالی نے حضورؐ کی عدالت میں ملت اسلامیہ کا استغاثہ پیش کیا تھا:

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقت دعا ہے
امت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے

جدید اردو نعت میں استغاثے کا یہی رنگ نمایاں ہے اور آگے چل کر یہ رنگ مزید گہرا ہوگا۔ قلم دہلیز مصطفیٰ پہ سجدہ ریز ہے اور دامن چاک میں امن کی بھیک کا آرزو مند ہے۔

کب سے کرم کا منتظر ماہرؔ نامراد ہے
اس کی طرف بھی یا نبیؐ، گوشۂ چشم التفات

(ماہرالقادری)

نخلِ رحمت کی طرح ان کا سفر آساں کر
راہ تکتے ہیں تری مسجدِ اقصیٰ والے

(شہزاد احمد)

خاک کے ٹوٹے ہوئے دل جوڑنے والا ہے تو
سن اے شیشوں کے مسیحا دل شکستہ میں بھی ہوں

(صہبا اختر)

طرزِ دعا بھی سونپ رہی ہوں نگاہ کو
کیوں حرف التجاؤں میں حائل دکھائی دے

(ادا جعفری)

میں صنم کدہ ہوں آقاؐ! مرے سارے بت گرا دے
تری ذات بت شکن ہے، تری ذات خود حرم ہے
(عاصی کرنالی)

نبی جی! آپؐ تو سب جانتے ہیں
میں کیا روزِ قیامت چاہتا ہوں
(نجیب احمد)

کیسی عجیب بات ہے سنتے رہے وہ دیر تک
اتنے بڑے ہجوم میں صرف مری ہی داستاں
(یاسمین حمید)

مرے آقاؐ! دعا امت کے من میں
کہ اس میں الفتِ باہم نہیں ہے
(عابد نظامی)

اک خوف ہے جو جاں کو رہائی نہیں دیتا
اب ختم ہو اس قید کی میعاد نبی جی
(محمد سلیم طاہر)

مجموعہ آلام زمانہ یہ صدی ہے
آقاؐ کی طرف دھیان دلاتا ہی رہوں گا
(سلطان صبروانی)

ہمیں منزلوں کی نوید دے ہمیں خیر و شر میں تمیز دے
کہ ہم اپنے ہاتھ سے لکھ رہے ہیں جو زائچے ہیں زوال کے

(محمد فیروز شاہ)

آج کا نعت نگار اس شعور سے بہرہ ور ہے کہ جنگل کی تاریکی کو انسانی معاشروں پر مسلط کیا جارہا ہے۔ انسانی معاشروں کو حیوانی معاشروں میں تبدیل کر کے سامراج اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل چاہتا ہے۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے کالے قانون کو سکہ رائج الوقت قرار دے دیا گیا ہے۔ نیک چلنی کے سرٹیفکیٹ کا حصول مردہ ضمیروں کی مصدقہ نقول کی فراہمی کے بغیر ممکن ہی نہیں، تیسری عالمگیر جنگ اقوام متحدہ کے زیر سایہ لڑی جائے گی۔ اس کی ابتدائی تیاریاں عالم اسلام کو مفلوج کر کے مکمل کر لی گئی ہیں۔ عالمی منظر نامے پر ایک سرسری سی نظر ڈال لینے ہی سے صورتحال واضح ہو جائے گی۔

تری امت پہ کیا گذری
ملے ہیں خاک وخوں میں نام لیوا کس طرح تیرےؐ
ترے ہی امتی تیری ہی امت کے خلاف
اغیار و اعدا کے بنے حچھٹ سے مددگار و معین کیسے
مناجات و وظائف ہی فقط سامانِ حرب وضرب ہیں جن کا
وہ پابندِ روایات کہیں، خوش فہم، خود بیں تیرےؐ پروردگار
پُر امید تھے کتنے فرشتے ان کی نصرت کے
قطار اندر قطار اتریں گے گردوں سے
(مقام بدر جیسے)
ابابیلیں بھی ہوں گی حکم غیبی سے نمودار اس نئے نظم جہاں کے

ابرہہ کی فوج کو باران حشت و سنگ سے پامال کرنے کو
مگر بارِ دگر دیکھے نہ دونوں معجزے یہ چشم عالم نے
(الٹ ہی نکلیں معروضی حقائق سے کٹے خوابوں کی تعبیریں)
فلک سے آگ برسی
ریزہ ریزہ برج و بام و در
مکینوں کے اڑے پرزے
بنے معمور سے ویرانہ، گل وگلزار خاکستر

(عبدالعزیز خالد)

ایک بار اور بھی بطحا سے فلسطین میں آ
راستہ دیکھتی ہے مسجدِ اقصیٰ تیراؐ

(احمد ندیم قاسمی)

پھر خاکداں کو تیری ضرورت ہے لوٹ آ
یہ بات کس سے دہر میں تیرےؐ سوا کہوں

(شہزاد احمد)

اب تو بتان عصر سے زندگی بھر لڑوں گا میں
میرا یہ عزم آہنی آپؐ کے دم قدم سے ہے

(منیر قصوری)

اے شہِ خسرواں، رحمتِ دو جہاں، آج ہم پھر سے ہیں بے زمیں بے مکاں
پھر بشارت کوئی شافعِ عاصیاں، کارواں پھر سرِ صد غبار آ گیا

(اوریا مقبول جان)

آ کہ پھر انساں ترستا ہے اکائی کے لیے
ہوگئے پھر فرقہ فرقہ رنگ، نکہت، روشنی

(روحی کنجاہی)

آج پھر امت مسلمہ کو کربلائے عصر میں تشنہ لبی کے موسم ابتلا کی ہولنا کیوں کا سامنا ہے۔ جدید اردو نعت میں کربلا کا استعارہ تفہیم جبر کی نئی گرہ کشائی کر رہا ہے۔فکر و نظر کے ان گنت اساسی رویے ابلاغ و اظہار کے مراحل سے گذر رہے ہیں، مسلم امہ آزمائش کی جن جان لیوا گھڑیوں سے دو چار ہے وہ کسی قیامت سے کم نہیں۔ ملت اسلامیہ صدیوں سے انہی سفاک لمحوں کی وحشت اور درندگی کا ہدف بنی ہوئی ہے۔ انخلا در انخلا کو اس کا مقدر بنا دیا گیا ہے۔ اپنے گھر ہی میں اس پر عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا ہے۔ خیموں کو آگ لگا کر بے گور و کفن لاشوں پر گھوڑوں کو دوڑانے کا حکم دیا جا چکا ہے۔ یزیدان وقت مسند شاہی پر بیٹھ کر مظلوموں کی لاشوں کی پامالی کا منظر دیکھ رہے ہیں کہ ابھی تک خون ٹپک رہا ہے۔ افغانستان اور عراق میں شام غریباں کا منظر دہرایا جا چکا ہے۔ فلسطین میں خون مسلم کی ارزانی دیکھی نہیں جاتی۔ حماس کے رہنما یسین کا بہیمانہ قتل اسرائیل کی دہشت گردی نہیں تو اور کیا ہے۔ کیا طرفہ تماشہ ہے کہ فلسطین کے معصوم بچے پتھر اٹھا کر اپنی نفرت کا اظہار کریں تو وہ دہشت گرد ٹھہریں۔ یہ کیسی اندھیر نگری ہے۔ پہلے ہر محاذ پر اسلام کا راستہ روکا گیا۔ دہشت گردی کو اسلام کے مترادفات میں شامل کر کے عالمی استعمار اپنی بقا کی جنگ لڑ رہا ہے۔ غزل اور نظم کے ساتھ نعت میں بھی اس کا شدید ردعمل سامنے آیا ہے۔

غارِ حرا سے کرب و بلا کے مقام تک
دیدہ وروں پہ فاش ہیں اسرارِ مصطفیٰ

(شورش کاشمیری)

ڈوبے ہوئے لہو میں ہیں اس دور کے بھی ہاتھ
پھر کیا کہوں اگر نہ اسے کربلا کہوں

(شہزاد احمد)

جیحوں کے پار اتریں گے پھر بھی وہ قافلے
پوچھے سوادِ نیل، کنارِ فرات سے

(پروفیسر محمد منور)

اس کربلا میں چادرِ زینبؓ ملے حضورؐ!
لپٹی ہوئی زمین ہے زخموں کی شال میں

(ریاض حسین چودھری)

آج کا مدحت نگار اس اندوہناک صورتحال کا عینی شاہد ہی نہیں سامراج کی ریشہ دوانیوں کا خود بھی ہدف بنا ہوا ہے۔ آج کے فرد کی نام نہاد روشن خیالی نے اسے خود فریبی کے جنگلوں میں اندھا کر رکھا ہے۔ اس کے سیکولرازم کا خواب چکنا چور ہو چکا ہے۔ نظریاتی تشخص کو زہر قاتل سمجھنے والا خود ہی زہر خوانی کا شکار ہو چکا ہے۔ آج کا نعت نگار استحصالی طاقتوں کی محلاتی سازشوں سے بخوبی آگاہ ہے۔ جبر ناروا کا موسم اس کی سوچ تک کو اپنی گرفت میں لے چکا ہے۔ اس کے لہو میں بے بسی کا عفریت رینگ رہا ہے، آج کی نعت اپنے عہد کے اس اضطراری پس منظر کا ایک حصہ ہے، نعت نگار کے قلم پر آنسوؤں، ہچکیوں اور سسکیوں کا ہجوم کب سے حرفِ التجا بنا ہوا ہے۔

خبر یہ گرم ہے طاغوتیوں کے حلقے میں
کہ دانت رکھتا ہے بطحا پہ دورِ نو کا یہود

(احسان دانش)

احسان دانش اگر آج زندہ ہوتے تو نجانے مرگِ مسلسل کی اس کیفیت میں کتنے نوحے تخلیق کرتے۔

کب سے محرومِ اذاں ہے سرزمین مرسلیں
قبلہ اول ہے دستِ جور کے زیرِ نگیں
مل رہی ہے ہم کو نافرمانی حق کی سزا
یارسول اللہ انظر حالنا

(حفیظ تائب)

آج کا نعت نگار اسی شعور سے بہرہ ور ہے کہ زمانے کی ہوا سخت برہم ہے، ارض و سما مسلسل زلزلوں کی زد میں ہیں۔ وہ بارگاہ نبوی میں حرف التجا بن کر کھڑا ہے کہ یارسول اللہ! یہ دورِ ابتلا ختم ہونے کو نہیں آرہا۔ کشمیریوں پر ظلم کے پہاڑ توڑے جارہے ہیں اس کرہ ارضی پر آپ کے نام لیواؤں کے لیے کوئی جائے پناہ نہیں امت مسلمہ فکری اور نظری انتشار کا شکار ہے۔

جدید اردو نعت اسلام کے انقلابی پہلو کو اجاگر کرتی ہے۔ یہ احساس تحریک بن کر ابھرا ہے کہ اگر دنیا کو امن کی تلاش ہے، اگر وہ اپنے برہنہ سر پر ردائے عافیت کی تمنائی ہے تو دہلیز مصطفیٰ سے رشتہ غلامی استوار کیے بغیر ایسا ممکن نہیں۔

اے سید سادات عنایت کی نظر ہو
یہ عہد ہوس ڈوب چلا ظلمتِ شر میں

(انور مسعود)

عہد ہوس اپنی قہر سامانیوں کے ساتھ ہر لمحہ حیات ارزانی پر مسلط ہے، صرف ارض وطن ہی نہیں اس کرہ ارضی کا ذرہ ذرہ بے یقینی کی دھند میں لپٹا ہوا ہے، عالمی سطح پر ایک نہیں کئی ثقافتی بحران پیدا ہو چکے ہیں۔ سیاسی اور معاشی افراتفری نے ان بحرانوں کو اتنا سنگین اور گھمبیر بنادیا ہے کہ اولاد آدم وقت کی قتل گاہوں میں اپنے ہی لہو کے رقص مسلسل کی تماشائی بنی ہوئی ہے۔ انسانی معاشرہ تیزی سے حیوانی معاشرے میں تبدیل ہو رہا ہے، اخلاقی قدروں کے بے گوروکفن لاشے کو ہوس پرستی کے گدھ کب کا نوچ چکے ہیں۔ آج کا انسان اجتماعی خودکشی کے دہانے پر کھڑا ہے۔ شاداب موسموں اور مخمور ساعتوں کو پھر سے نسل انسانی کا مقدر بنانے اور اسے حصار خوف سے نکال کر امن کی ردائے فاخرہ سے نوازنے کا احساس ذہن انسانی میں اس صبح انقلاب کے آفتاب رسالت کی ضیا پاشیوں کے تصور سے جگمگا رہا ہے جو آفتاب رسالت آج سے ساڑھے چودہ سو سال پہلے فاران کی چوٹیوں پر چمکا تھا۔ اس روشنی نے غار حرا کے مقدس دامن سے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا۔

فضائے بے نطق جیسے اقرا کا ورد کرنے لگی تھی
وہ سارے لفظ جو
تیرگی کے سیلاب میں کہیں بہہ چکے تھے
پھر روشنی کی لہروں میں
واپسی کے سفر کا آغاز کر رہے تھے
دریچۂ خیال میں
آگہی کے سورج اتر رہے تھے
اس ایک پل میں
وہ میرا امّی

مدینۃ العلم بن چکا تھا

(پروین شاکر)

لب کی امنگ دل کی طلب، جاں کی آرزو
صدیوں زماں مکاں کو رہی تیری جستجو
بے چین گلشنوں میں صبا، جنگلوں میں لو
اُس کے ظہور کے لیے بیکل تھے چار سو
تسکین کائنات کا پیغام آ گیا
وہ آ گیا تو زیست کو آرام آ گیا

(انور جمال)

آج کے شاعر نے بھی قصر ایمان میں حُب رسول کے چراغ جلانے کا اعزاز حاصل کیا ہے وہ تاریخ کے سفر سے بخوبی آ گاہ ہے۔ اس کے حیطۂ شعور میں یہ بھرپور تاثر قائم و دائم ہے کہ حضورؐ آئے تو اس کرہ ارض پر قانون کی حکمرانی قائم ہوئی۔ انسان کو انسان کی خدائی سے نجات ملی۔ اولاد آدم کے لیے ایک ایسا لائحہ عمل مرتب ہوا جو قیامت تک کے انسانوں کے لیے منشور حیات ٹھہرا۔ ایسا ضابطہ اخلاق مدون ہوا جو ہر دور کے انسان کا نصاب زندگی قرار پایا۔ انسان کی خود ساختہ خدائی کا خود ساختہ نظام اپنے ہی ملبے تلے دفن ہوگیا، شرف انسانی کی بحالی کے ساتھ ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ جدید اردو نعت میں یہ تاثر اپنی جملہ تخلیقی توانائیوں کے ساتھ دائرہ عمل میں مینارۂ نور بن گیا ہے کہ فصیل دیدہ و دل پر عشق مصطفیٰ اور محبت آقائے محتشمؐ کے چراغ جلائے بغیر خلعت غلامی رسولؐ کا حصول ممکن نہیں۔ جدید اردو نعت کی صورت پذیری کا موسم تخلیقی عمل سے گذر رہا ہے اور اظہار و ابلاغ کی ان گنت دلکش صورتیں دامن دل کو کھینچ رہی ہیں۔

یہ آستانِ محمدؐ ہے اس طرف آؤ
سکون قلب کی دولت یہاں سے ملتی ہے
(عبدالکریم ثمر)

مانگ لے آفتابِ حرا سے طفیلؔ
جس کو مطلوب ہے جس قدر روشنی
(طفیل ہوشیار پوری)

سخن سبز پھر ہوا ہے بلند
دشت پھر گونج اٹھا محمدؐ کا
(ظفر اقبال)

ادھر سے کون گذرا تھا کہ اب تک
دیار کہکشاں میں روشنی ہے
(تاب اسلم)

مجھے تو دامن افلاک بھی لگتا ہے تنگ ارشد
وہاں بے انتہا تقسیم کی جاتی ہیں خیراتیں
(ارشد مہر)

تریؐ تعریف کو تو پھول ایسے لفظ لکھے تھے
جو دیکھا غور سے تو چاند کاغذ پر نظر آئے
(اقبال ساجد)

عہد طفولیت سے مقام وصال تک
آقاؐ کی ہر ادا کو ہمارا سلام ہو
(جمیل نظر)

مری جبیں تو ہے مخصوص ان کے در کے لیے
ہر آستاں مرا مقصود ہو نہیں سکتا
(حسین سحر)

ہونا ہی تھا سجدہ فرض فرشتوں پر
آدم کی پیشانی میں تھا نور ترآؐ
(روف امیر)

قاصرؔ جو دل غلام محمدؐ نہ بن سکے
وہ مبتلائے سحرِ گماں ہیں جہاں بھی ہیں
(غلام محمد قاصر)

غیر مجھ سے نہ ثنا خوانی کی امید کرے
بس مجھے سرور عالمؐ کی ثنا آتی ہے
(محمد حنیف نازش)

میں آفتاب سجاؤں نظر نظر شہزاد
اگر غلامیٔ شہ میں قبول ہو جاؤں
(قمر رضا شہزاد)

معجزہ بولتا ہے مٹھی میں
سنگریزے زباں نہیں رکھتے

(بشیر احمد مسعود)

دفاعِ مصطفیٰ کا فریضہ ازل ہی سے نعت گو کو ودیعت کیا گیا ہے اور یہ فریضہ عین منشائے ایزدی ہے، قرآن کے اسلوب ہدایت میں جابجا اس کی تاکیدی صورتیں نظر آتی ہیں۔ آج کا مدحت نگار اپنے فرائض منصبی سے غافل نہیں۔ وہ پوری تخلیقی توانائیوں کے ساتھ وقت کے ابوجہلوں اور ابولہبوں کے فکری مغالطوں اور اجتہادی لغزشوں کے سامنے سیسہ پلائی دیوار بنا ہوا ہے۔

ایمان فروشوں نے سجائے کئی دربار
بگڑا نہیں کچھ بھی مرے پیمانِ وفا کا

(احمد ندیم قاسمی)

کیا سمجھتے ہیں نبوت کے حریفانِ قدیم
ہم تہی دست فقیروں کے گریبانوں کو

(شورش کاشمیری)

وہ سچا امتی ہے اس کا تائبؔ
مئے ناموس دیں جو سر بکف ہے

(حفیظ تائب)

علمی اور ثقافتی سطح پر بھی شجرِ انا لقب کی آبیاری ذہنی، فکری اور نظری تبدیلیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔

# روح کائنات جھومنے لگی

(محمد متین خالد صاحب نے میلادِ مصطفیٰ ﷺ کے موضوع پر ''جب حضور ﷺ آئے'' کے عنوان سے ایک خوبصورت مجموعۂ مضامین ترتیب دیا جسے ۱۹۹۷ء میں شائع کیا۔ ''روح کائنات جھومنے لگی'' اس کتاب میں شامل ریاض حسین چودھریؒ کی وجدان پرور تحریر ہے جو انہوں نے **''یہ کس رسول کی آمد ہے بزمِ ہستی میں''** کے عنوان کے تحت پندرہ روزہ تحریک ۱۶ تا ۳۱ اگست ۱۹۹۴ء کے اداریے کے طور پر لکھی۔)

''یہ کون آیا ہے کہ محراب یقیں میں کہکشاؤں کے جھرمٹ ہجوم کرنے لگے ہیں، یہ کون آیا ہے کہ نسل آدم کے مقدر پر مسلط بانجھ موسموں کے سلگتے ہوئے بدن، انگڑائیاں لے کر بیدار ہونے لگے ہیں، یہ کون آیا ہے کہ سلگتی ہوئی فضائیں شاداب ساعتوں اور مخمور لمحوں سے ہمکنار ہونے لگی ہیں، یہ کون آیا ہے کہ شرف انسانی کی مٹتی ہوئی قدریں پھر سے بحال ہورہی ہیں، یہ کون آیا کہ حرم حق کے پرچم چاروں طرف لہرا رہے ہیں، یہ کون آیا ہے کہ شمیمِ سحر، امن اور سلامی کا مژدہ لیے کلیوں کے گھونگھٹ الٹ رہی ہے، یہ کون آیا ہے کہ حوا کی بیٹی کے برہنہ سر پر چادر رحمت ڈال دی گئی ہے، یہ کون آیا ہے کہ کائنات رنگ و بو میں روشنی کی ہر کرن، وجد میں آگئی ہے، یہ کون آیا ہے کہ روح کائنات جھومنے لگی ہے، یہ کون آیا ہے کہ فصیل قصر شاہی پر عظمت جمہور کے پرچم کھل رہے ہیں، یہ کون آیا ہے کہ چار دانگ عالم میں غلبہ حق کا اعلان ہونے لگا ہے، یہ کون آیا ہے کہ آتش کدوں کی آگ بجھ گئی ہے، یہ کون آیا ہے کہ باطل کے ایوانوں پر لرزہ طاری ہے، یہ کون آیا ہے کہ

ابلیسیت کے گھر میں صف ماتم بچھی ہے، یہ کون آیا ہے کہ انسان کی ''خدائی'' کے خاتمے کی نوید سنائی جارہی ہے، یہ کون آیا ہے کہ رنگ ونسل کے بت پاش پاش ہوگئے ہیں، یہ کون آیا ہے کہ جبر کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے غلاموں کی دنیا میں آزادی کا سورج طلوع ہورہا ہے، یہ کون آیا ہے کہ سسکتی ہوئی انسانیت کے ویران آنگن میں گنگناتی ہوئی خوشبوئیں رقص کرنے لگی ہیں، یہ کون آیا ہے کہ جس کے نقش قدم پر تاریخ کا سفر جاری تھا، جاری ہے اور جاری رہے گا، یہ کون آیا ہے کہ آگہی کا ہر حرف جس کی گفتارِ جمیل سے اکتسابِ شعور کرنے کا پابند ہے، یہ کون آیا ہے کہ شب ستم کی تاریکیاں اپنا رخت سفر باندھنے لگی ہیں، یہ کون آیا ہے کہ بت پرستی کی ہر شکل کی تکذیب کے لیے سامان عبرت فراہم ہونے لگا ہے، یہ کون آیا ہے کہ جس کے آنے سے زمین پر عدل کا نفاذ ہوگا، یہ کون آیا ہے کہ مقتلوں میں دھول اڑنے لگی ہے اور خون انسانی کی حرمت کو، کعبے کی حرمت سے زیادہ قرار دیا جارہا ہے، یہ کون آیا ہے کہ ہر بریدہ شاخ مسکرانے لگی ہے، یہ کون آیا ہے کہ دامانِ سحر میں گلشن مہکنے لگے ہیں، یہ کون آیا ہے کہ پیاسی زمینوں اور بنجر ساعتوں پر ابرِ کرم کی رم جھم ہونے لگی ہے، یہ کون آیا ہے کہ ہوائے مشکبار مشام جاں کو معطر کرنے لگی ہے، یہ کون آیا ہے کہ جس کا اسمِ گرامی کائنات کی ہر چیز کی زبان پر رواں ہے، یہ کون آیا ہے کہ جس پر خالق کائنات اور اس کے ملائکہ بھی درود بھیجتے ہیں، یہ کون آیا ہے کہ قرآن جس کی اطاعت کو خدا کی اطاعت قرار دے رہا ہے، یہ کون آیا ہے کہ جس کے سر اقدس پر ختم نبوت کا تاج سجایا گیا ہے، یہ کون آیا ہے کہ عرش سے فرش تک نور کی چادر تان دی گئی ہے، یہ کون آیا ہے کہ نسل آدم کے بخت خفتہ پر پڑے نامرادی کے قفل، ایک ایک کرکے ٹوٹنے لگے ہیں، یہ کون آیا ہے کہ تشکیک و الحاد کی وادیوں میں توحید باری اور خالق یکتا و تنہا کا ڈنکا بجنے لگا ہے، یہ کون آیا ہے کہ تاریخ بشر، صدق و صفا، فقر وغنا، جود وسخا اور لطف و عطا کی شگفتہ کلیوں سے مہک رہی ہے، یہ کون آیا ہے کہ تمدن کی جبیں پر چاندنی کی نرم

کرنیں نئے دن کا نیا عہد نامہ تحریر کررہی ہیں، یہ کون آیا ہے کہ جس کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ، حکم خدا ٹھہرا ہے، یہ کون آیا ہے کہ تپتے ہوئے ریگ زاروں اور سلگتے ہوئے صحراؤں سے آبِ خنک کے چشمے پھوٹ نکلے ہیں، یہ کون آیا ہے کہ شرک و جاہلیت کے تمام فلسفے باطل قرار دیئے گئے ہیں، یہ کون آیا ہے کہ ابرِ نور و نکہت ہر بستی اور ہر قریے پر کھل کر برسا ہے، یہ کون آیا ہے کہ آئینہ خانوں میں بکھرے ہوئے عکس اور ٹوٹے ہوئے وجود اپنی اکائی کو تحفظ کی ردا میں لپٹا ہوا دیکھ رہے ہیں، یہ کون آیا ہے کہ کارخانۂ قدرت میں روشنیاں، عمل کی صورت میں تجسیم ہونے لگی ہیں، یہ کون آیا ہے کہ فرعونیت اور قارونیت کو کہیں جائے پناہ نہیں مل رہی، یہ کون آیا ہے کہ تاریک خطوں میں دھنک کے ساتوں رنگ بکھرنے اور مچلنے لگے ہیں، یہ کون آیا ہے کہ ابر شفاعت جس کے ہمرکاب ہے، یہ کون آیا ہے کہ بنجر سوچوں والے قلمرو انسان بھی اضطراب سے آشنا ہونے لگے ہیں، یہ کون آیا ہے کہ جس کے فیض کا چشمہ قیامت تک جاری رہے گا، یہ کون آیا ہے کہ جو مرکزِ عشق ہے، یہ کون آیا ہے کہ بعد حشر بھی جس کی رسالت کا پھریرا اڑتا رہے گا، یہ کون آیا ہے کہ جس کے ذکرِ جمیل پر معبد جاں میں ریشمیں موسم اترنے لگے ہیں اور یہ کون آیا ہے جس کا ہر نقشِ پا خورشیدِ محبت بن کر افقِ دیدہ و دل پر طلوع ہورہا ہے اور طلوع کا یہ منظر قیامت تک ہر لمحے اور ہر ساعت کے مقدر کو جگمگاتا رہے گا''۔(ﷺ)

# حریمِ دیدہ و دل میں چراغاں

(شیخ عبدالعزیز دباغ کے مجموعہ کلام ''مطافِ نعت'' کی تعارفی تحریر)

نعت درود و سلام کے پیکرِ شعری کا نام ہے۔ نعت حریمِ دیدہ و دل میں چراغاں کا اہتمام کرتی ہے، اللہ رب العزت تک رسائی کا ہر راستہ دہلیز مصطفیٰ کو چوم کر عرش معلیٰ تک جاتا ہے۔ دعا درود کی چادر میں سمٹنے کی ادا بھول جائے تو وہ زمین و آسماں کے درمیان معلق رہتی ہے۔ نعت بنیادی طور پر حضور ﷺ کے شمائل، فضائل، خصائل اور خصائص کے سدا بہار مقدس اور سرمدی پھولوں سے خوشبوئیں کشید کرنے کا نام ہے۔ نعت کا اساسی رویہ آقاؐ کی ذاتِ اقدس کے انہی حوالوں سے ابلاغ پاتا ہے۔ غلامانِ حضور ﷺ کی داخلی اور خارجی زندگی کے اردگرد پھیلے ہوئے ان گنت مسائل اور مصائب بھی انفرادی اور اجتماعی سطح پر نعت کا موضوع بن کر نعت کے کینوس کو وسیع سے وسیع تر کرتے جا رہے ہیں۔ حضور ﷺ کی ذاتِ اقدس سے نسبت رکھنے والی ہر چیز ہی نعت کے مضامین میں شامل ہوسکتی ہے مثلاً شہرِ حضور ﷺ کا ذکر بھی نعت ہی ہے، شہرِ بے مثال کی ہواؤں، فضاؤں، شہرِ مصطفیٰ کی گلیوں، پرندوں، در و دیوار کا تذکرہ بھی نعت کے دامنِ تخلیق کا حصہ قرار پائے گا، شہرِ مدینہ کے مکینوں کا ذکر بھی نعت میں آ کر نعت بن جائے گا۔ پھر درِ مصطفیٰ ﷺ، مواجہہ اقدس، سنہری جالیاں، ریاض الجنہ، مسجد نبوی، گنبد خضرا نعت ہی نعت، ثنا ہی ثنا، حتیٰ کہ شائستگی، متانت اور سنجیدگی کے درمیان رہ کر تمام زمینی حقائق اور کائنات کی سچائیاں نعت کے مضامین میں شمار ہوسکتی ہیں۔

اس لئے اکیسویں صدی میں تخلیق ہونے والا نعتیہ ادب قدیم نعت سے مختلف نظر آتا ہے۔ اس کے باوجود اس کا تخلیقی ربط ماضی سے ٹوٹنے نہیں پاتا۔ نعت کا اساسی رویہ آج بھی جوں کا توں موجود ہے۔ آج کا مدحت نگار بھی شعرائے دربارِ رسول ﷺ کے

آثارِ قلم سے اکتسابِ شعور کرتے ہوئے تخلیقِ نعت کی شاہراہِ عظیم پر گامزن ہے اور سعادتوں کے پھول سمیٹ رہا ہے۔ یوں جدید اردو نعت کا منظر نامہ اتنے رنگوں، روشنیوں اور خوشبوؤں کا مرقع نظر آتا ہے کہ ان سب کو حیطۂ ادراک میں لانا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ یہ شعور محض توفیق خداوندی ہے۔

یہی توفیقِ خداوندی ''مطافِ نعت ﷺ'' کے شاعر شیخ عبدالعزیز دباغ کا مقدر بھی بنی ہے، افقِ نعت پر سوچ اور اظہار کے نئے سورج کے طلوع ہونے کی بشارت تحریر ہو رہی ہے۔

''مطافِ نعت'' شیخ عبدالعزیز دباغ کا پہلا نعتیہ مجموعہ ہے۔ اس کا آغاز ربِ کائنات کی بارگاہِ صمدیت میں حروفِ التجا سے ہوتا ہے کہ مجھے توفیق دے، میں قیامِ حشر تک مطافِ نعت میں چلتا رہوں۔ اے خالقِ ارض و سماوات! میرا یہ طوافِ قلم کبھی ختم نہ ہو اور ابد تک ثنائے رسول ﷺ کی تجلیات میں گم رہوں۔

کبھی نہ ختم ہو، یا رب! مرا طوافِ قلم
مطافِ نعت میں چلتا رہوں قیامت تک

اپنے بندۂ محتاج ہونے ہی کا نہیں اپنی بے نوائی کا احساس بھی دامن گیر ہے۔ شعورِ بندگی ان کے دائرۂ عمل کا عنوان ہے۔

مَیں ایک بندۂ لاچار حمد کیا لکھوں
مَیں لوحِ دل پہ اسے ربِّ مصطفٰؐ لکھوں
جو لا شریک ہے، یکتا ہے، سب کا خالق ہے
میں کائنات کے مالک کی کیا ثنا لکھوں

شیخ عبدالعزیز دباغ حضورِ حق رکوع و سجود کی سعادت حاصل کرنے کے بعد ممدوحِ ربِّ کائنات کی بارگاہِ بیکس پناہ میں تصویرِ ادب بن کر محوِ ثنا ہیں۔ خود سپردگی اور

وارفتگی کا احرام باندھ کر لمحاتِ حضوری کے کیفِ دوام میں کھو جاتے ہیں، شاعر پیکرِ عجز بن کر اپنے آقاﷺ کے درِ عطا پر التماس گزار ہے۔

ہونٹوں کو ہو نصیب درِ نور چومنا
چشمانِ تر کو دید کی دولت عطا کریں
حرص و ہوا کی دوڑ میں شامل نہیں ہوں مَیں
مجھ کو متاعِ فقر و قناعت عطا کریں

درودوں کے نغمے تسکین کا باعث بنتے ہیں تو شاعر کی روح جھوم اٹھتی ہے، پلکوں پر ستارے چمکنے لگتے ہیں حریمِ دیدہ و دل میں چراغاں ہونے لگتا ہے اور کشتِ آرزو میں بادِ بہاری چلنے لگتی ہے، ''مطافِ نعت'' میں سیرتِ رسولﷺ کا عکسِ جمیل دکھائی دیتا ہے۔ حضورﷺ کی سیرتِ مطہرہ کا نور لفظ لفظ کو اعتبار و اعتماد کی تجلی عطا کرتا ہے، درِ حضورﷺ پر حاضری کی تڑپ اور پھر حضوری کی آرزو ان کی نعت کا وہ اساسی رویہ ہے جو ورق ورق پر سوز و گداز کی مشعلیں روشن کرتا چلا جاتا ہے۔

مَیں جب سے کوچۂ جاناں سے ہو کے آیا ہوں
تڑپ رہا ہوں کہ پھر سے بہار آ جائے
درِ حبیبؐ پہ جو کچھ ہوا وہ یاد آئے
جو آ کے چھیڑے مرے دل کے تار، آ جائے
صبح و مسا نظر میں درِ مصطفیٰؐ رہے
ہر وقت میرے سامنے اُنؐ کی رضا رہے
دل میں وفورِ شوق کا طوفاں بپا رہے
آنکھوں میں انتظار کا دریا رکا رہے

وہ حبِ نبی کی کیفیت کو طبعی طور پر بھی محسوس کرتے ہیں۔

بہتی رہے رگوں میں یونہی یادِ مصطفیٰؐ
میرا وجود نور کا قلزم بنا رہے

اور اپنے دل کی دھڑکن کو ذکرِ نبی نبیؐ سے مترنم کرتے اور بارگاہِ پیمبرؐ میں لحاتِ حضوری پر ساری زندگی قربان کرتے نظر آتے ہیں۔

اترا ہے دل میں نقشِ کفِ پا حضور ﷺ کا
رفتار کہہ رہی ہے مسلسل نبی ﷺ نبی ﷺ
کل تک تو بارگاہِ پیمبر ﷺ میں تھا عزیز
قربان میرے کل پہ مری ساری زندگی

حصولِ رضائے نبی ﷺ کا غم ان کی ذات، شخصیت اور فکرِ نعت کا مرکز و محور ہے۔ اسی غم سے وہ حصولِ نسبت، حضوری، درِ رسول پر حاضری اور قدمَینِ پاک میں التجاؤں کی کیفیات میں ملفوف نظر آتے ہیں۔ اس غم کا اظہار ان کی نعت میں جابجا ملتا ہے۔

جو کوئی غم ہے تو بس ہے غم رضائے رسول
ہزار خوف ہوں لیکن کوئی خطر بھی نہیں
عزیزؔ ان کی رضا کا غم ہے وہ راضی خدا راضی
مَیں توبہ کی دعا کرتا رہوں جا کر مدینے میں
ہو جن کی نعت میں پنہاں غمِ رضائے نبی
انہیں فراغ کا سودا و سر نہیں ہوتا

شیخ دباغ کے نعتیہ کلام میں سیرت نعتِ رسولؐ کا ایک صحت مند حوالہ ہے۔ ان

کی فکر نعت کو انسان کے وسیع تر معاشرتی، تمدنی اور تہذیبی تناظر میں دیکھتی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ نعت سنتِ رسولؐ کے تتبع میں معاشرتی اکائیوں کو ایک وحدت میں پرونے کا نام ہے جس کی بنیاد خُلق و وفا کی قدروں پر رکھی جاتی ہے اور جہاں فتنہ گری، جفا شعاری، تفرقہ اور انتشار کی کوئی گنجایش نہیں ہوتی بلکہ یہ تو سیرت الرسولؐ کی پیروی میں لاچاروں کی چارہ گری کا نام ہے اور اس عمل میں انسان بیخود ہو جاتا ہے۔ اور نہ ہو سکے تو ندامت میں ڈوب جاتا ہے۔اس طرح نعت مدحتِ رسولؐ سے آگے بڑھ کر ایک ستایشی معاشرتی رویہ بن جاتا ہے۔ اس ضمن میں درج ذیل اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

بہارِ نعت پیامِ امن ہے لوگوں کو
کہ اِس نگر میں کوئی فتنہ گر نہیں ہوتا
بہشتِ نعت میں رہتے ہیں اہلِ خُلق و وفا
جفا شعار کا اس میں گذر نہیں ہوتا
حصارِ نعت بچاتا ہے تفرقوں سے ہمیں
یہ کوہسار ہے زیر و زبر نہیں ہوتا
سرودِ نعت مداوا ہے غم نصیبوں کا
وہ لوگ جن کا کوئی چارہ گر نہیں ہوتا

ان کے نزدیک نعت غلامانِ رسول کا ایک اخلاقی رویہ ہے۔ محبت رسولؐ کی کیفیت میں ڈوب کر وہ صفائے قلب اور اخلاقی پاکیزگی کو زندگی کی بنیاد بنا لیتے ہیں۔ پھر ان کا ہر عمل کیفیتِ نعت میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔

جو ہو حضورؐ سے نسبت تو نعت ہوتی ہے
ملی ہو آپؐ کی شفقت تو نعت ہوتی ہے

غمِ رضا ہو، ندامت ہو، خوفِ عقبیٰ ہو
ہو لب پہ حرفِ صداقت تو نعت ہوتی ہے
روشن رہے معارفِ سیرت کی کہکشاں
اوراقِ جاں پہ اسمِ محمدؐ لکھا رہے

ندامت شیخ دباغ کی نعت کا ایک اساسی رویہ ہے۔ وہ ہمیں جابجا ندامت میں ڈوبے ملتے ہیں۔ اور اپنے اشکِ ندامت کو خراجِ تحسین پیش کرتے نظر آتے ہیں۔ ایک نجی محفل میں جہاں ان سے 'شکر' کے حوالے سے اظہارِ خیال کے لئے کہا گیا تو کہنے لگے، 'میں تو ابھی ندامت ہی سے باہر نہیں نکلا۔' چنانچہ ندامت ان کے نعتیہ کلام میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔

دنیا کی آرزو ہے نہ نمود کی طلب ہے
مرا نام ہے ندامت، شرمندگی نسب ہے
چھپاتا کس طرح چہرہ گنہ آلود ہاتھوں سے
بڑا احسان ہے مجھ پر مرے اشکِ ندامت کا

سرکارِ دوعالم ﷺ کی نعت کا تخلیقی اور اعتقادی سفر جاری ہے اور قیامِ حشر کے بعد بھی جاری رہے گا۔ قیامت کا دن شافعِ محشر ﷺ، ساقی کوثر ﷺ حضور رحمت عالم ﷺ کی عظمتوں اور رفعتوں کے ظہور کا دن ہے۔ مالکِ روز جزا اپنے محبوب رسول ﷺ کو مقامِ محمود پر فائز فرمائے گا۔ نفسا نفسی کا عالم ہوگا۔ سورج سوا نیزے پر آگ برسا رہا ہوگا۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی اور رسول اپنی امتوں کے ہمراہ تاجدارِ کائنات ﷺ کے خیمۂ عافیت کی تلاش میں نکلیں گے۔ حاضرِ خدمت ہوکر عرض گزاریں گے کہ یا رسول اللہ، اللہ رب العزت کی بارگاہ میں جلد

حساب کتاب شروع ہونے کی دعا فرمایئے، روزِ محشر سب سے پہلے حضور ﷺ کی شفاعت قبول کی جائے گی۔ سب سے پہلے حضور ﷺ جنت میں داخل ہوں گے۔ میرا وجدان کہتا ہے کہ خلد بریں کی فضائیں خلدِ مدینہ کی خوشبوؤں سے مہک رہی ہوں گی، میثاق ایک محفل میلاد ہی تو ہے۔ اس پس منظر میں صاحبِ مطافِ نعت کا یہ قطعہ ملاحظہ فرمایئے۔

ہر لب پہ ہے ستایش عظمت حضور ﷺ کی
اللہ کا کلام ہے سیرت حضور ﷺ کی
ہوتی رہے گی قبر میں مشقِ سخن عزیزؔ
محشر میں ہوگی محفلِ مدحت حضور ﷺ کی

قبر میں مشقِ سخن کی آرزو بھی ایک تخلیقی عمل ہے۔ اپنے مجموعہ نعت کے لئے مطافِ نعت جیسی ترکیب بھی اسی تخلیقی عمل کا ایک حصہ ہے، قلم وابستگی کے نور میں ڈوبا ہوا ہے اور خوشبوئیں طوافِ قلم میں مصروف ہیں، والہانہ پن کی خوبصورت مثال:

اک بندۂ حقیر تھا میں معتبر ہوا
سرکارِ دو جہاں پہ سلام و درود سے
سر ہو درِ حبیب ﷺ پہ رکھا ہوا عزیزؔ
رشتہ نہ پھر رہے کوئی سر کا وجود سے
میری اوقات کیا پوچھتے ہو میں ہوں خاشاکِ دنیا کا سایہ
مجھ کو بوسے دیئے قدسیوں نے میں مدینے گیا اور آیا

گزشتہ صدی بھی توصیفِ مصطفیٰ کی صدی تھی، اکیسویں صدی بھی نعت حضور ﷺ کی صدی ہے، آنے والی ہر ساعت حضور ﷺ کی نعت کا پرچم اٹھائے ہوئے ہوگی۔ کائنات کی لامحدود وسعتیں رسولِ اول و آخر ﷺ کے تذکار سے زرفشاں ہونگی۔ پھولوں کی

بارش ہو رہی ہوگی اور ان پھولوں میں ''مطافِ نعت'' کے پھول بھی شامل ہوں گے:

نعت شانِ مصطفیٰ کے حسن کا ادراک ہے
نعت ہے اُنؐ کے درِ اقدس کو جا کر چومنا

شیخ عبدالعزیز دباغ کی نعت ندرتِ فکر اور مضمون آفرینی کے حوالے سے اپنی الگ پہچان رکھتی ہے۔ ''مطافِ نعت'' خوبصورت اور دلآویز اشعار کا مرقع ہے، شاعر کے آنسو لفظ لفظ میں فروزاں ہیں۔ الفاظ کا در وبست یوں ہے جیسے انگوٹھی میں نگینہ، ''مطافِ نعت'' کا قاری قلم کی جولانیوں اور اظہار کی روانیوں میں کھو جاتا ہے۔ اندازِ فکر جداگانہ، طرزِ بیان دلکش، اسلوب منفرد، ابہام و گنجلک پن کا نام ونشان نہیں، بلاغت اور فصاحت کی کہکشاں دور دور تک معانی کی ترسیل میں مصروف، تفہیم کی چاندنی کا رقصِ مسلسل اپنی مثال آپ، عجز کی چادر اوڑھ کر شاعر خود حرفِ سپاس بن جاتا ہے، حرفِ دعا اس کے ہونٹوں پر پھول بن کر کھل اٹھتے ہیں۔ یاسیت کے پس منظر میں رجائیت کا سورج پورے وقار اور تمکنت سے طلوع ہوتا ہے۔عظمت رفتہ کی بازیابی کی ترغیب ملتی ہے، وہ عظمتِ رفتہ جس کی تلاش میں صدیوں سے کاروانِ شوق راہِ عشق پر رواں دواں ہے۔ آشوبِ عصر شیخ عبدالعزیز دباغ کی نعتیہ شاعری میں کربِ مسلسل کی صورت میں جلوہ گر ہے۔

چمن میں ہر کلی پر حبس کے موسم کا پہرا ہے
اندھیرے چھائے ہیں ہر سو اغثنی یا رسول اللہ
ہوائے نفس کی خاطر یہ ایماں بیچ دیتے ہیں
یہ قرآں بیچ دیتے ہیں، دہائی یا رسول اللہؐ
تمازت، نفسا نفسی، بے حسی، اک حشر برپا ہے
غلاموں کے سروں پر کالی کملی یا رسول اللہ

الحاد و کفر پھر نئی صف بندیوں میں ہیں
بے کس ہے بے نوا ہے مسلمان یا نبی

شیخ عبدالعزیز دباغ کے شعری وژن میں اپنے عہد کی دانش نمو پذیر ہے۔ عصری شعور سے آشوبِ عصر تک جذبوں کی ان گنت کہکشائیں روشنیاں بکھیرنے پر مامور ہیں۔ مضامینِ نو کا تنوع ان کی نعتیہ شاعری کو انفرادیت کا رنگ دیتا ہے۔ یقیناً یہ ایک غیر معمولی بات ہے۔ تسخیرِ کائنات کے ساتھ تسخیرِ قلوب کا عمل بھی جاری ہے زنگ آلود لمحوں کا دامن شفاف آئنوں سے مزین کیا جا رہا ہے۔ تازہ ہوائیں مقفل دروازوں پر دستک دیں تو کواڑ خود بخود کھلنے لگتے ہیں۔ ان کے ہاں یہ عمل تواتر سے جاری ہے۔ افکارِ تازہ کی نمود کا منظر کیا سہانا منظر ہے، شاعر کی سوچ آفاقی سچائیوں سے ہمکنار ہوکر احساسات ومحسوسات کی الگ دنیا آباد کرنے کی آرزومند ہے۔ آپ جدید طرز احساس کے شاعر ہیں۔ ''مطافِ نعت'' اس احساس کا وہ آئینہ ہے جس کا ہر عکس درِ مصطفیٰ سے روشنی کی بھیک مانگتا دکھائی دیتا ہے۔ سرکار ﷺ کی یادوں میں بھیگنے کا عمل ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں رکتا۔

وہاں جنت کی نہروں میں یہی تو بہہ رہا ہوگا
جو ملتا ہے غلاموں کو سکوں جاکر مدینے میں
مدینے کی ہوائیں دل کے تالے توڑ دیتی ہیں
تمنا ہے ہوا بن کر چلوں جاکر مدینے میں
میں جب بھی آنکھ کھولوں گنبد خضرا نظر آئے
کبوتر روح کا بن کر اڑوں جاکر مدینے میں
لگیں میرے تنے پر بھی کھجوریں یا رسول اللہ
میں مدحت کی کھجوریں بانٹ دوں جاکر مدینے میں

عہد رسالت مآب ﷺ میں شعرائے دربارِ رسول ﷺ، حضرت حسان بن ثابتؓ، حضرت عبد اللہ بن رواحہؓ اور حضرت کعب بن زہیرؓ نے نعتِ رسول سے دفاعِ رسول ﷺ کا کام بھی لیا تھا۔ کفار و مشرکین کے شعرا کی ہرزہ سرائیوں کے جواب میں شعرائے رسول نے علمی و ادبی حوالے سے ان کا جواب دیا تھا کیونکہ دفاع رسول ﷺ ہی دفاع اسلام ہے آج اکیسویں صدی کا نعت گو بھی نعت کے اس روشن پہلو کو نظر انداز کرنے کی جسارت نہیں کر سکا۔ یہ رنگ استغاثے کی صورت میں مزید نمایاں ہوا ہے۔

فروغِ عہدِ رسالت کا اہتمام کرو
کہ رات ظلم کی اتری ہوئی وطن میں ہے
نکل نہ آئے کہیں آفتاب مغرب سے
کہ کارروا‌ں تو ابھی راہِ پر فتن میں ہے

صبا مدینے سے آئی ہے روشنی لے کر
چراغِ دل کو صبا آشنا کرو اب بھی
حضور آپؐ کی امت کے کارواں کی خیر
کہ راہزن ہیں نہاں بن کے راہرو اب بھی
فصیلِ شہر پہ لکھا ہے گرچہ کل کا عذاب
درِ نجات کھلا ہے ستمگرو اب بھی

''مطافِ نعت'' کے شاعر نے خوبصورت استعارے، تشبیہات، تلمیحات اور علامتوں سے اپنے شعری وژن کو پرکشش اور جاذب نظر بنایا ہے، نئی نئی تراکیب دامن دل کو کھینچتی ہیں۔

شہدِ ثناء کا میرے دہن میں وہ نور ہو
جو نطقِ جبرئیل تھا قدمینِ پاک میں

یادِ درِ حبیب کا احرام باندھ کر
ذوقِ سخن ثناء کی سعی میں لگا رہا

زرِ ثنائے نبی کاسۂ سخن میں ہے
نزولِ آیۂ صد انبساط فن میں ہے

یہ کوئی درد نہیں، لہر جو بدن میں ہے
کہ اُن کی یاد کا جھونکا مرے چمن میں ہے

ہیں ذرے ذرے میں روشن دیئے مشقّت کے
تھکن کی لَو سے چراغاں حریمِ تن میں ہے

درِ نبیؐ پہ حضوری کو نعت کہتے ہیں
جو بے حضور ہو، اہلِ نظر نہیں ہوتا

نبیؐ کی یاد میں اک کیفِ بیخودی ہے نعت
جو بے خبر نہ ہو اہلِ خبر نہیں ہوتا

درِ نبیؐ پہ ندامت کو نعت کہتے ہیں
جو شرمسار نہ ہو درگذر نہیں ہوتا

عطائے جنت ماویٰ ہے انتہائے کرم
غلام کے لئے محبوب ﷺ کی گلی ہے بہت

ہر ایک شخص مدینے میں ہنس کے ملتا ہے
وہاں کی آب و ہوا میں شگفتگی ہے بہت

کہ اس سے جلتے رہیں یادِ مصطفیٰ کے چراغ
مرے لئے میرے اشکوں کی یہ جھڑی ہے بہت

پاکستان خطہ ''لا الہ'' ہے، قریۂ عشق محمد ﷺ ہے، آج ارضِ پاک اغیار کی چیرہ دستیوں کا ہدف بنی ہوئی ہے۔ برف پوش پہاڑوں پر آگ برس رہی ہے، دریاؤں میں تشنگی بہہ رہی ہے، چشمے اپنا ہی خون اگل رہے ہیں، مساجد کا تقدس پامال کیا جا رہا ہے۔ بے گناہ لوگ لقمۂ اجل بن رہے ہیں، وطن عزیز اندھیروں میں ڈوبا ہوا ہے۔ شاعر دل برداشتہ ہوکر پکار اٹھتا ہے۔

ناحق لہو سے تر ہے قبائے وطن حضور ﷺ
نگہِ کرم، حصارِ حفاظت عطا کریں

سارے چراغ بجھ گئے، بے نور ہے وطن
آقا! جہانِ نور کی طلعت عطا کریں

ملت کے نوجوان پریشان ہیں بہت
مولا انہیں یقین کی قوت عطا کریں

مولیٰ! وطن کی آبرو شعلوں کی زد میں ہے
نگہِ کرم کہ ساعتِ ابتر قریب ہے

اے دستِ غیب! وحدتِ ملت ترے سپرد
ظالم کا ہاتھ رگ پہ ہے نشتر قریب ہے

حضور ﷺ ہمارے ماویٰ وملجا ہیں، شفقت اور محبت کا پیکر ہیں، عفو و درگزر آپ ﷺ کی فطرتِ عالیہ کا ایک دلآویز پہلو ہے۔ ازل سے ابد تک سارے زمانوں اور سارے جہانوں کے آقا ﷺ ہیں، پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ ﷺ کے امتی اپنے ذاتی مسائل حضور ﷺ کی بارگاہِ بیکس پناہ میں پیش کر کے چشمِ کرم کے ملتجی نہ ہوں، حضور ﷺ سے اپنے ذاتی دکھوں کا مداوانہ چاہیں، اس لئے کہ ہم رسول ماضی کے نہیں رسول زندہ کے امتی ہیں اور بارگاہِ خداوندی میں بھی التجا کرتے ہیں کہ مولا! حضور ﷺ کے قدموں کی ساری خیرات ہماری جھولی میں ڈال دے، شیخ عبدالعزیز دباغ کی نعت میں ذاتی حوالہ مختلف انداز میں نمو پذیر ہوا ہے ''حضور ﷺ نگہِ کرم'' میں اپنی اہلیہ محترمہ کے ''گوشۂ درود'' کے بند ہوجانے کا المیہ بیان کرتے ہیں۔ ''گوشہ درود'' کے دوبارہ آباد ہونے کی التماس کرتے ہیں۔

حضور ﷺ پھر سے کھلے گوشۂ درود کا در
حضور ﷺ پھر سے لکھے جائیں نام پتوں پر

ایک دوسری نظم ''حضور ﷺ آپ کی باندی فشارِ غم میں ہے'' میں ''گوشہ درود'' کے حوالے سے آنسوؤں کے چراغ جلتے دکھائی دیتے ہیں۔

ہے التماس کہ اس کو سکون مل جائے
وہ بے قرار ہے اس کو قرار مل جائے

برستی آنکھوں کو دیدارِ نور مل جائے
وفورِ شوقِ نبی ﷺ کو سرور مل جائے
ندائے کرب کو آوازِ طور مل جائے
پھر اس کو آپ ﷺ کی بزمِ درود مل جائے

میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ نعت کائنات ہے اور ہم غلامان رسول ہاشمی کائناتِ نعت میں زندہ ہیں۔ اللہ جل شانہ کے بعد ہمارا ہر حوالہ حضور ﷺ سے شروع ہو کر حضور ﷺ پر ختم ہوجاتا ہے۔ ہمیں بزمِ درود میں سانس لینے کا لازوال اعزاز حاصل ہے اور ہم اپنے اس شرف پر جتنا بھی ناز کریں کم ہے، ہم سنتِ ربِ جلیل پر چلنے والے غلامِ مصطفیٰ ہیں۔ درود ونعت کا گلشن ہر لمحہ ہمارے ہونٹوں پر کھلا رہتا ہے، شاعر 'مطافِ نعت' کہتا ہے۔

ذکرِ نبی ﷺ کی اتری ساعت میں چاندنی
گلشن درود و نعت کا لب پر کھلا رہا
سرکار ﷺ ڈالتے رہے دامن میں رحمتیں
نادم خشوع و عجز میں در پر جھکا رہا

مصرعے مترنم لہروں کی طرح محوِ ثنا ہیں، بعض مصرعے تو ضرب المثل بنتے دکھائی دیتے ہیں، تزئینِ حرف وصوت کے تحفے بھی اسی درِ عطا سے ملتے ہیں۔ ذوقِ سخن ثنائے حضور ﷺ کی سعی میں مصروف رہتا ہے۔ درود وسلام کے گلاب کھلتے ہیں تو بادِ بہاری وجد میں آجاتی ہے، دل حضوری کے لئے مچل مچل جاتا ہے۔ آنسو ورق پر پھیل کر حرفِ التجا بن جاتے ہیں۔

مرے پاس ہوتا قلم اگر تو مَیں لکھتا آقا کی مدحتیں
مرے حرف میں نہیں وسعتیں مری صوت محرمِ غم نہیں

کہاں شاعری کی لطافتیں، کہاں استعارے رعائتیں
جو مطافِ شعر میں ہو رواں، وہ ہجومِ بیت الحرم نہیں
ہو قیامِ نعت حطیم میں، کھلے لب پہ مدحت کی چاندنی
میں رہوں ہمیشہ طواف میں مگر ایسے میرے قدم نہیں
مجھے نعت لکھنی ہے آپؐ کی، مرے پیارے آقاؐ، مرے نبیؐ!
مجھے دیں وہ لفظوں کا بانکپن جو قلم میں ہے، وہ قلم نہیں

ارشادِ خداوندی ہے اے محبوب ﷺ اگر تجھے پیدا کرنا مقصود نہ ہوتا تو نہ یہ زمین ہوتی نہ آسمان، نہ چاند ہوتا نہ ستارے۔ گویا کائنات کی ہر چیز حضور ﷺ کے قدموں کا صدقہ ہے۔ شیخ عبدالعزیز دباغ کی نعت اسی مرکزی نقطے کی شعری تفسیر ہے۔ یہ حیاتِ چند روزہ بھی حضور ﷺ کے قدموں کا صدقہ ہے، ہماری دوستی ہماری دشمنی سب کی بنیاد حضور ﷺ کی ذاتِ اقدس ہے۔ کیا خوبصورت شعر ہے:

میری کسی سے کوئی عداوت نہیں مگر
میرے تعلقات کی بنیاد ہیں نبی ﷺ

مزید اشعار ملاحظہ فرمایئے اور غزل کی خوبصورتیوں کو درِ اقدس پر دامن پھیلائے دیکھئے۔

نعت کی رت میں شرابور فضا لگتی ہے
خوب برسے گی مدینے کی گھٹا لگتی ہے
ہے مجھے شام ڈھلے آپ ﷺ کے در کی خواہش
قبر کی رات شبِ بزمِ ثنا لگتی ہے

اس سے آنکھوں میں اُمڈ آتے ہیں ساون بھادوں
یادِ عصیاں مجھے پچھّم کی ہوا لگتی ہے

درودوں کے گجرے اور سلاموں کی ڈالیاں ازل ہی سے آقائے محتشم ﷺ کی بارگاہِ اقدس میں عرض پرداز ہیں، مشامِ جاں ازل ہی سے حرفِ ثنائے سرمدی کے پھول کی خوشبو سے معطر ہے، ہوائیں ازل ہی سے جھک کر آقا حضور ﷺ کے دربار پرنور میں سلامِ شوق پیش کر رہی ہیں۔ ہر روز مواجۂ اقدس میں کتنے ہی خوش نصیب حاضرین خلعت فاخرہ سے سرفراز ہوتے ہیں اور آقائے نامدار ﷺ کی خدمتِ اقدس میں ہدیہ درود و سلام پیش کرتے ہیں، فرشتے قطار اندر قطار صبح و شام آسمانوں سے اترتے ہیں۔ درودوں اور سلاموں کے سدا بہار پھولوں سے مضافات مدینہ ہی نہیں کائنات کا گوشہ گوشہ مہکنے لگتا ہے۔ صاحبِ ''مطافِ نعت'' نے بھی اپنے اشکوں کو حروفِ سلام میں منتقل کیا ہے۔ جذبوں کی رعنائی لفظ لفظ میں رقصاں ہے، ان کا قاری بھی کیف و سرور کی فضاؤں میں گم ہوجاتا ہے۔

سب ہیں تجلیات کا پرتو لئے ہوئے
شہرِ نبیؐ کے سب در و دیوار کو سلام
خلوت گہِ رسولؐ وہ بعثت گہِ نبیؐ
انوارِ مصطفیٰؐ کے امیں غار کو سلام
آنکھیں خنک مناظرِ خضرا سے تر رہیں
کرتی رہیں حضور ﷺ کے دربار کو سلام

یہود و نصاریٰ، آج بھی اسلام اور صاحبِ اسلام کے خلاف گھناؤنی سازشوں میں مصروف ہیں۔ نام نہاد علمی تحقیق کی آڑ میں فکری مغالطوں اور علمی بد دیانتیوں کے

خوف تخلیق کئے جا رہے ہیں۔قرطاس وقلم کے تقدس کو پامال کیا جا رہا ہے۔ طائف کے اوباش لڑکوں کے شیطانی قہقہوں کی بازگشت کبھی گستاخانہ خاکوں کے روپ میں سنائی دیتی ہے، کبھی گستاخانہ فلم کی صورت میں سماعتوں میں زہر گھولتی نظر آتی ہے۔ نائن الیون کے بعد تو مخالفانہ پروپیگنڈے کا ہدف صرف اسلامیان عالم کو ٹھہرایا گیا۔ لفظ مسلمان کو دہشت گردی کے مترادفات میں شامل کر کے ان استحصالی اور طاغوتی طاقتوں نے اپنے خبث باطن کا مظاہرہ کیا۔گویا اپنی روشن خیالی پر اپنے اندر کی کالک مل لی، شیخ عبدالعزیز دباغ نے ان فکری مغالطوں،علمی لغزشوں اور ابلیسی سازشوں پر مطافِ نعت میں شدید ردِعمل کا اظہار کیا ہے۔ اسلامیانِ عالم کی بےحسی پر صف ماتم بچھاتے ہیں۔قرطاس وقلم خون کے آنسوؤں میں ڈوب جاتے ہیں۔

آج کے بو لہب کے بھی ہاتھ ٹوٹیں یا خدا
آج بھی بو لہب پر شعلے گریں شام و سحر
ابرہا نکلا ہے بن کے آج گستاخ رسول
آج بھی ان پر ابابیلیں اڑیں شام و سحر
آج بھی ابنِ ابیٔ پر قہر ٹوٹے رات دن
اس کی پھر تذلیل کے دوزخ جلیں شام و سحر

''مطافِ نعت'' اکیسویں صدی کی دوسری دہائی میں نعتیہ ادب میں ایک گرانقدر اضافہ ہے شاعر نے انفرادی دکھوں کے ساتھ اجتماعی محرومیوں کو بھی نعتِ حضور ﷺ کا حصہ بنایا ہے اور تمام تر جمالیاتی قدروں کی پاسداری کرتے ہوئے ہمیشہ زندہ رہنے والے اشعار تخلیق کئے ہیں۔فکری اور نظری توانائیوں کی ایک کہکشاں قرطاس وقلم کے طواف میں مصروف ہے۔ یہ لہجہ اس صدی کا توانا لہجہ ہے۔ کائناتی سچائیوں، آفاقی صداقتوں اور زمینی حقیقتوں کا مظہر ہے۔ شیخ عبدالعزیز دباغ نے سوچ اور اظہار کے نئے امکانات کی نشاندہی

کی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ حرفِ پذیرائی اس نئے لہجے کا مقدر بنے گا۔ شاعر کے اس التجائیہ شعر پر آمین کہتے ہوئے اپنی گزارشات کو سمیٹتا ہوں۔

گناہگار ہوں اور لغزشوں پہ نادم ہوں
غمِ رضائے نبیؐ سے فگار رہتا ہوں
ہے آرزو کہ بٹھا لیں وہ اپنے قدموں میں
یہ التجا سرِ مژگاں سجائے رکھتا ہوں

شہر اقبال
11 دسمبر 1912

ریاض حسین چودھری

# نعتیہ مجموعوں پر
# تبصرے

# حسان بن ثابتؓ کے آثار قلم کو چومنے والا

# بے مثال مدحت نگار

(نشاط احمد شاہ ساقی نے جناب محمد علی ظہوریؒ کے کے کلام کا انتخاب ''ثنا خوانِ رسول'' ترتیب دیا اور ۱۹۹۴ء میں شائع کیا جس پر ریاض حسین چودھریؒ نے یہ محبت سے معطر تحریر لکھی۔)

حقیقت یہ ہے کہ قصرِ ایمان کی بنیاد ہی حضورؐ کی محبت ہے اور یہی محبت ہم غلاموں کا سرمایہ حیات ہے، یہی ہمارا توشۂ آخرت ہے اور یہی ہمارا زادِ سفر ہے۔ دلوں کا سارا گداز اور روحوں کا سارا سوز اسی پیکرِ دلنواز کے قدموں کی دھول ہے۔ تمام الہامی صحیفے بزمِ رسالت کے اسی تاجدار کے محامد و محاسن کی قندیلیں لیے آسمانوں سے اترتے ہیں۔ آج بھی اقلیمِ ارض و سماوات میں اس مشہورِ مطلق کی حکمرانی ہے، بحر و بر میں اسی امام مرسلاں کی عظمت کا سکہ رواں ہے۔ اقبالؒ نے جس روح محمد کی طرف اشارہ کیا تھا وہ یہی عشق مصطفیٰ ہے، یہی محبت رسول ہے، یہی نسبتِ تاجدار کون و مکاں ہے، خیمۂ عشق میں ازل سے یہی چراغِ جاوداں روشن ہے۔ ابد تک کائناتِ رنگ و بو اس نور سے مستنیر ہوتی رہے گی اور دھنک کے سارے رنگ اسی آستانِ عطا سے نور کی خیرات لیتے رہیں گے۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو سنتِ ربِ جلیل کو اپنی زندگیوں کا اوڑھنا بچھونا بناتے ہیں، ممدوح رب دو جہاں کے گیت گاتے ہیں، جن کے قلم کی نوک پر صل علیٰ کا نغمہ مچلتا ہے اور پسِ مژگاں سروِ چراغاں کا اہتمام ہوتا ہے جن کی سانسیں خوشبوئے اسم محمد سے معطر رہتی ہیں، جن کی نظریں چشم تصور میں بھی طوافِ گنبد خضرا میں مصروف رہتی ہیں اور جو ہر وقت ہر گھڑی اور ہر لحہ دیوارِ مدینہ کے خنک سایوں اور وادیِ بطحا کی خوشبوؤں سے لبریز ہواؤں

سے ہمکلام ہونے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔

محمد علی ظہوری بھی اسی خوش قسمت قبیلے کے فرد ہیں، اسی گروہ عاشقاں کے رکن ہیں جن کے سردار، شاعرِ دربارِ رسالت سیدنا حسّان بن ثابتؓ ہیں۔ محمد علی ظہوری، فروغِ حمد ونعت کے حوالے سے ایک معتبر نام ہے، جن کی کل کائنات نعت ہے، جن کا کل سرمایہ توصیفِ مصطفیٰؐ ہے، اللہ کے بعد جن کا ہر حوالہ حضورؐ سے شروع ہوکر حضورؐ پر ختم ہوجاتا ہے، جن کا سینہ عشقِ مصطفیٰ کا خزینہ ہے، پلکوں پر جھلملانے والا ہر آنسو بے مثل نگینہ، ظہوری صاحب سچ مچ اپنی ذات میں انجمن، صلہ و ستائش سے بے نیاز، تاجدار کائنات کی ثنا میں مصروف، محمد علی ظہوری، حسان بن ثابتؓ کے آثار قلم کو چومنے والے ایک شاعرِ بے مثال، نعت لکھنے اور نعت پڑھنے میں اپنا جواب آپ، ایک فرد نہیں ایک تحریک کا نام، یہ تحریک دہر میں اسم محمدؐ سے اجالا کرنے کی تحریک، یہ تحریک گھر گھر عشقِ مصطفیٰ کے چراغ تقسیم کرنے کی تحریک۔ یہ کیا کم اعزاز ہے کہ محافل میلاد میں اکثر و بیشتر آپ کا کلام پڑھاجاتا ہے اور پسند کیا جاتا ہے۔ آپ علمی، ادبی اور دینی حلقوں میں نعت کے حوالے سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ آپ کو حسّانِ پاکستان کے لقب سے نوازا گیا۔ اس اعزاز اور اس حوالے کے بعد کسی دوسرے اعزاز اور حوالے کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ ان کی شاعری عوامی سطح پر اتر کر حریمِ دیدہ و دل میں چراغ سجاتی ہے۔ سادگی، بے ساختگی اور خودسپردگی ان کے شعری وژن میں ان گنت خوبصورت اور دلکش مناظر ترتیب دیتی ہے اور آوازوں کے ہجوم میں شاعر کو انفرادیت کا رنگ عطا کرتی ہے۔ محمد علی ظہوری کی نعت کے انہی اوصاف کی بدولت ان کا سامع اور قاری بھی شہرِ ہجر کی فصیلوں پر کھڑے ہوکر دل کی آنکھوں سے گنبد خضرا کے میناروں کا نظارہ کرلیتا ہے۔ یہ قاری اور سامع کو اپنے ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ چشمِ تصور میں انگلی پکڑ کر حضورؐ کی دہلیز تک لے جاتے ہیں۔ ان کی نعت کی سب سے بڑی خوبی بھی یہی ہے جو بہت کم لوگوں کا حصہ بنتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے فن کو مزید رفعتیں عطا فرمائے اور ان کے ایک ایک لفظ کی بارگاہِ رسالت مآبﷺ میں پذیرائی ہو کہ پذیرائی کا یہی لفظ ہم غلاموں کے ہونے کی سند جواز ہے۔

# یہ عہد بھی حفیظ تائب ہی کا عہد ہے

مدحت (حفیظ تائب نمبر) مدیر: سرور حسین نقشبندی

زمانہ طالب علمی کا ایک شعر ہے:

اب آپ بھی خیال میں آتا نہیں کبھی
چہرے کئی اتر گئے لوحِ خیال سے

لیکن بعض چہرے ایسے بھی ہوتے ہیں جو لوح خیال سے کبھی نہیں اترتے بلکہ عمر بھر یادوں کے جھروکوں میں فروزاں رہتے ہیں۔ ان چہروں کی روشنی کبھی مدھم نہیں ہونے پاتی۔ ہم انہیں بھلانا بھی چاہیں تو نہیں بھول سکتے۔ حفیظ تائب کا شمار انہی تابندہ چہروں میں ہوتا ہے۔ میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ فکری اور نظری رشتے خون کے رشتوں سے بھی زیادہ مضبوط و مستحکم اور پائیدار ہوتے ہیں۔ ماہ و سال کی گرد بھی ان آئنوں کو دھندلا نہیں سکتی۔ گزشتہ روز حلقۂ احباب میں یہ بحث چھڑی ہوئی تھی کہ ہم غلامانِ مصطفیٰ کے درمیان نہ کوئی خونیں واسطہ ہے نہ پرانی دوستی ہے نہ برادری کا کوئی حوالہ ہے۔ پھر آخر کیا قدر مشترک ہے کہ ہم ایک دوسرے کو سگے بھائیوں سے بھی زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ یہی نا کہ ہم غلامی رسول کے لازوال رشتے کی ڈور میں بندھے ہوئے ہیں۔ یہ رشتہ سب رشتوں سے مضبوط اور پائیدار ہے۔ یہ مقدس رشتہ لفظ زوال سے آشنا ہی نہیں۔ حفیظ تائب کے ساتھ دوستی کی بنیاد یہی محبت رسول ہے۔ یہ حوالہ اتنا مضبوط اور پائیدار ہے کہ موت بھی اس مضبوط رسی کو توڑنے سے قاصر ہے۔ حفیظ تائب کی زندگی ہی میں مَیں نے کہا تھا:

تائب کو ساتھ لے کے سرِ حشر میں ریاضؔ
آقا حضورؐ کو نئی نعتیں سناؤں گا

یہ نعت مرحوم کی زندگی ہی میں غالباً خالد احمد کے ''بیاض'' میں چھپی تھی۔ اب میں نہیں جانتا کہ یہ نعت حفیظ تائب کی نظر سے گزری تھی یا نہیں۔ اگر گزری تھی تو وہ ضرور مسکرا کر اشکبار ہوگئے ہوں گے۔ آقائے محتشم ﷺ کا اسم گرامی لبوں پر پھول بن کر کھلتا تو حفیظ تائب کی پلکوں پر ستارے سے چمکنے لگتے۔ چشم تر حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں حرف التجا بن جاتی۔ اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ آپ حفیظ تائب کو کب سے جانتے ہیں تو میں یقیناً اس کا کوئی جواب نہیں دے سکوں گا۔ بعض اوقات صدیوں کے فاصلے لمحوں میں سمٹ جاتے ہیں اور اکثر اوقات لمحوں کے فاصلے صدیوں میں بھی طے نہیں ہو پاتے۔ یہ غالباً آج سے چالیس سال پہلے کی بات ہے۔ حفیظ تائب ابھی باریش نہیں تھے۔ سید آفتاب احمد نقوی شہید، انور جمال، گلزار بخاری، محمد یونس حسرت اور شفیع ضامن ان دنوں شہر اقبال ہی میں مقیم تھے۔ یہ شہر اقبال کی مجلسی زندگی کا سنہری دور تھا۔ غریب خانے پر ہر سال شب میلاد و نعتیہ محفل مشاعرہ ہوا کرتی تھی جس میں شہر اقبال کے علاوہ دوسرے شہروں سے بھی نعت کے ممتاز شعراء شریک ہوتے۔ مشاعرہ کے اختتام پر سب حاضرین اور شعراء ''میلاد ڈنر'' میں شریک ہوتے۔

اب سن مجھے یاد نہیں، ڈاکٹر آفتاب نقوی نے جناح اسلامیہ کالج کے لائبریری ہال میں حفیظ تائب کے کسی نعتیہ مجموعے کی تقریب رونمائی کا اہتمام کیا تھا۔ یہ ربیع الاول کی گیارہ تاریخ تھی۔ تقریب رونمائی کے بعد حفیظ تائب اور دیگر احباب میرے ہاں تشریف لے آئے۔ نماز عشاء کے بعد حفیظ تائب کی صدارت میں نعتیہ محفل مشاعرہ کا آغاز ہوا۔ اب یادداشت ساتھ چھوڑتی جارہی ہے۔ غالباً حافظ لدھیانوی، صوفی محمد افضل فقیر، راجا رشید محمود، منیر قصوری، پروفیسر اکرم رضا، حکیم افتخار محمود فخر بھی شریکِ محفل تھے۔ سب سے آخر میں حفیظ تائب مائیک پر تشریف لائے۔ فرمائش کی گئی کہ وہ نعت سنائیے جو آپ نے مدینہ منورہ میں آقا علیہ السلام کے قدموں میں بیٹھ کر کہی ہے۔ شاعر رسولؐ کی آواز گونجی:

قدموں میں شہنشاہؐ دو عالم کے پڑا ہوں
میں ذرۂ ناچیز ہوں یا بختِ رسا ہوں
دامن مرا دھلوایا گیا عرفہ میں پہلے
پھر درگہ سرکارؐ پہ بلوایا گیا ہوں

حفیظ تائب کی آواز ہچکیوں اور سسکیوں میں ڈوب گئی۔ حاضرین اشکبار آنکھوں سے ایک سچے عاشق رسولﷺ کی وارفتگی کا مشاہدہ کر رہے تھے۔

میرا پہلا نعتیہ مجموعہ ''زرمعتبر'' 1995ء میں شائع ہوا تھا۔ پیشوائی کے نام سے اس کا دیباچہ حفیظ تائب نے تحریر کیا تھا۔ میں ان دنوں تحریک منہاج القرآن کے مرکزی سیکرٹریٹ (لاہور) میں قیام پذیر تھا۔ پندرہ روزہ تحریک لاہور کی ادارتی ذمہ داریاں میرے سپرد تھیں۔ ایک دن دیکھتا ہوں کہ حفیظ تائب میرے کمرے کی طرف آ رہے ہیں۔ اس وقت آصف مسعود رضا میرے ساتھ موجود تھے۔ ہم حفیظ تائب کی پیشوائی کے لیے آگے بڑھے۔ بڑی گرمجوشی سے ملے۔ سلام دعا کے بعد فرمانے لگے۔ میں ''زرمعتبر'' کی پیشوائی ساتھ لیتا آیا ہوں۔ تائب صاحب فون کردیا ہوتا میں دولت خانے پر حاضر ہوجاتا۔ تائب صاحب کے خلوص کے سامنے مزید لب کشائی کی جرأت نہ ہوئی اور پھر نابغۂ عصر حفیظ تائب نے پیشوائی کا ایک ایک لفظ پڑھ کر سنایا۔ یہ ان کی محبت کی محض ایک مثال ہے۔ حفیظ تائب کی پوری زندگی خلوص کی ایسی ان گنت مثالوں سے بھری پڑی ہے۔

# آبِ گریزاں

محمد اقبال منہاس

(محمد اقبال منہاس ریاض حسین چودھریؒ کے زمانۂ طالب علمی کے بہت قریبی دوست تھے۔ مرے کالج سیالکوٹ کے کالج میگزین کے انگلش سیکشن کے ایڈیٹر تھے جب کہ ریاض اردو سیکشن کے مدیر تھے۔ دونوں شاعر تھے اور زمانۂ طالب علمی کے بعد بھی ادبی سرگرمیوں میں برابر شریک رہے۔ محمد اقبال منہاس پھر بیرونِ ملک چلے گئے اور درس و تدریس سے منسلک رہے۔ عین عالم شباب میں ان کی وفات کا غم آج بھی ان کے حلقۂ احباب میں محسوس کیا جاتا ہے۔ ''آب گریزاں'' ان کا شعری مجموعہ ان کی وفات کے سالوں بعد شائع ہوا جس کا سرورق ریاض حسین چودھریؒ نے اپنی وفات سے چند ماہ قبل جنوری ۲۰۱۷ میں تحریر کیا۔)

''رعنائیِ خیال ہاتھ باندھے اقبال منہاس کے درِ تخلیق پر رہتی، خوشبو ان کے دامنِ خیال میں چراغ جلاتی اور نئے موسموں کی نرماہٹ ان کی دنیائے فکر وفن میں رتجگے بناتی۔ قلم اٹھاتے تو پھول جھڑنے لگتے، لب کشا ہوتے تو چاندنی بکھرنے لگتی۔ ورق ورق پر ستاروں کے جھرمٹ اترتے دکھائی دیتے، شعر تو شعر ان کی نثر بھی شعریت کے اطلس و کمخواب میں لپٹی ہوئی ہوتی۔ تنقید کو بھی تخلیق بنا دیتے۔ بلاشبہ اقبال منہاس کا جہانِ شعر رنگوں، روشنیوں اور خوشبوؤں کا ایک بلیغ استعارہ ہے۔ تفہیم کے مقفل دروازوں کو کھلنے میں دیر نہیں لگتی۔ علامتوں کی ایک نئی دنیا ان کے ہاں آباد نظر آتی ہے۔ کومل جذبے اور سندر

آرزوؤں کے قافلے مرحلہ تخلیق سے بادِ صبا کے خوشگوار، جھونکوں کی طرح گزر جاتے ہیں۔ جدید طرزِ احساس کی کرنیں ان کے اندر سے پھوٹتی ہیں کہ داخل کے ساتھ خارج بھی جگمگانے لگتا ہے۔ لاشعور ہی نہیں ان کا شعور بھی مسلسل جاگتا رہتا ہے۔ اُن کا قلم کبھی ضعف کا شکار نہیں ہوا۔

چل دیئے تم بھی مجھے چھوڑ کے تنہا آخر
ساتھ چلتے تو نئی رسم کے بانی ہوتے

اقبال منہاس نے نظم و نثر دونوں میں فرسودگی اور قنوطیت سے اعلانِ بغاوت کیا۔ گھسی پٹی راہوں پر چلنے سے صاف انکار کر دیا۔ اس لئے کہ ایک سچا فنکار اپنی راہیں خود ہی تلاش کر لیتا ہے۔ 63-62-1961 مرے کالج سیالکوٹ کی ادبی فضا، اقبال منہاس اور خواجہ اعجاز احمد بٹ کے دم قدم سے ایک تحریک کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ میں ان دنوں مرے کالج میگزین کے اردو سیکشن کا ایڈیٹر تھا۔

اقبال منہاس سوچ اور اظہار کے نئے دروازوں پر دستک دیتے ہیں لیکن روایت سے کلیتاً کنارہ کشی اختیار نہیں کرتے۔ ان کی جڑیں اپنی مٹی میں پیوست ہیں۔ اور ان کا فن اسی مٹی سے تخلیقی توانائی حاصل کرتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغاز کا تخلیقی سطح پر اعتراف کرتے ہیں۔ اقبال منہاس کسی سطح پر بھی منحرف چہروں کے تاریک جنگل کا حصہ نہیں بنے۔

بیسیویں صدی کی ساتویں دھائی میں جو نئی آوازیں کاروانِ اہلِ قلم میں شامل ہوئیں ان میں اقبال منہاس کی توانا آواز اپنے دلکش اسلوب کے کئی حوالوں سے انفرادیت کا پہلو لئے ہوئے تھی۔ آپ شہرِ تخلیق میں ہوائے تازہ کے خنک جھونکوں کے مانند داخل ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے اربابِ علم وفن کی نگاہوں کا مرکز بن گئے۔ زندگی نے انہیں

مہلت نہ دی۔ رنگوں، خوشبوؤں اور روشنیوں کو سوگوار چھوڑ کر اس مٹی کا کفن اوڑھ لیا جس مٹی کی خوشبو نے ان کے قلم کو رعنائی عطا کی تھی۔ اقبال منہاس دلکش اور خوبصورت شخصیت کے مالک تھے۔ اپنائیت کے دیے ان کی آنکھوں میں روشن تھے، دوستی نبھانا جانتے تھے۔ دلوں کو مسخر کرنے کے ہنر سے واقف تھے، خلوص کی چاندنی ان کے چہرے پر مسکراتی رہتی۔ میں نے انہیں کبھی غصے کی حالت میں نہ دیکھا۔ اکتاہٹ اور بیزاری کا نام ان کی لُغتِ عمل میں شامل ہی نہ تھا۔ آج جبکہ ان کے شعری مجموعے آبِ گریزاں کا فلیپ لکھ رہا ہوں میری آنکھیں ہی نہیں میرا قلم بھی اشکبار ہے۔‘‘

ریاض حسین چودھری

جنوری، ۲۰۱۷ء

# سلکِ محبت

## افتخار احمد خالد کا انتخابِ نعت

## سخنِ اوّل

ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر بیت بازی کے مقابلے سن اور دیکھ کر اکثر یہ تمنا دل میں مچلنے لگتی ہے کہ اگر اربابِ بست و کشاد، حمدیہ اور نعتیہ اشعار پر مبنی بیت بازی کے مقابلوں کا بھی اہتمام کیا کریں تو کیا ہی اچھا ہو، یہ میرے لڑکپن کا زمانہ تھا۔ اُن دنوں ادبی رسائل میں حمد و نعت کی اشاعت کا رواج نہ ہونے کے برابر تھا۔ کبھی کبھار حمد و نعت کو تبرکاً شریکِ اشاعت کر لیا جاتا لیکن ادب کو اپنی جاگیر سمجھنے والے قد آور بونے نعت کو ایک الگ صنفِ سخن ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔ ایسے میں نعتیہ اشعار کے حوالے سے بیت بازی کے مقابلوں کا سوال کون اٹھاتا؟ ڈاکٹر ظہور احمد اظہر، ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی، احمد ندیم قاسمی، حفیظ تائب، عبدالعزیز خالد، ڈاکٹر ابوالخیر کشفی، بشیر حسین ناظم، مظفر وارثی، حافظ مظہرالدین، حافظ لدھیانوی، ڈاکٹر عاصی کرنالی، ڈاکٹر عزیز احسن، محمد جاوید اقبال، ڈاکٹر ریاض مجید اور دیگر اکابرین نعت، نعت کو الگ صنفِ سخن کے طور پر منوانے کی جدوجہد میں مصروف تھے، بعد میں ڈاکٹر خورشید رضوی، سید صبیح رحمانی، تسلیم احمد صابری، محمد اکرم رضا، اویس رضا قادری، ڈاکٹر تحسین فراقی، راجا رشید محمود، سید آفتاب احمد نقوی اور سرور حسین نقشبندی نے اس ضمن میں اجتہادی کارنامے سرانجام دیئے۔

گذشتہ روز منتخب نعتیہ اشعار کا مسودہ ''سلکِ محبت'' دیکھا تو آنکھوں میں روشنی بھر گئی اور اپنی دیرینہ خواہش دائرۂ عمل میں داخل ہوتی دکھائی دی۔ ''سلکِ محبت'' کے مرتب افتخار احمد خالد مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے شعرائے نعت کے ان گنت لہجوں کو

''سلکِ محبت'' میں پرو کر قرطاس وقلم کے سپرد کیا ہے۔ ہر نعت نگار کا اسلوبِ ثنا منفرد اور دلکش ہے۔ نعت روحانی رتجگوں کے لب کشا موسموں کا نام ہے۔ شعروں کے انتخاب کا انحصار مرتب کی پسند پر ہے۔ ''سلکِ محبت'' بھی افتخار احمد خالد کے ذوقِ شعر کی مظہر ہے۔ یہ ذوقِ شعر محبت رسول سے ابلاغ پاتا ہے۔ اور نعتیہ بیت بازی کے مقابلوں کی جملہ ضروریات کو پورا کرتا ہے۔ خوب سے خوب تر کی تلاش کا سفر جاری ہے۔ اشعار کے انتخاب کا دائرہ اردو ادب کے تمام ادوار پر محیط ہونا چاہیے۔ معیاری اشعار کا انتخاب بذاتِ خود ایک تخلیقی عمل ہے۔ کتاب کے مرتب اس تخلیقی عمل سے سرخرو ہوکر نکلے ہیں۔ اب بجا طور پر ان سے حمد یہ اشعار کے انتخاب کی توقع کی جاسکتی ہے۔

ریاض حسین چودھری

شہرِ اقبال، 10 جولائی 2013ء

# ارمغانِ قلم

## عبدالغنی تائبؔ کا مجموعۂ نعت

نعت ہماری ثقافتی اور تہذیبی اکائی کا سب سے بلیغ استعارہ ہے اور تخلیقی، قلبی، روحانی، ایمانی اور وجدانی حوالوں سے آقائے کائنات ﷺ سے اظہارِ غلامی کا مؤثر ترین ذریعہ ہے۔ کائناتی سچائیوں سے لے کر زمینی حقائق تک تمام سربستہ راز اور تمام ظاہری امور اور علوم، مدحتِ مصطفیٰ ﷺ کی قلمرو میں شامل ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم غلاموں کا دامنِ طلب وابستگی کے پھولوں سے کبھی خالی نہیں رہا۔ ہر لمحے کے سر پر نسبتِ رسولؐ کا عمامہ باندھا گیا ہے اور ہر ساعت کے ہاتھ میں توصیفِ حضور ﷺ کا پرچم لہرا رہا ہے۔

ہدایتِ آسمانی کی آخری دستاویز قرآن مجید فرقانِ حمید سے اکتسابِ شعور کئے بغیر نعتِ رسولِ اول و آخر ﷺ کے ظہور کا تصور بھی ممکن نہیں۔ قرآن سے نعت گوئی سیکھنے کی آرزو ہر دل میں مدحت کے گہرے خشک پانیوں کو موجزن رکھتی ہے۔ سیرتِ رسول ﷺ کا پہلا ماخذ خود کلام ربی ہے۔ اندر کی روشنی کو ہوائے خلدِ مدینہ سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہوتو دیدہ و دل کے ہر طاق میں چراغِ مدحت خود بخود جلنے لگتے ہیں۔ اشکِ محبت اوراقِ تمنا پر پھیل جاتے ہیں اور کائنات، کائناتِ نعت میں ڈوب جاتی ہے۔ تخیل کے مؤدب پرندوں کو فضائے وادیٔ بطحا میں اڑنے کی اجازت ملتی ہے۔ در و دیوار بھی درود پڑھنے لگتے ہیں۔ آنگن کی چڑیاں بھی درودوں کے گجرے بنانے لگتی ہیں۔ شہرِ قلم میں صلِ علیٰ کے پھول کھلتے ہیں۔ عبدالغنی تائبؔ کو صلِ علیٰ کے انہی سرمدی نغموں کا فیضان عطا ہوا ہے۔ یہ اپنی خوش نصیبی پر جتنا بھی ناز کریں کم ہے۔

نعت کائنات ہے اور عبدالغنی تائبؔ کائناتِ نعت کے سرگرم اور بے لوث کارکن ہیں۔ کارکن اس لیے کہ تخلیقِ نعت کے ساتھ ساتھ فروغِ نعت اور ترویجِ نعت کے لیے بھی

دن رات مصروف رہتے ہیں۔ یہ سعادت بزورِ بازو حاصل نہیں کی جاسکتی۔ یہ توفیقِ خداوندی ہے۔کسی کسی کو توصیفِ مصطفیٰ ﷺ کے لیے چن لیا جاتا ہے۔ ادبی اور دینی حلقوں میں عبدالغنی تائبؔ کے پہلے تین مجموعہ ہائے نعت ''ارمغانِ نیاز''، ''مدنی من ٹھار'' اور ''جانِ رحمت'' کی زبردست پذیرائی کے بعد ''ارمغانِ قلم'' کے نام سے چوتھا نعتیہ مجموعہ شائع ہوا ہے۔

''ارمغانِ قلم'' اکیسویں صدی کی دوسری دہائی میں شائع ہونے والے نعتیہ مجموعوں میں اپنے منفرد اسلوب اور مضامینِ نو کے حوالے سے الگ پہچان کا حامل ہے۔ عبدالغنی تائبؔ کی نعت سنجیدگی، متانت اور شائستگی کی ایک خوبصورت مثال ہے۔ لفظ لفظ میں احترامِ مصطفیٰ ﷺ کے چراغ جل رہے ہیں۔عبدالغنی تائبؔ کے فن کا سورج روایت کی مٹی سے طلوع ہوکر نئے آسمانوں کی تلاش میں ہے۔ ربِ محمد ﷺ قدم قدم پر انہیں مدحتِ رسولؐ کے چاند ستارے عطا کرے۔

ریاض حسین چودھری
شہرِ اقبال
21اپریل 2014ء

# ''نغماتِ عشق'' کا موسمِ دلکش

## ایک حسین انتخابِ نعت

(رشید احمد طاہری اہل اخلاص و محبت میں سے ہیں۔ امریکی ریاست ورجینیا میں دو دہائیوں سے مقیم ہیں۔ انہیں کئی اولیائے کرام کے مزارات کے آس پاس رہنے کا اتفاق ہوا ہے جن میں سیدنا عبدالقادر جیلانی ؓ بالخصوص قابل ذکر ہیں۔ آپ بیت المقدس میں بھی رہے اور وہاں کی روحانی فضاؤں سے کسبِ فیض کیا۔آپ نے والہانہ محبت سے رسول محتشم ﷺ کے مداح نگاروں کا معیاری کلام منتخب کر کے ''نغماتِ عشق'' کے عنوان سے مرتب کیا اور ریاض حسین چودھریؒ نے اس حسین انتخاب کا دیباچہ تحریر کیا۔)

تخلیق آدم سے بھی پہلے سفرِ نعت کا آغاز ہو چکا تھا، لامکاں کی وسعتوں میں ایک ہی نغمۂ تحسین گونج رہا تھا، فضائے بسیط اسم محمدؐ کی ضیا پاشیوں سے منور تھی اور قصرِ محبت کے دریچے نبیٔ آخرالزماںؐ کی تجلیات سے معمور تھے۔ قیامِ حشر کے بعد جنت کی دلکش وادیاں بھی مدحتِ مصطفیٰ کی خوشبوؤں سے معطر ہوں گی کہ بابِ عشقِ محمدؐ میں حرفِ زوال لکھا ہی نہیں گیا، اس لیے کہ ایوانِ نعت میں قندیلِ محبت فروزاں کرنے والی ذات خود خدائے عظیم و قدیم کی ہے جو ہمیشہ ہمیشہ سے ہے اور جسے ہمیشہ ہمیشہ باقی رہنا ہے۔ سیدہ آمنہؓ کے لالؐ سیدنا عبداللہ کے لختِ جگر اللہ رب العزت کی تخلیقِ اول ہی نہیں صناعِ ازل کا وہ عظیم اور بے مثال شاہکار بھی ہیں کہ جن کی کوئی مثال نہ ہماری بزمِ خیال میں ہے اور نہ دکانِ آئینہ ساز ہی میں انؐ کی نظیر ملتی ہے۔ وہؐ رسولِ اولؐ بھی ہیں اور رسولِ آخرؐ بھی۔ تاجدارِ کائناتؐ خدائے بزرگ و برتر کے بندے اور رسول ہیں۔ وہ بندے اور رسول جن

کے سرِ اقدس پر ختمِ نبوت کا تاج سجایا گیا، جنہیں کل جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا گیا، جن کی قدم بوسی کے لیے یہ جہانِ رنگ و بو تخلیق ہوا، جنہیں شافع محشر اور ساقی کوثر کہا گیا، جنہیں مہمانِ عرش ہونے کا اعزازِ لازوال حاصل ہوا، جنہیں زمین کے سارے خزانوں کی کنجیاں عطا ہوئیں، جن پر خالق کائنات اور اس کے فرشتے درود بھیجتے ہیں، قیامت کا دن جن کے تصرفات اور اختیارات کے ظہور کا دن ہے، آپ ﷺ کو مقامِ محمود پر فائز کیا جائے گا، سورج سوا نیزے پر آ کر آگ برسا رہا ہوگا، نفسا نفسی کا عالم ہوگا۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء و رسل، اپنی امتوں کے ہمراہ نبی محتشم ﷺ کے خیمہ عافیت کی تلاش میں نکلیں گے اور حاضرِ خدمت ہوکر عرض کریں گے کہ یارسول اللہ! مالکِ روزِ جزا کی بارگاہ میں دعا فرمائیے کہ جلد میزانِ عدل قائم ہو اور محبوبِ خدا ﷺ، خدائے وحدہ لاشریک کی بارگاہِ عفو و کرم میں دعا کے لیے اپنے مقدس ہاتھ اٹھادیں گے۔

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہرالقادری فرماتے ہیں:

''حضور علیہ السلام کے شمائل، فضائل، خصائل اور خصائص کے جمالیاتی اظہار کا نام نعت ہے، نعت کا اساسی رویہ درود وسلام کے حکم سے ترتیب پاتا ہے۔ نعت امن و عافیت اور محبت کی پیام بر ہے''۔

محامد و محاسنِ سرکارؐ کو حیطۂ تحریر میں لانا بھی نعت، شہرِ خنک کی گلیوں کا دلآویز تصور بھی نعت، فراق و ہجر میں اشکِ مسلسل کا بے ساختہ رقص بھی نعت، قلم کا ورق پر اسمِ محمدؐ لکھنا بھی نعت ہی کے زمرے میں آتا ہے، مواجہ اقدس میں حاضری بھی نعت، یادِ طیبہ میں قلم کا وجد میں آنا بھی نعت، مدینے کی ہواؤں کے دستِ محبت کو چومنے کی آرزو کرنا بھی نعت، تاجدارِ کائناتؐ کے وسیلۂ جلیلہ سے حروف التجا بن کر بارگاہِ خداوندی میں دعا کے لیے ہاتھ اٹھانا بھی نعت، یمن کے بادشاہ تبع کے لشکریوں کا یثرب کے درو دیوار سے والہانہ محبت کا اظہار بھی نعت، چشمِ تصور کا بارگاہِ حضورؐ میں سلام عرض کرنا بھی نعت، گنبدِ

خضرا کا عکسِ جمیل دیکھ کر بچوں کے دونوں ہاتھوں کا بہرِ سلامی اٹھنا بھی نعت، پتھروں کا والئ کونین کو سلام کرنا بھی نعت، کنکریوں کا نبی مکرمؐ کے دستِ اقدس میں کلمہ پڑھنا بھی نعت، درختوں کا تعظیماً جھک کر آقائے محتشمؐ کے آداب بجا لانا بھی نعت، کفار ومشرکین مکہ کا حضورؐ کو امین اور صادق کا لقب دینا بھی نعت، ابرِ کرم کا سفرِ شام کے دوران ننھے حضورؐ کے سرِ انور پر سایہ کرنا بھی نعت، کبوتر بن کر فضائے گنبدِ خضرا میں اڑنے کی تمنا کرنا بھی نعت، شہرِ حضورؐ کی معطر اور معنبر گلیوں میں کھیلنے والے بچوں کے قدموں سے اٹھنے والی گرد کو سرمہ بنانے کی آرزو کا اظہار بھی نعت، یادِ حضورؐ میں پلکوں پر آنسوؤں کے چراغوں کا جھلملانا بھی نعت، لبوں پر خوشبوئے اسم محمدؐ کی مہکار کا بکھرنا بھی نعت، ۱۲ ربیع الاول کی صبحِ دلنواز کا تصورِ دلنشیں بھی نعت، سفرِ ہجرت میں اُمِ ایمن کے بے ساختہ تحسینی کلمات بھی نعت، چہرۂ اقدس کی تلاوت کا آرزو مند ہونا بھی نعت، خواب میں آقائے محتشمؐ کی زیارت سے مشرف ہونا بھی نعت، مواجہۂ اقدس میں ہچکیوں، سسکیوں اور آنسوؤں کی برسات بھی نعت، قدمَین مبارک کی جانب دست بستہ سلام عرض کرنا بھی نعت، اسمِ گرامی سن کر درود پڑھتے ہوئے انگوٹھوں کو چومنا بھی نعت، مدینے کی گلیوں میں تصویرِ ادب بن کر محوِ ثنا رہنا بھی نعت، آسمانی صحائف میں نبی آخرالزماں کی تشریف آوری کا ذکرِ مقدسہ بھی نعت، تبرکاتِ مقدسہ کی زیارت بھی نعت، آقا علیہ السلام کی جائے ولادت کی بچشمِ نم زیارت بھی نعت، حضورؐ کے بچپن کا ذکرِ جمیل بھی نعت، حلیمہ سعدیہؓ کے مقدر پر رشک کرنا بھی نعت، جشنِ ولادت پر گھر کی منڈیروں پر چراغ جلانا بھی نعت، سنہری جالیوں کو چومنے کی خواہش کرنا بھی نعت، بنونجار کی خوش بخت بچیوں کا دف بنا کر حضورؐ کی آمد پر استقبالیہ اشعار کا پڑھنا بھی نعت، اصحابِ رسولؐ کا تصویرِ ادب بن کر تاجدارِ کائنات کی محفلِ پاک میں بیٹھنا بھی نعت، حضورؐ کے نقشِ پا کو پلکوں پر سجانے کا تصور بھی نعت، معجزاتِ حضورؐ کا بیان بھی نعتؐ، سیرتِ اطہر سے اکتسابِ شعور کے بعد جذباتِ دلنشیں کو سپردِ قلم کرنا بھی نعت، نعت لکھتے وقت فرطِ عقیدت سے اپنے ہی قلم کو چوم لینا بھی نعت، غارِ حرا کے پتھروں کو سینے سے لگانا بھی نعت اور ''نغماتِ عشق'' جیسے انتخاب نعت کا ترتیب دینا بھی نعت۔

نعت کیا ہے وصفِ ختم المرسلیںؐ کا تذکرہ
نعت کیا ہے عظمتِ نورِ مبیں کا تذکرہ
نعت کیا ہے نکہتوں کی سر زمیں کا تذکرہ
نعت کیا ہے سب حسینوں سے حسیں کا تذکرہ

دل کے بنجر کھیت میں کرنیں اگا دیتی ہے نعت
نقش باطل کے جبینوں سے مٹا دیتی ہے نعت

''نغماتِ عشق'' مختلف مدحت نگاروں کی نعتوں کا ایک دلآویز مجموعہ ہے جسے واشنگٹن ڈی سی (امریکہ) میں مقیم رشید احمد طاہری نے مرتب کیا ہے۔ انہوں نے جدید اور قدیم شعرا کے نعتیہ کلام کا بڑی عرق ریزی سے انتخاب کیا ہے۔ اظہارِ عشق کے منفرد اسلوب قاری کے دامنِ دل کو کھینچتے ہیں، یہ انتخاب سفرِ نعت کے مختلف ادوار پر محیط ہے۔ ''نغماتِ عشق'' میں رشید احمد طاہری نے جدید و قدیم نعت کے تمام رنگ جمع کر دیئے ہیں، مقدار اور معیار کے لحاظ سے یہ انتخاب نعت اپنی مثال آپ اور اردو شاعری کی آبرو ہے۔ سفرِ نعت سے آگاہی کے ساتھ دلوں میں عشقِ مصطفٰی کے چراغ روشن ہوتے ہیں، انہی چراغوں کی روشنی ''نغماتِ عشق'' کی اشاعت کا جواز بھی ہے۔ یہ دلکش انتخابِ نعت معاملاتِ دل کی امر کہانی اور لمحاتِ حضوری کا شفاف آئینہ ہے۔ دیارِ غیر میں مقیم پاکستانیوں کے دل حُبِّ سرکارؐ سے لبریز ہیں، سینوں میں محبتِ رسولؐ کا چشمہ ابل رہا ہے، سینوں میں روحِ محمدؐ ابھی زندہ ہے، ''نغماتِ عشق'' اس کی ایک روشن مثال ہے۔ ادھر کچھ لوگ سمندر پار مقیم محبِ وطن اور محبِ اسلام پاکستانیوں پر ''غیر ملکی'' کا لیبل چسپاں کر کے نجانے اپنے کس احساس کمتری کا اظہار کرتے رہتے ہیں، مَیں حضورؐ کا ایک ادنیٰ سا مدحت نگار رشید احمد طاہری اور دیگر لاکھوں پاکستانیوں کے عشقِ رسول کو سلام پیش کرتا ہوں، خدا اپنے محبوبؐ کے غلاموں کے جذبۂ غلامی کو دوام بخشے۔

منیر نیازی کا ایک شعر ہے:

مَیں جو اک برباد ہوں آباد رکھتا ہے مجھے
دیر تک اسمِ محمدؐ شاد رکھتا ہے مجھے

قلم ازل سے اپنے ہونٹوں پر نغماتِ عشق سجا کر رقصِ مسلسل کے عالم میں ہے، قلم کی خوش نصیبی پر عناصر فطرت کیوں نہ ناز کریں کہ اِسے ہوائے مدینہ سے ہمکلامی کا شرف حاصل ہے، کائنات کا ذرہ ذرہ آقائے محتشمؐ کے نقوشِ قدم کی خیرات کا تمنائی ہے، ملائکہ اسی در کی حاضری کے آرزومند ہیں، خلدِ مدینہ کی معطر، معنبر اور مقدس فضاؤں میں آج بھی بنونجار کی بچیوں کے خیر مقدمی اشعار کی صدائے بازگشت سنائی دے رہی ہے۔ ارض و سماوات کی لامحدود وسعتیں انہی نغماتِ عشق کی رعنائیوں سے معمور ہیں اور ہم غلاموں کے شب و روز بھی انہی تجلیات سے جگمگا رہے ہیں۔

دل جس سے زندہ ہے وہ تمنا تمہی تو ہو
ہم جس میں بس رہے ہیں وہ دنیا تمہی تو ہو
(مولانا ظفر علی خان)

بھٹکے ہوئے آہو کو سوئے حرم لے چلنے کا وقت ہے، دہر میں عشقِ محمد سے اجالا کرنے کی یہی گھڑی ہے، حضورؐ کی ذاتِ اقدس کو اپنی عقیدتوں کا محور بنا کر ہی عظمتِ رفتہ کی بازیابی کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوسکتا ہے، حضورؐ سے قلبی وابستگی اور رشتۂ غلامی کو از سرنو استوار کرنے کے لیے نعت کی تخلیقی صلاحیتوں کو اجاگر کرنا ہوگا۔ شعرائے دربار رسالت حسان بن ثابت، عبداللہ بن رواحہ اور کعب بن زہیر رضی اللہ عنہم نے نعت سے دفاعِ رسول کا کام لیا تھا اس لیے کہ دفاعِ رسول ہی دفاعِ اسلام ہے۔ نعت کو عنوانِ زندگی بنائے بغیر کامیابی ممکن نہیں، محبتِ رسول کے بغیر اہداف کا حصول جوئے شیر لانے کے برابر ہے۔

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کردے
دہر میں اسمِ محمدؐ سے اجالا کردے

گلوبل ویلیج کا تصور مادی حوالوں سے تو شرمندۂ تعبیر ہو رہا ہے لیکن اخلاقی اور روحانی حوالے سے انسان قعرِ مذلت میں گرتا جا رہا ہے۔ امن کی فاختہ کے پر کاٹے جا چکے ہیں، اولادِ آدم ذہنی خلفشار میں مبتلا ہے، بظاہر یوں لگتا ہے کہ فاصلے سمٹ رہے ہیں۔ نسلِ انسانی یکساں طور پر نت نئی ایجادات سے استفادہ کر رہی ہے۔ اس کرہ ارضی پر بسنے والوں کو آسودہ لمحوں سے ہمکنار کرنے کے لیے ان گنت منصوبوں پر عمل ہو رہا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ انسانوں کے درمیان فاصلے سمٹ نہیں بڑھ رہے ہیں، نسلی تعصّبات کی ہولنا کیوں سے ہم اپنا دامن نہیں چھڑا سکے، مذہبی رواداری کی آڑ میں نفرتوں کی دیواریں اٹھائی جا رہی ہیں، اسلاموفوبیا کا عفریت تہذیبوں کو ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار کر رہا ہے، آزادیٔ اظہار کی آڑ میں قومیتوں کے درمیان منافرت کی آگ بھڑکائی جا رہی ہے، دنیائے اسلام پر اغیار کا تسلط مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جا رہا ہے۔ بے غیرتی، بے حمیتی اور بے حسی کی زنجیر ہمارے گلے کا ہار بن گئی ہے، ہم کرپشن کی دلدل میں ڈوب رہے ہیں، بدعنوانیوں کے جہنم میں جل رہے ہیں، قانون کی حکمرانی کا تصور ناپید ہو چکا ہے، آئین کی پاسداری زبانی جمع خرچ سے آگے نہیں بڑھ سکی۔ جمہوریت کو ہم نے بکاؤ مال بنا رکھا ہے، سلامتی کے دین کی تفہیم اپنے مفادات کو مدنظر رکھ کر کی جاتی ہے، عدل کی بالادستی کا خواب نجانے کس خرابے میں کھو گیا ہے، بازار سیاست میں خوشامد کی ڈگڈگی بج رہی ہے۔ اُس بازار کا سارا گند قصرِ اقتدار کی غلام گردشوں میں بہہ رہا ہے، نہ کوئی ضابطۂ اخلاق ہے اور نہ کوئی ضابطہ حیات ہے۔ جنگل کا قانون ہی سکہ رائج الوقت ٹھہرا ہے، بصارت ہی نہیں ہم بصیرت سے بھی محروم ہو چکے ہیں، ہمیں اجتماعی خودکشی کے دہانے پر لا کھڑا کیا گیا ہے۔ ہم ہوائے جبر کے رحم و کرم پر ہیں۔ خدا بننے کا جنون اپنے نقطہ عروج کو چھو رہا ہے۔ انسانی معاشرہ حیوانی معاشرے میں تبدیل ہو رہا ہے۔

اس منفی صورتحال کا ذمہ دار کون ہے؟ صدیوں کا قرض کون اتارے گا؟ ہم مفادات اور تضادات کے گرد و غبار سے کب نکلیں گے؟ ہمیں یہ بات گرہ میں باندھ لینی چاہئے کہ پرچمِ توحید بلند کیے بغیر ہم غبارِ شب کے لشکریوں کو شکست نہیں دے سکتے، محبتِ رسول اور ادب رسولؐ کو عنوانِ حیات بنائے بغیر ہم اسلامیانِ عالم کی تہذیبی اور ثقافتی اکائی کا تحفظ نہیں کر سکتے۔ اور یہ کام شعورِ مدحت رسول ﷺ کے فروغ و ارتقا کے بغیر ممکن نہیں۔رسولِ محتشم ﷺ نے خود فروغِ نعت اور ترویج مدحت کا اہتمام فرمایا اور حسّان بن ثابت ؓ سے نعت سننے کے لئے منبر کا انتظام کیا جس پرآپ کھڑے ہو کر سرورِ دوعالم کے حضور ہدیۂ نعت پیش کرنے کا عظیم اعزاز حاصل کرتے۔ اس طرح صحابہ کرام میں مدح النبی کا وہ شعور بیدار ہوا جس کی آب و تاب سے تاریخ اسلام میں اخلاقِ حسنہ اور کردارِعالیہ کے سورج طلوع ہوئے۔ گویا نعت ملی شعور کے موسم کو قریب تر لانے کا مؤثر ترین ذریعہ ہے اور اس لحاظ سے ''نغماتِ عشق'' کا یہ گلدستۂ مدحت جسدِ امت میں روح محمدؐ کو زندہ رکھنے کا ایک جادو اثر وسیلہ ہے۔

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

''نغماتِ عشق'' کا مطالعہ ہمارے اس ادراک کو ایقان میں تبدیل کرتا دکھائی دیتا ہے کہ اس گئے گذرے دور میں بھی عشق کی آگ امتِ مسلمہ کے سینوں میں بجھنے نہیں پائی۔ اپنے آقاؐ کے ناموس پر کٹ مرنے کا جذبہ آج بھی ہمارے لہو میں موجزن ہے۔ حضور ختمی مرتبتؐ کے نقشِ کفِ پا پر اپنا سب کچھ نثار کر دینا ہماری سب سے بڑی آرزو ہے اور نغماتِ عشق اسی آرزو کا عکسِ جمیل ہے۔ اس پر رشید احمد طاہری یقیناً ہماری مبارکباد کے مستحق ہیں۔

پورے قد سے میں کھڑا ہوں تو یہ تیرا ہے کرم
مجھ کو جھکنے نہیں دیتا ہے سہارا تیرا

(احمد ندیم قاسمی)

منصبِ رسالت کے تاجدارِ اولیںؐ، منشورِ حیات کے حرفِ آخریںؐ، رعنائیِ خیال کے عکسِ عنبریںؐ، احساسِ جمال کے نقشِ دلنشیںؐ، سدرۃ المنتہٰی کے مہمانِ عالمیںؐ، آسمانِ دانش کے مہرِ یقیںؐ، کوہِ فاراں کے نورِ مبیںؐ، آمنہؓ کی گود کے ماہ جبیںؐ، پیشوائے دینِ متیںؐ، نازشِ فرش وعرشِ بریںؐ، بے مثال و بے نظیر و بہتریںؐ، جنابِ سیدالمرسلیںؐ، حضور رحمت عالمؐ کی توصیف وثنا کے چراغ خود مالکِ کائنات نے فروزاں کئے تھے تمام الہامی صحیفے حضورؐ کی عظمت کی گواہی دے رہے ہیں اور اسی پیکرِ جمیل کی آمد کا مژدہ سنا رہے ہیں جو بعد از خدا بزرگ توئی کے منصبِ جلیلہ پر رونق افروز ہیں، جو سردارِ انبیاء ہیں، جو نبیوں اور رسولوں میں سب سے افضل اور برتر ہیں۔

دنیا میں احترام کے قابل ہیں جتنے لوگ
میں سب کو مانتا ہوں مگر مصطفٰی کے بعد

(قتیل شفائی)

نعتِ رسول مقبول دل ونظر کی شاعری ہے، جذبے اور خلوص کی چاندنی ہے۔ محبتوں اور عقیدتوں کی موجِ نور ہے، شعور وآگہی کی خوشبو، لوح وقلم کی آبرو، گردشِ لیل و نہار کی جستجو اور زمین وآسمان میں موضوعِ گفتگو، حرف وصوت کی ریاضت دراصل نطق و بیان کی عبادت ہے۔

لگیں میرے تنے پر بھی کھجوریں یارسول اللہ
میں شعروں کی کھجوریں بانٹ دوں جاکر مدینے میں

(شیخ عبدالعزیز دباغ)

سرکارِ دو جہاںؐ، متاعِ کون و مکاںؐ، پیمبرِ بہارِ جاوداںؐ کے ذکر جمیل سے ''نغماتِ عشق'' کا ورق ورق منور ہے۔ خاکِ مدینہ کی خوشبو سے ہم غلاموں کی دنیا مہک رہی ہے، قلم کی یہ سجدہ ریزیاں قبول ہوں، مطلعِ انوارِ سحر کی ضیا پاشیوں سے ایوانِ شعر جگمگا رہا ہے۔ صبحِ ازل کے حسنِ لازوال، پیکرِ رعنائیِ خیال، بزم ہستی کے چراغِ بے مثال، ممدوحِ ربِ ذوالجلال، ساقی کوثر، شافعِ محشر، سلطانِ بحر و بر، صاحب لولاک، مرقع جمال، مرجعِ زیبائی، رسولِ ازل، مشہودِ مطلق کی ثنا ہم سائلانِ مصطفیٰ کا سرمایۂ حیات ہے۔ اللہ رب العزت کے بعد ہمارا ہر حوالہ حضورؐ سے شروع ہوکر حضور پر ختم ہوجاتا ہے۔ رشید احمد طاہری کا مرتب کردہ انتخابِ نعت اسی سرمائے میں ایک قیمتی اضافہ ہے۔ اللہ رب العزت اس سعی کو قبول اور آقا علیہ السلام اسے سندِ جواز عطا فرمائیں۔

ریاض حسین چودھری

شہرِ اقبال، 25 جنوری 2017ء

# سفرِ نور

## ضیاء نیّر کا مجموعہ نعت

## پیش کلام

نعت عشقِ رسولؐ اور اتباعِ نبیؐ کے تخلیقی اظہار کا نام ہے کیونکہ ذاتِ مصطفیٰؐ ہی خالقِ حقیقی تک رسائی کا واحد وسیلہ جلیلہ ہے۔ اس لیے بالواسطہ طور پر نعت بھی خدائے بزرگ و برتر کی حمد و ثناء کے ہزار پہلو لیے ہوئے ہے۔ اس لیے کہ یہ اس قادرِ مطلق کی تخلیقِ اول کی توصیف وثنا ہے جس کے لیے ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ اے محبوبؐ اگر تجھے پیدا کرنا مقصود نہ ہوتا تو نہ یہ چاند ہوتا نہ یہ ستارے نہ سورج نہ زمین نہ آسمان نہ فرشتے، اے محبوب تمہی تو سب غائتوں کی غائت اولیٰ ہو اور ہم غلامانِ رسولؐ ہاشمی جس دنیا میں بس رہے ہیں وہ دنیا بھی تاجدارِ کائنات کی عطا ہے، سچی بات تو یہ ہے کہ ہمارا تو ہر حوالہ حضورؐ سے شروع ہوکر حضورؐ پر ختم ہوجاتا ہے۔ اللہ تک رسائی بھی واسطۂ رسالت سے ہی ممکن ہے۔ حضور نے فرمایا کہ اس وقت تک تمہارا ایمان مکمل نہیں ہوسکتا جب تک میں تمہیں تمہاری جان، مال، اولاد غرض ہر شے سے عزیز تر نہ ہوجاؤں، گویا معیارِ ایمان ہی حضورؐ کی ذاتِ اقدس ہے۔ ایوان نعت میں سب سے پہلی شمعِ محبت فروزاں کرنے والا بھی وہی خدائے لاشریک ہے جو حیی بھی ہے اور قیوم بھی، جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ نعت اسلامی ثقافت، تہذیب اور تمدن کا ایک دلآویز مظہر بھی ہے کیونکہ اسلامی ثقافت، تہذیب اور تمدن کا مرکز ومحور ہی ذاتِ مصطفیٰؐ ہے جن کے سر اقدس پر خود خالقِ کائنات نے محبوبیت کا تاج سجا کر ان کے ذکر کو ان کی خاطر بلند کرنے کا اعلان آخری الہامی صحیفے قرآن مجید میں کیا ہے۔ قرآن مجید فرقان حمید بھی تو ایک نعت مسلسل ہی ہے۔ ہر طرف

اپنے محبوبؐ کے تذکرے، ہر طرف محاسنِ مصطفیؐ کی قندیلیں فروزاں ہیں۔ ہر سمت محامدِ محبوبؐ کے چراغ جل رہے ہیں۔

نعت دراصل حکم ربی کی تعمیل ہے کیونکہ نعت کی اساس بھی درودِ پاک پر رکھی گئی ہے۔نعت درودِ پاک کا شعری پیکر ہے۔عروسِ سخن کی ساری رعنائیاں حضور کی نعت کا خام مواد بنتی ہیں۔یقیناً یہ ایک حقیقت ہے اور محض جذباتی یا شاعرانہ سوچ نہیں کہ روئے زمین پر آج تک کوئی ایسی ساعت نہیں اتری جس کے ہاتھوں میں خوشبوئے اسم محمدؐ کا پرچم نہ ہو۔سفر ثناء بھی ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گا۔ جب کائنات میں اللہ کے سوا کوئی نہ تھا تو سب سے پہلے نورِ محمدی تخلیق ہوا۔کائنات کی وسعتیں اُس وقت درود و سلام کی صداؤں میں گونج رہی تھیں اور کائنات کی وسعتوں میں درود وسلام کی صدا اس وقت بھی پرچمِ نعت اٹھائے ہوئے ہوگی جب کائنات میں موت کو بھی موت آ چکی ہوگی اور وہی ذات باقی ہوگی جسے دوام حاصل ہے جو ابتداؤں کی ابتدا اور انتہاؤں کی انتہا ہے۔

اردو نعت عربی اور فارسی روایات شعری سے اکتساب شعور کرکے جس توانا شعری وژن کی امین قرار پائی ہے وہ پوری اردو شاعری کی آبرو ہے، بیسویں صدی کے آخری دو دہائیوں میں جن شعراء نے نعت نگاری کا اعزاز حاصل کیا ہے اور عبدالعزیز خالد، حفیظ تائب، احمد ندیم قاسمی، احسان دانش، صوفی محمد افضل فقیر، حافظ لودھیانوی، حافظ مظہرالدین، محشر رسول نگری، قمر یزدانی، جسٹس محمد الیاس، مظفر وارثی، نعیم صدیقی، عابد نظامی، محسن احسان، راسخ عرفانی، عاصی کرنالی، اقبال عظیم، محمد علی ظہوری، حنیف اسعدی، طفیل ہوشیار پوری، اعصم گیلانی، محشر بدایونی کے بعد جن شعراء نے ذکر حضورؐ سے پلکوں پر چراغاں کا اہتمام کیا ہے ان میں لالہ صحرائی، خالد احمد، راجا رشید محمود، منیر قصوری، ریاض مجید، جعفر بلوچ، تحسین فراقی، حفیظ الرحمٰن احسن، انجم رومانی، بشیر حسین ناظم، حسرت حسین حسرت، سعید بدر، اختر الحامدی، رفیع الدین زکی، حفیظ صدیقی، حسن رضوی، حنیف نازش، صبیح رحمانی اور ضیاء نیّر کا کشکول آرزو جذبوں سے لبریز ہے اور یہ کشکول لیے وہ دہلیز

مصطفیٰؐ پر کھڑے ہیں، چشم تصور طواف گنبد خضراء میں مصروف رہتی ہے اور پلکیں ہر لمحہ درِ حضورؐ پر بہر سلامی جھکتی رہتی ہیں۔ یہ اعزاز کیا کم اعزاز ہے کہ وہ علمی اور ادبی حلقوں میں ایک نعت نگار کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ اس حوالے کے بعد کسی دوسرے حوالے کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔

ضیاء نیّر نے حضورؐ کی شریعت کو ضامن عدل و مساوات کہہ کر اسلام کی ان آفاقی تعلیمات کی طرف اشارہ کیا ہے جنہیں اپنائے بغیر امنِ عالم کا تصور بھی ممکن نہیں۔ آج دنیا، امن، سکون اور عافیت کی تلاش میں ہے جنگ کا خوف اس کے اعصاب پر سوار ہے۔ ضیاء نیّر اس حصارِ خوف سے نکلنے کا جو حل تجویز کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ رہنمایانِ عالم کی جھوٹی قیادتوں کا بھرم ٹوٹ چکا ہے۔ آج ایک بار پھر ابنِ آدم کو حضورؐ کی قیادت درکار ہے کیونکہ گنبدِ خضراء ہی کائنات کا وہ مرکز و محور ہے جس کے توسط سے کالی گھٹاؤں کو تشنہ اور بنجر زمینوں کی طرف حکمِ سفر ملتا ہے۔ دہلیز مصطفیٰؐ کو تھام کر خدا سے جو مانگا جائے وہ ضرور ملتا ہے اور حکمِ خداوندی بھی یہی ہے جب تم اپنی جانوں پر ظلم کر بیٹھو تو میرے محبوبؐ کی بارگاہ میں حاضر ہو جاؤ۔ ضیاء نیّر حضورؐ کی محبت کو ایمان کی اساس قرار دیتے ہیں۔ شاعر کو احساس ہے کہ حضورؐ کے شمائل، فضائل اور خصائل سے اکتسابِ شعور کئے بغیر نعت کی فضا کا وہ تقدس برقرار ہی نہیں رہ سکتا جس تقدس کے بغیر نعت لکھنے کی جسارت کرنا ایک ادبی بدعت قرار پاتا ہے۔

ضیاء نیّر کا دامنِ شعر و ادب رنگ برنگے پھولوں سے مہک رہا ہے۔ شاعر نے شعری جمالیات سے پورا پورا انصاف کرنے کی سعی کی ہے، فنی لوازم کا ہر مرحلہ پر خاص خیال رکھا ہے۔ ان کے ہاں سلاست بھی ہے، روانی بھی اور سادگی بھی، شعوری طور پر بھاری بھرکم الفاظ کو شعر کا جامہ پہنا کر نہ خود دھوکے میں رہتے ہیں اور نہ قاری کو کسی دھوکے میں رکھتے ہیں۔ سیدھی سادھی بات سیدھے سادے انداز میں کہتے ہیں۔ یقیناً یہی فنی سچائی کا پہلا زینہ ہے۔ وارداتِ قلبی بیان کرتے ہیں تو کہیں بھی تصنع یا بناوٹ کا

احساس نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے یہ جو کہتے ہیں وہ براہ راست ان کے قاری کے دل میں اتر جاتا ہے۔ انہوں نے مترنم بحور کا انتخاب کیا ہے۔ الفاظ کے چناؤ میں بڑی احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ عصری کرب اور عصری شعور کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں لیکن شاعر جلوۂ محبوبؐ میں کچھ اس طرح گم ہے کہ خارجی آوازوں پر توجہ دینے اور پھر ان آوازوں کا ردعمل ظاہر کرنے کی اس کے پاس فرصت ہی نہیں اور وہ حیرتوں کے سمندر میں گم چشم تصور میں گنبدِ خضرا کا عکس جمیل سجائے بیٹھا ہے۔ شہرِ پیغمبرؐ سے گہری وابستگی جب عقیدت کے دروازوں پر دستک دیتی ہے تو شاعر کی کائناتِ شعر وجد میں آجاتی ہے۔

میری جھولی میں نہیں کچھ بھی خطاؤں کے سوا
اس لیے آپؐ سے دامان کرم مانگا ہے

قرآن بیاضِ نعتِ خدا ہے تو سر بہ سر
منشائے کردگار کا اظہار آپؐ ہیں

صدیوں رہے ہیں آپؐ کی آمد کے تذکرے
سب انبیاء بھی دیتے رہے آپؐ کی خبر

حضورؐ انقلابِ رحمت کے بانی ہیں۔ انہیں کل جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا گیا۔ امن، سکون اور عافیت کی تلاش میں بھٹکا ہوا انسان جو ہر انسانی در سے مایوس ہو چکا ہے اس کی نظریں رہ رہ کر صحرائے زیست میں سوئے مدینہ اٹھتی ہیں اور وہ اسی در سے امن کی بھیک کا طالب ہوتا ہے۔ اپنے لیے اور اپنی نسلوں کے لیے ردائے عافیت کا امیدوار ہے۔

دے کر بشر کو نسخۂ آئینِ زندگی
بانی ہوا جہاں میں وہ ہر انقلاب کا

یاد کرتا ہوں حرا کو تو یہ آتا ہے خیال
اک نئے دور کی تمہید تھی خلوت تیریؐ

چھٹ جائے، ظلم و جبر کی، سر سے شب سیاہ
نافذ ہو قریہ قریہ شریعت حضورؐ کی

تنہا ہے وہی دنیا و عقبیٰ کا سہارا
وہ ذات کہ سرمایۂ اربابِ یقیں ہے

دل کا اجڑا نگر شہرِ پیمبرؐ میں آباد کرنے کی آرزو ہر ورق پر دامنِ دل کو کھینچتی ہے اور دل کے کھنڈر میں ہوائے شہرِ خنک کے معطر و معنبر جھونکے چلنے لگتے ہیں، کشتِ آرزو میں بادِ بہاری چلتی ہے تو زباں پر صلِ علیٰ کے پھول کھلنے لگتے ہیں۔

ضیاء نیّر کی نعتیہ شاعری میں تخیل کی بلند پروازی بھی ہے۔ اظہار کی پختگی بھی اور ایک ایسی وجدانی کیفیت بھی جو ہر وقت روح کو سرشار رکھتی ہے۔ شاد رکھتی ہے، آباد رکھتی ہے۔ ان کی نعت کا پس منظر و پیش منظر وجدانی کیفیتوں اور روحانی لذتوں کے گہرے مگر شاداب رنگوں اور نیلے پانیوں سے ترتیب پاتا رہے۔ پیرایۂ اظہار دلکش اور دلنشیں ہے۔ آدابِ نعت گوئی کو ہر لحظہ ملحوظِ خاطر رکھتے ہیں۔ ایمائیت، رمزیت، ایجاز و اختصار ان کی نعت کے وہ اوصاف ہیں جو قدرت نے انہیں وافر مقدار میں عطا کیے ہیں۔

داغِ عریانی، نیّر کو بھی ڈھانپے اے کاش
عرصۂ حشر میں وہ چادر رحمت تیری

نیّر اس آرزو میں گوارا ہے موت بھی
ہوگی ہمیں نصیب شفاعت حضورؐ کی

فکرِ انساں کو جلا ملتی ہے جیسے جیسے
کھلتی ہے دیدۂ عالم پہ حقیقت تیری

کرکے عطا قرینۂ نعتِ شہِ امم
نیّر کو بھی خدا نے سخنور بنا لیا

ٹوٹے ہوئے لفظوں کے سوا کچھ نہیں رکھتا
کیا مدحِ پیمبرؐ کو زباں کھولے گا نیّر

ضیاء نیّر کا پہلا نعتیہ مجموعہ ''سفرِ نور'' اس لحاظ سے بھی خاصی اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں شامل نعتیں تمام کی تمام غزل کی ہئیت میں ہیں۔ غزل ایک مقبول ترین صنفِ سخن ہے۔ شعرا کی اکثریت نے نعت غزل کی ہیٔت میں کہی ہے۔ ضیاء نیّر کے جوہر بھی اس فارم میں کھل کر سامنے آئے ہیں۔ اگرچہ انھوں نے نعت کے لیے نظم کے پیرایہ کو بھی اظہار کا وسیلہ بنایا ہے لیکن ان کی کامیاب نعتیں غزل کے فطری رچاؤ کی آئینہ دار ہیں۔ یہ انتخاب ایک منفرد انتخاب ہے۔ جس میں جذبوں کی آنچ پر سلگتی ہوئی آرزوؤں کے رتجگوں کا جمالیاتی منظر دیدنی ہے۔ اللہ کرے ضیاء نیّر بساط شعر و ادب پر یونہی پھول بکھیرتے رہیں۔ یہ اعزاز کیا کم ہے کہ ان کی پہچان نعت ہے۔ نعت جو عشاق کا سرمایۂ حیات ہے۔ نعت جو اہلِ دل کا توشۂ آخرت ہے اور جو شہرِ سخن کا سب سے معتبر حوالہ بھی ہے۔

# نیاز

## مجموعہ نعت محمد حنیف نازش قادری

## تقدیم

(محمد حنیف نازش کی نعتیہ شاعری؛ پیراگراف کی سرخیاں مرتّب نے لگائی ہیں۔)

### نعت گوئی قدیم اور عظیم ہے

بلاشبہ نعت گوئی کی تاریخ تخلیق ارض و سماوات کی تاریخ سے بھی قدیم اور عظیم ہے اس لیے کہ نورِ محمدی کی تخلیق کے ساتھ ہی ثنائے رسول کون و مکان کے چراغ روشن ہوگئے تھے۔ محبوبﷺ! اگر تجھے پیدا کرنا مقصود نہ ہوتا تو یہ آسمان ہوتا نہ یہ زمین ہوتی، سورج ہوتا نہ چاند، نہ گلستانوں میں کلیاں چٹکتیں اور نہ شاخوں پر پھول مہکتے، خوشبو کی ہتھیلیوں پر چراغ جلتے اور نہ صبا گلشن ہستی میں رتجگے مناتی۔ نہ گھٹاؤں کو بنجر زمینوں کی طرف اذنِ سفر ملتا اور نہ دھنک کو سات رنگوں کی مشعل عطا ہوتی، فضا پرندوں سے رنگین ہوتی اور نہ جگنو اور تتلیاں پرفشاں ہوتیں، آبشاروں کا ترنم وجود میں آتا اور نہ خنک پانیوں کے چشمے رواں ہوتے، زمین پر شاداب ساعتیں اترتیں اور نہ موسموں کو ردائے سبز ملتی، نہ جنت تخلیق ہوتی اور نہ آدم علیہ السلام کو لباس بشریت سے نوازا جاتا۔ محبوبﷺ! یہ سب روشنیاں، یہ تمام رنگ تیرے نقوش پا کو چومنے کے لیے تخلیق ہوئے۔ محبوبﷺ! کائنات کا سارا حسن تیرے قدموں کی خیرات ہے، تیرے نور کی تخلیق ہی اس وسیع و عریض کائنات کی تخلیق کا جواز فراہم کرتی ہے۔ اس مضمون پر محمد حنیف نازش کا ایک شعر ہے۔

خاک دانِ عالمِ ارضی بسا قرنوں کے بعد
گھر محلے بستیاں دیوار و در کچھ بھی نہ تھا

### درود وسلام اللہ کی سنت اور نعت اُس کی توفیق ہے

نبی آخرالزماں پر خدائے وحدۂ لاشریک خود درود بھیجتا ہے، اس کے ملائکہ بھی اس عملِ دلنواز میں اپنے رب کے ساتھ شریک ہوتے ہیں۔ ہدایت آسمانی کی آخری دستاویز میں حکم خداوندی ہے کہ اے ایمان والو! تم بھی حضورﷺ پر خوب درود و سلام بھیجا کرو۔ نعت کی اساس یہی درود و سلام ہے، درود و سلام کے پیکر شعری کا نام نعت ہے اور نعت گوئی کا یہ اعزاز توفیق خداوندی کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔ بقول حنیف نازشؔ

نبیؐ کی نعت سراسر خدا کی ہے توفیق
نہ یہ ہنر ہے نہ مشقِ سخن نہ فن کا ریاض

### جدید اردو نعت

تحریکِ پاکستان اسلامی تشخص کی تلاش کا دوسرا نام ہے، قیام پاکستان کے بعد نعت کی ترویج اور اس کے فروغ کے لیے انفرادی اور اجتماعی سطح پر جو کام ہوا وہ دوقومی نظریے کی عملی تفسیر ہی نہیں اس کی جمالیاتی توجیہہ کا بھی مظہر ہے۔ حفیظ جالندھری سے حفیظ تائب تک محبتِ رسولﷺ کی ایک سرمدی دنیا آباد ہے، یہ الگ بات ہے کہ بازارِ سیاست کے گند نے ہر روشن چہرے کو اس قدر دھندلا کے رکھ دیا ہے کہ اسلامی تشخص کا سفر بھی ادھورا رہ گیا ہے۔ اگر چہ تحریکِ پاکستان کے حقیقی مقاصد نظروں سے اوجھل کر دیئے گئے ہیں اور ہم اپنے مفادات کے قیدی ہوکر رہ گئے ہیں تاہم نعت کا سفر جاری رہا ہے بلکہ نعت کا منظر نامہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جارہا ہے۔ جدید اردو نعت ہیئت کی تبدیلیوں کے ساتھ فکرونظر کی انقلابی تبدیلیوں سے بھی آشنا ہوئی ہے چنانچہ بیسویں صدی کی آخری دہائی میں تخلیق ہونے والی نعت اس صدی کی پہلی دہائی میں تخلیق ہونے والی نعت سے کئی حوالوں سے مختلف ہے۔ مولانا احمد رضا اور مولانا الطاف حسین حالی تک اور پھر علامہ اقبالؒ سے احمد ندیم قاسمی تک نعت فنی اور فکری ارتقاء کے ان گنت مراحل سے گزری۔ اکیسویں

صدی کو جو فکری اور ثقافتی وراثت منتقل ہوئی اس میں نعت کے باطن سے پھوٹنے والی روشنی کا انمول اثاثہ بھی شامل ہے۔ نعت کے وہ شعراء جنہوں نے بیسویں صدی کے اواخر میں مدحت رسول ﷺ کے چراغ روشن کرنے کا اعزاز حاصل کیا اور جو اکیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں بھی توصیف مصطفیٰ ﷺ کا پرچم فضاؤں میں بلند کرنے والے قافلۂ عشاق میں پیش پیش ہیں، اُن میں محمد حنیف نازش قادری کا نام بھی اعتبار و اعتماد کے آفاق پر روزِ روشن کی طرح درخشندہ ہے۔ ''سخن، سخن خوشبو'' اور ''آبرو'' کے بعد ''نیاز'' ان کے سفر تخلیق کا تیسرا پڑاؤ ہے۔

## محمد حنیف نازش کا اسلوب

آپ مشکل پسندی کے کوچے کی طرف نہیں آئے۔ ان کی نعت سادگی کے حسن کی ایک دلکش مثال ہے۔ کسی ذہنی الجھاؤ کا شکار نہیں ہوئے۔ فلسفیانہ موشگافیوں سے صاف دامن بچاتے ہیں۔ رمز و کنایہ کا حسن اثر آفرینی کی جملہ رعنائیوں کے ساتھ موجود ہے لیکن آپ شعوری طور پر نہ علامتی رنگ اپناتے ہیں اور نہ ابہام گوئی کا بے مقصد رویہ اختیار کرتے ہیں۔ بے ساختہ پن، روانی اور سلاست ان کے شعری آہنگ کی آبرو ہے۔ کہیں بھی تصنع یا بناوٹ کا احساس نہیں ہوتا۔ شاعری بذاتِ خود مغلوب ومقصود نہیں بلکہ شاعری ذریعہ ہے۔ حضور ﷺ کی محبت کے اظہار میں ابہام اور گنجلک پن کا کہیں بھی شائبہ نہیں پڑنے پایا۔ کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

نقش پا آپؐ کا آنگن میں سجا رکھا ہے
اس لیے رہتا ہے شب بھر مرا آنگن روشن

حدیثِ قدسیِ لولاک صاف کہتی ہے
تمام عالمِ امکاں کا ہیں وہی حاصل

مجھ پہ نازشؔ میرے آقاؐ کا کرم ایسے ہوا
بے تکلف نعت کہہ دی جب بھی فرمائش ہوئی

لفظ محمدؐ کی شیرینی کیا کہیے
شہد سے بھی لگتا ہے میٹھا اُن کا نام

نازش اپنے پاس تو کچھ بھی نہ تھا یوم حساب
نعت کے فیضان سے بخشش کا ساماں ہوگیا

خلق سے ان کے منور ہے جہاں
ہر طرف ہے روشنی ہی روشنی

محمد حنیف نازشؔ قادری قرآن و حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔ محض تخیل کی بلند پروازی کا سہارا نہیں لیتے۔ حقائق کا ادراک ان کے شعر کے باطن کو روشن رکھتا ہے۔ قرآن کا ورق ورق محامد ومحاسن مصطفیٰ ﷺ کے نور سے منور ہے۔ قرآن کو نعت مسلسل سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ خود خالق کائنات اپنے بندوں کو آدابِ مصطفیٰ بجا لانے کا شعور عطا کرتا ہے۔ نعت کے شعراء نے ہر دور میں یہ اعتراف بڑے فخر سے کیا ہے کہ انہوں نے نعت گوئی قرآن سے سیکھی ہے۔ نازش کہتے ہیں:

نعت لکھو تو رکھو سامنے اس کو نازشؔ
آپؐ کی نعت میں ہے سارے کا سارا قرآن

قرآن میں ملے نہ جسے نعت مصطفیٰ
کہہ دوں میں اس کی آنکھ کو بینا، کبھی نہیں

شاعرِ ''نیاز'' نے اقلیمِ سخن میں اپنے لیے نئی راہیں تلاش کرنے کی بھرپور اور کامیاب سعی کی ہے۔ دلکش ردیفوں اور خوبصورت قوافی نے ان کے دامن شعر کو رنگوں، روشنیوں اور خوشبوؤں سے بھر دیا ہے لیکن روایت کا تسلسل کہیں بھی ٹوٹنے نہیں پایا بلکہ روایت کا دامن چھوڑنا ان کے فنی مسلک میں سرے سے شامل ہی نہیں۔ روایت کے ساتھ وابستہ رہ کر نیا پن پیدا کرنا بڑی بات ہے۔ نازش کے یہ شعر دیکھئے:

غور سے جب بھی دیکھوں ان کو سوچ مدینے جائے
کرتے ہیں یوں مجھ کو اشارے منظر، چہرے، پھول

حاضری کا بلاوا اب آئے گا کب، دید طیبہ کا پھر کب بنے گا سبب
کب ترے در پہ آئے گا منگتا ترا، صبر ہوتا نہیں چین آتا نہیں

وارفتگی کا یہ عالم ہے کہ اس شہرِ خنک کے سوا کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ چشمِ تصور ہر لمحہ طوافِ گنبدِ خضرا میں مصروف رہتی ہے۔ درِ حضور ﷺ پر دستِ سوال دراز کرنے کی نوبت ہی کب آتی ہے۔ یہاں تو بن مانگے ملتا ہے، طلب سے بھی پہلے دامن طلب مرادوں سے بھر جاتا ہے۔ میرے حضور ﷺ عطا ہی عطا، سخا ہی سخا، درود اُن پر سلام اُن پر!

کرم کی بھیک یہیں سے ملی جسے بھی ملی
یہ بارگاہِ عطا ہے، یہ بارگاہِ کرم

پھول، خورشید، صبا، چاند، ستارے، شبنم
جس کو پایا درِ محبوبؐ کا منگتا پایا

آپؐ دے دیتے ہیں اظہارِ طلب سے پہلے
تشنہ رہنے نہیں دیتے ہیں تمنا کوئی

نعت کا سفر اندر کی روشنی کا سفر ہے۔ شاعرِ ''نیاز'' کے ہاتھوں میں بھی روشنی کا یہی پرچم ہے۔ مدحتِ مصطفیٰ ﷺ کا اعزاز ربِ کائنات کے بندوں کا سب سے بڑا اعزاز ہے۔ شاعرِ حضور ﷺ حضور ﷺ کی ثنا گوئی کے حصول پر اللہ رب العزت کی بارگاہ میں تشکر و امتنان کے جتنے بھی پھول نچھاور کرے اور اپنے بختِ رسا کی جتنی بھی بلائیں لے کم ہے۔

درود اُن پہ پڑھو جتنا پڑھ سکو نازشؔ
کہ ہے یہ اُن کے یہاں ایک امتیاز کی بات

شگوفے نکلے تو اُن سے گلاب یوں بولا
سدا مہکتے رہو گے اگر درود پڑھو

حاجیو! آؤ درودوں کی بنالیں ڈالی
آج کی رات مدینے میں بسر ہو شاید

نازش، درود پڑھتا رہا میں حضورؐ پر
جتنے بھی حادثات تھے رستہ بدل گئے

ان کے گلشنِ فکر و نظر میں موسمِ نعت اپنی جملہ شادابیوں اور رعنائیوں کے ساتھ پرفشاں دکھائی دیتا ہے۔ عندلیبِ گلشنِ نعت کی نغمہ سرائی شہرِ سخن کی آبرو ہے۔

قبر کی تنہائی میں جب آخری ہوگا سوال
یاد کی ہوگی تو نعتِ مصطفیٰ کام آئے گی

جانتا ہوں اس کو نازش زادِ راہِ آخرت
داد کی صورت میں جو نعتوں کا نذرانہ ملا

میرے اک اک شعر سے کیسے نہ پھوٹے روشنی
زینت دِیواں ہوا محبوبؐ کا ذکرِ جمیل

نازشؔ اُن کی چشم رحمت کے طفیل
رنگِ مدحت ہے جداگانہ مِرا

اے کاش ملائک یہ کہیں مجھ سے سر حشر
نازشؔ! تجھے آقاؐ نے کہا ہے کہ سنا نعت

غیر کیا دیں گے کہ غیروں کا قصیدہ لکھئے
نعت کہیے تو پیمبرؐ سے ردا ملتی ہے

گلشن زیست کا ہر پھول ہے وقفِ مدحت
اور ایک ایک کلی محوِ ثنا ملتی ہے

مدحتِ محبوبؐ لکھی تو چمک اٹھے حروف
صفحۂ قرطاس پر گویا چراغاں ہوگیا

### نازش کے نعتیہ مضامین کی بنیادیں

درودوں کے چراغ لے کر لحد میں اترنے کا آرزومند شاعرِ رسولﷺ ہر حوالے سے پراعتماد ہے۔ اس تیقّن کے دیئے اس کی دونوں ہتھیلیوں پر جگمگا رہے ہیں کہ درودِ

پاک کی بدولت میرا مدفن حشر تک سروِ چراغاں کا منظر پیش کرتا رہے گا، دنیا میں بھی اجالے میرا مقدر ہیں اور عقبیٰ میں بھی کہکشائیں میرے راستوں کو منور کریں گی۔ اپنے نبیﷺ کے قدموں پر دیوانہ وار اپنی جان نچھاور کرنے والا یہ امتی، ستاروں سے روشن سیرت و کردار کے مالک جاں نثارانِ رسولﷺ کے نقوشِ قدم کو اپنی منزل قرار دیتا ہے اور ہر لمحہ جادۂ رحمت پر رواں دواں رہتا ہے۔ سوئے مدینہ اس کا یہ سفر کبھی ختم نہیں ہوتا۔ آرزوئے مدینہ کے چراغ اس کے سینے کے اندر ہمیشہ روشن رہتے ہیں۔

نازشؔ اُن سے مانگ لو کوئی کرن
ہے سوالی جن کے در کی روشنی

نامِ شفیعؐ امم کو چومنے کی سعادت ہر کسی کے مقدر میں کہاں، نازشؔ اپنے مقدر پر نازاں ہیں اور ''نیاز'' کے ورق ورق پر اپنے اس اعزاز لازوال کی چاندی بکھیرتے نظر آتے ہیں۔ ارضِ مدینہ پر گھر کی تمنا بھی شاعروں کے وجدان میں چراغ جلاتی ہے اور خوشبوئیں بکھیرتی ہے۔ کاسۂ دل تھام کر درِ اقدس پر سرتا قدم حرفِ سوال بننا یقیناً سعادت کی بات ہے۔ نازشؔ ہر لمحہ لطف پیمبرﷺ کے آرزو مند رہتے ہیں۔ آقائے محتشمﷺ کے نقوشِ کفِ پا کا احترام نازشؔ کے شعری سفر کی معراج ہے۔ تمنائے حضوری ہر وقت اُنہیں ثنائے حبیبﷺ میں مصروف رکھتی ہے۔

نبیؐ کے ہو نعلین کا جس پہ نقشہ
وہ کاغذ خدا کی قسم چومتا ہوں

مانگو آقاؐ کے وسیلے سے خدا سے نازشؔ
میں نہیں مانتا یوں مانگو تو پھر کام نہ ہو

ہدایت آسمانی کی آخری دستاویز قرآن حکیم فرقان مجید میں خدائے وحدۂ لا

شریک نے اعلان فرما دیا کہ مجھ تک رسائی میرے محبوبﷺ کے وسیلۂ جلیلہ کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ وہ جو اپنی جانوں پر ظلم کر بیٹھے، میرے نبیﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوجاتے اور پھر اللہ سے مغفرت طلب کرتے اور حضورﷺ بھی ان کی سفارش فرماتے تو وہ اللہ کو بخشنے اور رحم کرنے والا پاتے۔

فرمان خداوندی کی اس سرمدی روشنی میں آج کا شاعر نعت کے حوالے سے حمدِ خدا کے شعور کو اجاگر کرنے میں مصروف ہے۔ عرفانِ خدا عرفان مصطفیٰﷺ کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ ہمیں تو خدا بھی حضورﷺ کے وسیلہ جلیلہ ہی سے ملا ہے۔ آج کا شاعر بیاض نعت ہاتھ میں لیے بیاض حمد کے لیے تخلیقی عمل سے گزر رہا ہے۔ حمدیہ مشاعروں کے دلنواز سلسلے کا آغاز ہو چکا ہے۔ حمدیہ مجموعے بھی منظر عام پر آرہے ہیں۔ تخلیق نور محمدیﷺ سے پہلے کا عہد بھی حمد خدا ہی کا عہد ہے اور روزِ جزا کے بعد کا عہد بھی حمد خدا ہی کا عہد ہے۔ کائنات کا ذرہ ذرہ اپنے خالق کی ثنا بیان کر رہا ہے۔ قرب قیامت سے پہلے خالق حقیقی تک رسائی کے ان گنت مقفل دروازے کھلیں گے اور اللہ کی بندگی کا ہر راستہ دہلیز مصطفیٰ کو چوم کر نکلے گا کہ یہی منشائے خداوندی ہے اور یہی صراطِ مستقیم ہے کہ مجھ تک آنا ہے تو میرے محبوبﷺ کا راستہ اپناؤ۔ اُن کی تعلیمات پر عمل کرو، فلاح پاؤ گے۔ اُن کے قدموں کے نقوش کو مشعل راہ بناؤ، منزلیں بڑھ کر تمہارے قدم چوم لیں گی۔ محمد حنیف نازشؔ قادری بھی اسی قرآنی اسلوب ہدایت سے اکتسابِ شعور کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

کہی ہے نعت بتوفیقِ ایزدی میں نے
لکھی ہے حمدِ خدا نعتِ مصطفیٰ کے طفیل

دعا کرو کہ میں سیدھا مدینے جا پہنچوں
کروں وہاں سے میں نازشؔ خدا کے گھر کا سفر

نازشؔ کی نعت میں استغاثے کا رنگ بھی نمایاں ہے، امتِ بے نوا کی خستہ حالی

پر دل خون کے آنسو روتا ہے۔ آج امت مسلمہ ابتلا و آزمائش کے دور سے گزر رہی ہے۔کوئی اس کا پرسان حال نہیں۔ عالم کفر عالم اسلام کے خلاف متحد ہورہا ہے لیکن ہم اپنے مفادات کے قیدی بنے اپنی ثقافتی اکائی کی بھی نفی کررہے ہیں۔ غیروں کے ہاتھوں میں تاش کے پتوں کی طرح بکھرے ہوئے ہیں۔صلیبی جنگوں کا آغاز ہو چکا ہے لیکن توحید کے فرزند نرگسیت کے حصار میں پناہ ڈھونڈنے کی کوشش کررہے ہیں۔ رہ رہ کے نظریں افقِ مدینہ کی طرف اٹھ رہی ہیں لیکن گنبد خضریٰ سے غلامی کا رشتہ از سرنو استوار کیے بغیر ہم قعرِ مذلت کی اتھاہ گہرائیوں سے نہیں نکل سکتے۔ خوفِ خدا کو اپنے روز و شب کا عنوان بنائے بغیر ہم اپنا کھویا ہوا مقام حاصل نہیں کرسکتے۔ ردائے کرم کے لیے غلامئ رسولِ ہاشمی کے درِ رحمت پر کھڑے ہیں۔ فریاد لبوں پر سسک رہی ہے اور آنسوؤں کا قلزم بہہ رہا ہے۔ ان آنسوؤں میں محمد حنیف نازشؔ قادری کے آنسو بھی شامل ہیں۔

سرکارؐ حالِ امتِ عاصی پر اک نظر
منگتے ہیں کہہ رہے ہیں کہ آقا کرم کرم

نازشؔ کی نعت میں خودسپردگی کی کیفیت قاری کے دامنِ دل کو کھینچتی ہے اور وہ بھی اسی کیفیت سے سرشار ہوکر حضوری کی لذتوں سے ہمکنار ہونے لگتا ہے۔ قاری کو ساتھ لے کر چلنا کہ تخلیق کی خوشبو سے اس کا مشام جاں بھی معطر رہے۔ یقیناً ایک غیر معمولی وصف ہے اور یہی وصف جمیل نازشؔ کی نعتیہ شاعری کا اساسی رویہ ہے:

ملے اب اذن حضوری کا، اے شہِؐ کونین
کہ ختم ہونے کو ہے عمرِ مختصر کا سفر

ممدوحِ ربِ کائنات کی ثنا کہاں اور کہاں ایک شاعر بے نوا کا قلم، ٹوٹے پھوٹے الفاظ سہمی ہوئی سوچیں، طائرِ تخیل دم بخود، ندامت کے آنسو اور کم مائیگی کا احساس۔ حضورﷺ کا ذکر تو ان کے اللہ نے بلند کیا ہے۔ ہم غلامانِ تاجدار مدینہﷺ تو ثنائے

رسولﷺ کے حوالے سے محض اعتبار و اعتماد کی سند کے آرزو مند رہتے ہیں۔ بھلا نبی مکرمﷺ ہماری توصیف و ثنا کے کب محتاج ہیں، محتاج تو ہم ہیں کہ حضورﷺ ہمیں اپنے غلاموں میں شمار کرلیں۔ شعورِ نعت کا دعویٰ کون کرسکتا ہے۔ یہاں تو عجز و انکسار کی بیساکھیاں بھی ٹوٹ ٹوٹ جاتی ہیں، قلم میں اتنی سکت کہاں کہ اوصافِ مصطفیٰﷺ بیان کر سکے۔ لفظوں میں اتنی تاب کہاں کہ جلوۂ محبوبﷺ کو دامنِ دل میں سمیٹ سکیں اور خیال میں اتنی وسعت کہاں کہ سیاح لامکاں کے قدموں کے نقوش جمیل کو حیطۂ شعور میں لے سکے۔ شاعرِ ''نیاز'' دست بستہ حضورﷺ کی بارگاہ میں کھڑا ہے اور اسے اپنی بے نوائی کا احساس ہے۔

کسی کے بس میں کہاں نعت حضرتِؐ والا
کہ ہے فقط یہ عطائے شہِؐ حجاز کی بات

کر سکے ادراک شانِ سیدِؐ کون و مکاں
عقل کے مقیاس میں کب اتنی گنجائش ہوئی

محمد حنیف نازش قادری کا یہی عجز، یہی انکسار، ان کا سرمایہ حیات اور توشۂ آخرت ہے۔ میری دعا ہے کہ رب، محمدؐ، ثنائے محمدﷺ کو حرفِ پذیرائی سے نوازے۔

(آمین)

# توفیقِ خیر، عزت، شہرت، کمال فن

## ثاقب علوی کے دوسرے نعتیہ مجموعہ 'نجم ثاقب' پر تاثرات

اندر کی روشنی کے بھرپور ابلاغ کا نام شاعری ہے۔ اگر یہ شاعری درود و سلام کے پیرہن میں سج دھج جانے کا اعزاز حاصل کرلے تو نعت کہلاتی ہے۔ حضورؐ ختم المرتبت کے شمائل، فضائل، خصائل اور خصائص کے والہانہ اظہار سے نعت کے اساسی رویے معرضِ وجود میں آتے ہیں۔ کتاب عشق کے ان اساسی رویوں کا پہلا ماخذ ہدایت آسمانی کی آخری دستاویز قرآن مجید اور دوسرا ماخذ خود تاجدار کائنات کی سیرت مقدسہ ہے، جدید تر اور آج کی نعت بھی انہی اساسی رویوں کی روشنی میں ارتقا پذیر ہے۔ حسان بن ثابتؓ سے لے کر حفیظ تائب تک اور حفیظ تائب سے لے کر ثاقب علوی تک مدحت رسول کی کہکشاں حروف تازہ میں جگمگا رہی ہے۔ نعت حضور کی بے انت وسعتوں میں سوچ اور اظہار کے نئے نئے آفاق تسخیر ہورہے ہیں۔ ثاقب علوی کا ایک شعر ہے:

نئے انداز سے ذکر پیمبرؐ میں تھا سرگرداں
تصور کو مرے کس نے رگِ افکار ہی باندھا

تخلیق کائنات سے لے کر لمحہ موجود تک اور لمحہ موجود سے لے کر امید کی لامحدود منطقوں تک ہر لمحے اور ہر ساعت کے ہاتھ میں خوشبوئے ثنائے رسولؐ کا پرچم لہرا رہا ہے، کتاب تقدیر کا فیصلہ ہے کہ یہ پرچم کبھی سرنگوں نہیں ہوگا۔ بلندیوں پر لہرانے کا یہ عمل حشر بھر جاری رہے گا۔ قلمدانِ ثنا ماہ و سال کے تغیر سے ماورا ہے۔ کتابِ تحسینِ مصطفیٰ میں لفظِ زوال درج ہی نہیں کیا گیا۔ گردشِ لیل و نہار قصر ثنا کے دریچوں پر پلکوں سے دستک پاکر احتراماً سر جھکا دیتی ہے۔ عرش سے فرش تک گلابِ اسمِ محمدؐ کی خوشبوئے دلنواز نعت پرور ہی نہیں، لب کشا بھی ہے۔ صل علیٰ کے سرمدی نغمے سے فضا معمور ہے۔ تخئیل

لب کشا کا موسم درود و سلام کے موسم دلکشا کی عطا ہے۔ نعت حضورؐ اس عطا کی رعنائیوں کا نام ہے اور یہ رعنائیاں ہر ہر صدی پر محیط ہیں، ہر زمانہ میرے حضورؐ کا زمانہ ہے، ہر صدی میرے حضورؐ کی صدی ہے، ہر ہر لمحہ وابستگی کے اسی نور میں ڈوبا ہوا ہے۔

جبیں بے تاب ہو اور سامنے ہو نقش پا اُنؐ کا
تو عشاق نبی سے پھر تحمل ہو نہیں سکتا

وارفتگی اور خود سپردگی کا منظر دلکش دیدنی ہے۔ ہمارا ہر حوالہ خدائے بزرگ و برتر کے رسول اول و آخر سے شروع ہوکر انہیؐ پر ختم ہوجاتا ہے۔ نعت انہی سرمدی حوالوں کو مزید معتبر بناتی ہے اور انہیں اعتماد و اعتبار کا نور عطا کرتی ہے۔ مبارکباد کے مستحق ہیں وہ اربابِ علم و دانش جو اللہ رب العزت کے عطا کردہ قلم کو اس کے حبیبؐ کی ثنا کے لیے وقف کردیتے ہیں۔ انہی خوش قسمت شعرا میں ثاقب علوی کا نام بھی آتا ہے:

توفیق خیر، عزت و شہرت، کمال فن
ذکرِ رسول پاک نے کیا کیا نہیں دیا

ثاقب علوی کا اردو کا پہلا مجموعہ نعت صبغتہ اللہ تھا جس پر 2009ء میں حکومت پاکستان نے انہیں صدارتی ایوارڈ سے نوازا تھا۔ آپ پنجابی میں بھی نعت کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں۔ ''چانن چار چوفیرے'' نے قومی اور صوبائی سیرت ایوارڈ بھی حاصل کیے تھے۔ ''نجم ثاقب'' اردو میں آپ کا دوسرا نعتیہ مجموعہ ہے جو کئی حوالوں سے علمی اور ادبی سطح پر نئے معیارات قائم کررہا ہے۔ بارگاہ حضورؐ میں کلمات تشکر و امتنان پیش کررہے ہیں۔

مرے نبیؐ کی نوازش ہے دائمی ثاقب
ہزار بار نوازا طلب کیا جو بھی

ان کے شعری وژن میں رجائیت کا پہلو نمایاں ہے۔ منظر نامہ امید کی روشنی میں جگمگا رہا ہے۔ مشکل پسندی سے کلیتًا دامن نہیں چھڑا سکتا۔ ان کی مشکل پسندی طبع نازک پر

گراں نہیں گذرتی، جب مفہوم کی پرتیں کھلتی ہیں تو قاری کے رگ و پے میں طمانیت اور آسودگی کی ایک لہر ہی دوڑ جاتی ہے۔ اس کے حیطہ ادراک میں پھول بھی کھلتے ہیں اور خوشبوئیں رقص کرنے لگتی ہیں۔

تیری جانب نہ کیوں لپکیں بھلا ابحار علم و فضل
جو نقشِ نعل انؐ کا طرہ و دستار میں باندھا

ذوق نعت بلندیوں کی طرف محو پرواز ہے، شوق کی منزلیں کیف حضوری میں طے ہوتی ہیں، ہوائیں چراغ ثنا جلانے میں مصروف رہتی ہیں، ذوقِ سخن کی روشنی میں اعتماد کی مشعل فروزاں ہے۔ یقینِ کامل میسر ہو تو رختِ سفر باندھنا پڑتا ہے اور نہ زادِ سفر کے لیے تگ و دو کرنا پڑتی ہے۔

خود میں بلائیں گے مجھے وہ از پئے درود
حاجت نہیں ہے کوئی مجھے اہتمام کی

لمحاتِ حضوریؐ کی تلاش اور ان کا حصول ثاقب علوی کی زندگی کی سب سے بڑی آرزو ہے۔ ''نجم ثاقب'' کے ورق ورق پر یہ آرزو خوشبو بن کر پھیلی ہوئی ہے۔ خوبصورت اور دلکش تراکیب، منفرد اور دلآویز اسلوب اور لفظیات دامن دل کو کھینچتے ہیں، بساطِ عشق پر اسی خوشبو کا رقص جاری ہے۔ شاعر کے حریم دیدہ و دل میں حبِ مصطفیٰ کے چراغ جل رہے ہیں۔ پس منظر ہی میں نہیں، پیش منظر میں بھی اجالوں کا ہجوم ہے۔

جو ان کی نعت نہ کاغذ کو چوم کر لکھے
مرے قلم کو خدا ایسی روشنائی نہ دے

# خیال کا پرندہ محوِ ثنا ہے

(''خیالِ طیبہ'' سید محمد ضیاء محی الدین گیلانی کے نعتیہ مجموعے کا پیش لفظ۔ یکم فروری، ۲۰۱۴)

## خیالِ طیبہ قصرِ عشق کا صدر دروازہ

خیالِ طیبہ ہم غلاموں کے دلوں کی ایک ایک دھڑکن میں آباد ہے، ایک ایک سانس میں مقیم ہے، لہو کی ایک ایک بوند میں موجزن ہے، خیالِ شہرِ خنک ہماری سوچ کے ہر ہر انداز کی آبرو ہے، وقت کی ایک ایک ساعت کی آرزو ہے، گردشِ ماہ و سال کی جستجو ہے، لفظ کی ہر شاخ مُشکبو ہے اور قلم کی ہر جنبش باوضو ہے۔ تصورِ شہرِ محبوب ؐ فکر و نظر کی معراج، چشمِ ادب کی سجدہ گاہ اور دیارِ عشق میں کامرانی کی وجہِ دلنشین ہے۔ خیالِ طیبہ ستاروں کے جھرمٹ میں ازل سے مسند نشین ہے اور فضائے بسیط میں رقص کناں ہے۔ اسی شہرِ دلنواز کی پرنور گلیوں کے خیال سے حریمِ دیدہ و دل میں چراغاں ہو رہا ہے۔ خیالِ طیبہ ہی سے جوارِ گنبدِ خضرا میں اڑنے کی آرزو کو پرِ پرواز ملتے ہیں، بادِ بہاری کو وجد میں آنے کا عندیہ عطا ہوتا ہے، فصیلِ آرزو پر چراغ جلتے ہیں، صبا توصیفِ مصطفیٰ کے گلاب سجاتی ہے اور مشامِ جاں کو معطر کرتی ہے۔ خیالِ طیبہ قصرِ عشق کا صدر دروازہ ہے۔ اس دروازے سے گذر کر ہی صبا ایوانِ نعت میں شمعِ عشق فروزاں کرتی ہے، اسی دروازے سے گزر کر زائرِ مدینہ کو درِ آقاؐ پر حاضری کا پروانہ عطا ہوتا ہے، شہرِ قلم میں پھول کھلتے ہیں اور رنگوں، روشنیوں اور خوشبوؤں کا وردِ مسلسل عمل میں آتا ہے، فضائیں درود و سلام کی رم جھم میں بھیگ جاتی ہیں:

میں کرتا ہوں ذکرِ رسولِ معظم
ازل سے مری ہمنوا روشنی ہے

## وارداتِ قلبی اور خود سپردگی کی خلعتِ فاخرہ

اسی روشنی کی ہمنوائی میں ''خیالِ طیبہ'' قرطاس وقلم کی زینت بنا ہے۔ سید محمد ضیا محی الدین گیلانی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ ان کی شاعری خود نمائی اور خود ستائی میں ملوث نہیں ہوئی بلکہ ہر وارداتِ قلبی خود سپردگی کی خلعت فاخرہ میں لپٹی ہوئی درِ حضورؐ پر کاسہ بکف دکھائی دیتی ہے۔ تصنع اور بناوٹ کا دور دور تک نام ونشان نہیں ملتا۔ شاعر نے گنجلک پن کی ہر شکل سے شعوری طور پر بھی دامن چھڑانے کی سعی کی ہے۔

ہے تمنائے ضیا ایسی حضوری ہو نصیب
ذہن و قلب و روح میں گونجے اذاں یا مصطفیٰ

شاعر کا شعری وژن خوشبوئے اسمِ محمدؐ سے معطر ہے۔ دیارِ عشق ومستی میں ہوائیں ثنائے رسولؐ کے پرچم اٹھائے محوِ التجا ہیں، درود وسلام کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں، سرمدی روشنیوں سے فضا جگمگا رہی ہے، بادِ صبا کے لبوں پر توصیفِ مصطفیٰ کے چراغ جل رہے ہیں۔ چند اشعار دیکھئے:

دل مسلسل جو روشنی میں ہے
ایسا لگتا ہے اُس گلی میں ہے
میرے گھر میں ہے میلاد اُنؐ کا
رحمتوں نے مرا گھر چنا ہے
میں سب سے بڑا تاجور کا سوالی
مجھے کیا کمی ہے، مجھے کیا کمی ہے
میسر ہے توفیقِ مدحت جو تجھ کو
یقیناً ضیا یہ ہنر معتبر ہے

سید محمد ضیاء محی الدین گیلانی نے گیارہ سال کی عمر میں پہلی نعت کہی تھی۔ اگر ذوقِ سفر ہمرکاب رہا تو افقِ نعت پر نئے ستارے دریافت ہوں گے جسے توفیقِ مدحت میسر ہو وہ ہر دوسری تمنا کا کشکول توڑ دیتا ہے، قصرِ شاہی سے اُسے کیا لینا دینا، وہ دنیا کی ہر چاہت سے بے نیاز ہوجاتا ہے، صرف محبوبؐ کی گلی کا طواف ہی اُس کا مقصودِ حیات ٹھہرتا ہے۔ شاہ صاحب جادۂ عشق پر رواں دواں ہیں۔ اللہ کرے مرحلۂ شوق کبھی طے نہ ہو۔

تمنا نہیں تختِ شاہی کی مجھ کو
مرے واسطے اُنؐ کا در معتبر ہے
گداؤں کی ہے بھیڑ چوکھٹ پہ اُنؐ کی
یہ سارا جہاں اُنؐ کے در کا گدا ہے

یہ کائناتِ رنگ و بو آقا علیہ السلام کے قدموں کی خیرات ہے اور ہم غلاموں کا اعزاز یہ ہے کہ ہمارا ہر لمحۂ حیات اسی خیرات کا طلب گار ہے، حشر کے دن بھی ہم اسی خیرات کے تمنائی ہوں گے، سارے زمانے، ساری صدیاں، اسی درِ عطا پر کشکولِ گدائی لے کر آقائے محتشمؐ کے قدموں کے دھوون کے منتظر ہیں۔ شاعرِ ''خیال طیبہ'' بھی کرم کی اک نگاہ کا منتظر ہے۔ اسے یقین ہے کہ سراب میں بھٹکنے کا یہ عرصۂ محشر مختصر ہے۔ درِ عطا پر عطاؤں کی بارش مسلسل ہوتی رہتی ہے۔ ایک دن اس کے مقدر کا ستارا بھی ضرور چمکے گا۔ اس کا دامنِ آرزو بھی طلب کے پھولوں سے بھر جائے گا۔ یہی تیقن قصرِ ایمان کی بنیاد ہے۔ اس تیقن کا اظہار سید محمد ضیا محی الدین گیلانی کی نعت میں تواتر سے ہوا ہے۔ اللہ کی رحمتیں حضورؐ ہی کے صدقے میں برستی ہیں اس لیے کہ ربِ کائنات کے بعد ہمارے آقاؐ ہی مختارِ کائنات ہیں۔ حشر کا دن شافعِ محشر کے اختیارات اور تصرفات کے ظہور کا دن ہے۔

یارسول اللہ لوائے حمد کے وارث ہیں آپؐ
ذات برحق آپؐ کی ہے شافعِ روزِ جزا

سید محمد ضیاء محی الدین گیلانی خوش قسمت ہیں کہ انھوں نے ''خیالِ طیبہ'' میں جن خیالات کو سپردِ قلم کیا ہے وہ بوصیریؒ سے اقبالؒ تک اور اقبالؒ سے حفیظ تائبؒ تک ہر دور میں نعت کے مقبول موضوعات گردانے گئے ہیں اور کائناتِ ارض و سما کے آخری لمحے تک بلکہ قیامِ حشر کے بعد بھی حضورؐ کے شمائل، فضائل، خصائل اور خصائص ہی ثنائے حضورؐ کا اساسی رویہ بنے رہیں گے اس لیے کہ نعت درود و سلام کے پیکرِ شعری کا نام ہے اور اس نام کے مقدر میں حرفِ زوال لکھا ہی نہیں گیا۔ ''خیالِ طیبہ'' سے چند مزید مثالیں درج کر رہا ہوں۔

آپؐ کے اک تبسم کا اعجاز ہے
رنگ نکھرا ہے جو اس چمن زار کا

لے کے بہار آئے ہیں دنیا میں مصطفیٰ
سب موسموں کی شان تو میرے حضورؐ ہیں

سو بار فدا ایسی قضا پر میرا جینا
آجائے اگر مجھ کو قضا شہرِ نبیؐ میں

قرآن جو پڑھتے ہو تو یہ دھیان میں رکھو
حاصل ہے تمھیں صاحبِ قرآن کی نسبت

اس خدا کو خدا جانتا ہوں
جو مرے مصطفیٰ کا خدا ہے

### حمد اور خیالِ طیبہ

حمد میں بھی خیالِ طیبہ کی آرزو ہو تو مقدر اوجِ ثریّا سے بھی پرے چمکنے لگتا ہے۔ حضورؐ شافعِ محشر ہیں، ہمارے عیبوں پر پردہ ڈال کر ہم گناہ گاروں، خطا کاروں اور سیاہ

کاروں کو شفاعت کی نوید سنا رہے ہیں۔ حضورؐ ہی ہمارے ماویٰ و ملجا ہیں، بے سہاروں کا سہارا بھی آپؐ ہی ہیں۔ شاعر ''خیالِ طیبہ'' حرفِ التجا بن کر درِ حضورؐ پر محوِ ثنا ہے۔ تاجدارِ کائناتؐ قاسم ہیں، مخلوقِ خدا میں خدا کی نعمتیں تقسیم کرتے ہیں۔ یہ مضمون کئی بار مختلف انداز میں قلم بند ہوا ہے اور خوب ہوا ہے۔ ''خیالِ طیبہ'' کی کم و بیش ساری نعتیں غزل کی ہیئت میں ہیں لیکن ایک آدھ پابند نظمیں بھی شامل ہیں۔ زیادہ نعتیں چھوٹی بحر میں ہیں۔ طویل بحور میں بھی نعت کی مثالیں ملتی ہیں۔ لیکن کم کم، زبان انتہائی سادہ مگر دلنشین ہے، ابلاغ ہی ابلاغ، ابہام کے چھینٹے شاعر نے اپنی شاعری پر پڑنے نہیں دیئے۔ کربلا کا استعارہ بھی کثرت سے ملتا ہے۔ سید صاحب کا نعتیہ کلام مضمون آفرینی اور اثر پذیری کے حوالے سے اپنی مثال آپ ہے۔ غیر مشروط وابستگی کا اظہار موصوف کی نعت کا بنیادی حوالہ ہے۔ بعد از خدا بزرگ توئی کی بازگشت ''خیالِ طیبہ'' کے ورق ورق پر محیط ہے، ہر مصرع تر اسی بازگشت کی چادر میں لپٹا ہوا ہے۔ خاکِ مدینہ ہی آرزوؤں کا مرکز ہے، غبارِ مدینہ ہی روشنیوں کا منبع ہے، مدینہ مرجعِ عاشقاں ہے اس لیے کہ اس سر زمین کو حضورؐ کے قدموں کو بوسہ دینے کا اعزازِ لازوال حاصل ہوا ہے۔ آپؐ کا گھر وہ عظیم گھر ہے جہاں فرشتوں کو بھی بلا اجازت داخل ہونے کی اجازت نہیں۔ اللہ کرے قیامِ حشر تک فکر و خیال کا پرندہ جانبِ طیبہ محوِ پرواز ہی نہیں محوِ ثنا بھی رہے اس یقین کے ساتھ کہ کائناتِ نعت میں سورج کبھی غروب نہیں ہوگا۔

# دامنِ شعر میں مطافِ حمد کی رم جھم

## نورین طلعت عروبہ کے شعری مجموعہ رَبَّنَا کا تعارف

(۲۰۱۵ء)

وہ اپنے بندوں پر انتہائی مہربان اور شفیق ہے۔ وہ حاجت روا بھی ہے اور مشکل کشا بھی، وہ سمندروں کو خروش عطا کرتا ہے۔ روشنی کو اجالے کا ہنر دیتا ہے۔ اسی کے حکم سے بنجر زمینوں پر شاداب موسم اترتے ہیں، پتھر میں کیڑے کو رزق دیتا ہے۔ وہی اپنے بندوں کے لئے آسانیاں پیدا کرتا ہے، بندہ اپنے خالق کا احسان مند کیوں نہ ہو، حروف تشکر اس کی زبان پر کیوں نہ سجدہ ریز ہوں، جلال و جمال خداوندی کے پس منظر میں جب کلماتِ تشکر و امتنان شعر کے پیکرِ دلکش میں ڈھلتے ہیں تو نغمۂ حمد قرطاس وقلم پر نازل ہوتا ہے۔ دل کی ہر دھڑکن اس نغمۂ حمد کو اپنے لبوں پر سجا لیتی ہے اور بندگانِ خدا کو شعورِ بندگی عطا کرتی ہے۔ ''رَبَّنَا'' نورین طلعت عروبہ کے حمدیہ کلام کا مجموعہ ہے۔ آپ ممتاز نعت نگار ہیں۔ ان کی نعت نگاری کا اعتراف قومی سطح پر بھی کیا جاچکا ہے۔

نورین طلعت عروبہ نے دامنِ شعر میں جو مطافِ حمد تخلیق کیا ہے وہ سجدوں ہی سے آباد نہیں بلکہ آنسوؤں، ہچکیوں اور سسکیوں سے بھی معمور ہے۔ قدم قدم پر سوز و گداز کی ان گنت مشعلیں جل رہی ہیں، کشور دیدہ و دل میں شعور بندگی کی ان گنت ضیائیں روشن ہیں۔ عروبہ کے حمدیہ کلام میں لوح وقلم ہی محوِ ثنا نہیں، نطق و بیان بھی محوِ التجا ہیں۔

ذرّے زمین پر تری تعریف میں مگن
ماہ و نجوم چرخ کے اُس پار سجدہ ریز
جب چاہوں تری نعمتیں کاغذ پہ رقم ہوں
مَس کر کے قلم سورۃ رحمٰن سے لکھوں

''رَبَّنَا'' میں شامل کلام غزل کی ہیئت میں ہے، ایک کے سوا ہر حمد میں سات اشعار ہیں۔ اس حمدیہ مجموعہ میں ایک بھی مقطع نہیں، لاشعوری طور پر شاعرہ نے اپنی ذات کی نفی کر کے اپنے خالق کی ذاتِ مقدسہ کے آگے سر جھکایا ہے کہ وہی ایک ذات ہے جسے فنا نہیں۔ وہ ازل بھی ہے اور ابد بھی۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ سے ہے اور اُسے ہمیشہ ہمیشہ باقی رہنا ہے، شاعرہ نے اس عقیدے کو مرکز ومحور بنایا ہے کہ آسمانوں سے اترنے والی روشنی محلات ہی میں نہیں غریب کی جھونپڑی میں بھی یکساں نزول کرتی ہے۔

جذبات ہیں کہ میرے قابو میں ہی نہیں ہیں
اور کہنا چاہتی ہوں جذبات سے زیادہ
مرے چمن میں کھلائے سدا بہار گلاب
مرے نصیب کی پت جھڑ کو بھی بہار کیا

نورین طلعت عروبہ ایک پرامن معاشرے کی تمنائی ہیں، اس معاشرے میں تو غریب کو سانس لینے کی بھی اجازت نہیں، اس میں غریب کے بچوں سے آخری نوالہ بھی چھینا جارہا ہے انہیں یقین ہے کہ صورت حال ضرور بدلے گی، اولادِ آدم کا دامن امن اور سلامتی کے پھولوں سے ایک بار پھر مہک اٹھے گا۔ نخلِ تمنا کی ہر شاخ پر پھول کھلیں گے، یقین کی چاندنی ان کے شعری وژن میں اترتی دکھائی دیتی ہے۔ عجز وانکسار کے جگنو مشعلیں لیے فضاؤں میں اُڑ رہے ہیں۔ فصیلِ شہرِ آرزو پر چراغاں ہو رہا ہے۔ نئی نئی تراکیب نے تفہیمِ شعر کے مقفل دروازوں پر دستک دی ہے۔ مثلاً گلابِ اسد، نکہتِ فہم، قریۂ فکر، دعائیہ انداز اور التجائیہ اسلوب ان کی حمدیہ شاعری کو انفرادیت کا رنگ دیتا ہے۔ منظر نگاری ان کے شعر کا زیور ہے۔ دعا ہے ربِ قدیر انہیں شہرِ سخن میں مزید چراغاں جلانے کی توفیق دے اور ان کے آنسوؤں کی سجدہ ریزی کو قبول فرمائے۔

جو ملتزم سے لگی ہے قبولیت کے لیے
میں چاہتی ہوں مجھے تو وہی دعا کر دے

(ریاض حسین چودھری)

# تخلیقی حسن کا اسلوبِ نعت

## پیش لفظ ''ذکرِ شہِ والا ﷺ'' نعتیہ مجموعہ سید ریاض حسین زیدی

(یکم محرم الحرام، ۱۴۳۲ھ، ۲۰۱۲ء)

ہدایت آسمانی کا ہر پیغام امن و سلامتی کا پیغام ہے۔ امن دائمی کی آرزو قدرت کی طرف سے روزِ ازل ہی اولادِ آدم کو ودیعت کردی گئی تھی۔ ابتدائے آفرینش ہی سے ابلیسی قوتیں انسانی معاشروں کو انتشار، بدامنی اور قتل و غارتگری کے عفریت کا رزق بنانے کی سازشوں میں مصروف ہیں۔ انبیاء کے ظہور کا مقصد انسان کو صراطِ مستقیم پر گامزن رکھنا اور دائمی امنِ عالم کو یقینی بنانا تھا۔ نبیِ آخرالزماں ﷺ امن و سلامتی کے سب سے بڑے داعی ہیں۔ کائناتِ ارض و سما کی تمام مخلوقات کی تمام تر محبتوں اور عقیدتوں کا مرکز و محور آقائے محتشم ﷺ کی ذاتِ اقدس ہی ہے، مکینِ گنبدِ خضرا سے غلامی کا رشتہ استوار کیے بغیر نہ گلوبل ویلج کا تصور مکمل ہوسکتا ہے اور نہ امنِ عالم کے خواب ہی کو تعبیر مل سکتی ہے۔

نعت تاجدارِ کائنات ﷺ سے رشتۂ غلامی استوار کرنے کا مؤثر ترین وسیلہ ہے، نعت درود و سلام کے پیکرِ شعری کا نام ہے اور درود و سلام کا ایک ایک حرف امن و سلامتی کا سرمدی عہد نامہ ہے۔

اقلیمِ نعت میں سید ریاض حسین زیدی کی آمد بوجوہ قدرے تاخیر سے ہوئی لیکن زیدی صاحب اپنے تخلیقی سفر پر جس ذوق و شوق سے گامزن ہوئے ہیں اور قدم قدم سجدے گزارتے ہوئے ان کا قلم سوئے مدینہ رواں دواں ہے وہ قابلِ صد تحسین ہی نہیں قابلِ صد رشک بھی ہے۔ ''ریاضِ مدحت''، ''جمالِ سیدِ لولاک ﷺ'' کے بعد اب یہ ذکرِ شہِ والا ﷺ کا ارمغانِ ثنا اپنے آقا و مولا ﷺ کی بارگاہِ بیکس پناہ میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کررہے

ہیں، ریاض حسین زیدی نے فنی اور روحانی ارتقاء کی بلندیاں تیزی سے طے کی ہیں، یہ فنی پختگی مسلسل ریاضت اور اندر کی روشنی آقا علیہ السلام کی خصوصی توجہات ہی سے حاصل ہوتی ہیں۔ وارفتگی اور خودسپردگی کے اوصاف نے انہیں دنیائے شعر میں منفرد مقام عطا کیا ہے۔خود کو نمایاں کرنے کے لیے بے ربط اور بے معنی فلسفیانہ موشگافیوں سے دامن بچائے رکھنا ایک اضافی خوبی ہے۔ متانت، سنجیدگی اور شائستگی کے چراغ خود فریبیوں کی آندھیوں میں نہیں جلتے، ریاض حسین زیدی کا اسلوبِ نعت ہر قسم کے گنجلک پن، تصنع اور بناوٹ سے پاک ہے۔ خدا اس اسلوبِ نعت کو تخلیقِ حسن کی تمام تر رعنائیوں کے جھرمٹ میں روشن رکھے۔

ہم غلامانِ پیمبرِ امنؐ رعایا ہیں تاجِ مدینہ کی، تاجِ مدینہ تو تاجِ مدینہ، ہم تو کومٹڈ ہیں خاکِ مدینہ کے ذرے ذرے سے، ہماری یہ کومٹ منٹ غیر مشروط اور غیر متزلزل ہے۔ اللہ کرے وابستگی کا یہ نور روزِ محشر بھی بانیانِ قعرِ نعتِ مصطفیٰ کی جبینوں میں روشن رہے۔ کاش، حسان بن ثابتؓ کے کاروانِ مدحت نگاراں میں مجھ جیسا کمتر اور ناچیز انسان بھی سید ریاض حسین زیدی کی انگلی تھامے شامل ہو، زہے نصیب۔

# روحانی رتجگوں کا اِستعارہ

## صاحبزادہ شبیر احمد کمال عباسی کے مجموعہ نعت ''بحضور'' پر اظہار خیال

(۲۷ فروری ۲۰۱۳ء)

مبارک کے مستحق ہیں وہ عظیم المرتبت خانوادے جو اپنی نسل نو کو اپنا ثقافتی اور روحانی ورثہ ہی منتقل نہیں کرتے بلکہ نئی نسل کو روشنی سے اکتسابِ شعور کا ہنر بھی سکھاتے ہیں۔ یوں ثقافتی اکائی کو تحفظ کی رِدا ملتی ہے اور روحانی اثاثے محفوظ ہاتھوں میں منتقل ہوتے ہیں، اِس شعوری عمل سے روحانی اور تخلیقی منطقوں میں علومِ جدیدہ کے دروازے وا ہوتے ہیں اور روایتِ علمی آگے بڑھتی ہے۔ ڈاکٹر صاحبزادہ شبیر احمد کمال عباسی القادری کا تعلق بھی ایک ایسے ہی علمی اور روحانی گھرانے سے ہے جہاں شعر کے پھول بھی کھلتے ہیں اور فکر و نظر کے قافلے بھی خیمہ زن ہوتے ہیں۔ ''کوئے فنا''، ''صحرائے جنوں'' اور ''ایوانِ بقا'' جیسے شعری مجموعے ڈاکٹر صاحب کی گہری سوچ کے تخلیقی اظہار کے شفاف آئینے ہیں۔ آپ کا تازہ شعری مجموعہ ''بحضور'' اسی سلسلے کی ایک دلآویز کڑی ہے جو اپنے عہد کے فکری رویوں کی ہی آئینہ دار نہیں، آنے والی دہائیوں میں شعری قدروں کے ارتقائی مراحل کی بھی نشاندہی کرتی ہے، ''بحضور'' حمد و نعت و منقبت پر مشتمل خوبصورت مجموعہ ہے جو اکیسویں صدی کے نعتیہ سرمائے میں قابلِ قدر اضافہ ہے، ''بحضور'' کی پہلی حمد کا ایک شعر ؎

ہمارا کیا ہے، سبھی ہے تیرا، یہ جان و ایماں یہ ہستی اپنی
ہمارے دل میں خیال تیرا، کمالِ حسنِ نظر بھی تیرا

نعت کا سفرِ تخلیق کائنات کے پہلے دن ہی سے جاری ہے۔ ہر صدی کے سر پر نعت کا تاج سجایا جاتا رہا ہے اور سجایا جاتا رہے گا۔ کوئی ایک لمحہ بھی ثنائے حضورؐ سے خالی

نہیں، ہر زمانہ میرے حضورؐ کا زمانہ ہے۔ جب اکیسویں صدی کی آخری دہائی میں جدید تر اردو نعت کا جائزہ لیا جائے گا تو ڈاکٹر صاحب کا مجموعہ حمد و نعت و منقبت بھی کئی حوالوں سے اپنی الگ شناخت کراتا نظر آئے گا۔ ڈاکٹر صاحب کے فنِ شعر کی جڑیں ادبِ عالیہ کی زمین میں دور تک چلی گئی ہیں۔ ان کی شاعری کلاسیک شاعری کی زندہ روایت ہی کا تسلسل ہے۔ زبان و بیان کے ارتقائی مراحل کو کسی مرحلے پر بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔ ان کا فنِ شعر بلاغت اور فصاحت کے تقاضوں کو کماحقہ پورا کرتا دکھائی دیتا ہے۔ دل کی بات دل سے نکل کر دل ہی میں پیوست ہوجاتی ہے۔ فلسفیانہ موشگافیوں سے شعوری طور پر بھی اجتناب کیا گیا ہے جو ان کی بالغ نظری کا ایک روشن ثبوت ہے۔

نعت کی جامع اور مختصر تعریف ان الفاظ میں کی جاتی ہے کہ نعت درود و سلام کے پیکرِ شعری کا نام ہے۔ نعت دل و نظر کی شاعری ہے، نعت اللہ رب العزت کے حکم کی تعمیل ہے۔ ''بحضور'' قرآن سے نعت گوئی سیکھنے کی آرزو کے عملی اظہار کا مظہر ہے۔ ''بحضور'' کی پہلی نعت ہی شاعر کے شعری وژن کی وسعت کی طرف بھرپور اشارہ کرتی ہے۔

محمدؐ شمعِ بزمِ مرسلاں
محمدؐ پیشِ نظر عارفاں
محمدؐ رحمتِ ہر دو جہاں
محمدؐ قبلۂ کون و مکاں

شاعر نے ایک ایسی پاکیزہ فضا تخلیق کی ہے جس میں انوار الٰہیہ کی مسلسل بارش ہورہی ہے، محبت رسولؐ کی چاندنی پرفشاں ہے۔ فضائے نعت خوشبوئے اسمِ محمدؐ سے معطر ہے، شعور اور لاشعور دونوں درِ اقدس پر دست بستہ دکھائی دیتے ہیں، یہی ایک نعت انہیں دنیائے ادب میں زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔ تخلیق کار کے تہذیبی، ثقافتی، سماجی، سیاسی اور روحانی نظریات لاشعوری طور پر اس کے فن میں در آتے ہیں، اسی لیے کہا جاتا ہے کہ

فن تخلیق کار کی اپنی ہی شخصیت کے جمالیاتی اظہار کا نام ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس معیار پر سو فیصد پورا اترتے ہیں۔ روحانیت غیر محسوس طریقے سے ان کے شعری وژن میں اجالے بکھیر رہی ہے۔

خوبصورت تراکیب خوبصورتیوں کی تخلیق کا باعث بنتی ہیں اور مفاہیم کی ترسیل میں معاون ثابت ہوتی ہیں، تراکیب کی ایک کہکشاں آسمانِ شعر کے ہر اُفق پر پھیلی ہوئی ہے، مثلاً لقائے نور احمدؐ، مرجعِ صبر و رضا، صاحبِ اوصافِ ربانی، خلعتِ فقر و سخا، حجتِ بزم ولایت، مصدرِ جُود و کرم، امیرِ معرکۂ کربلا۔ جذبات کی اثر انگیزی اپنی مثال آپ ہے، ایک سبک ندی کا بہاؤ، ایک خوبصورت آہنگ دامنِ دل کو کھینچتا ہے ؎

سلام اُنؐ پر کہ جو ہیں قاسمِ الفاظِ ربانی
سلام اُنؐ پر کہ جن کا دستِ قدرت دستِ یزدانی
سلام اُنؐ پر کہ جن کو عاصیوں کی لاج کہتے ہیں
سلام اُنؐ پر کہ جن کو صاحبِ معراج کہتے ہیں

دیدہ و دل پر تجلیات کی ایمان افروز بارش کا منظر دیدنی ہے، لغت ہاتھ باندھے کھڑی ہے، اظہار بھی دلآویز، افکار بھی خوبصورت، خوشبوئیں وجد میں ہیں، تصورات کے جگنو مسلسل رقص کے عالم میں ہیں، درودوں کی تتلیاں چہار سمت پرفشاں ہیں ؎

اُنؐ کی نظر سے بزمِ جہاں میں ہے روشنی
کرنیں سی پھوٹتی ہیں رخِ ماہ تاب سے
آپؐ کی ذاتِ مقدس مصدرِ انوار ہے
منتہائے قدسیاں، خیرالوریٰ، صلِ علیٰ

کربلا کا استعارہ نسبتِ رسولؐ کے چراغ لیے تخلیق کی شاہراہ پر رواں دواں

ہے، شاعر کا قلم بھی بے خودی اور خود فراموشی کے سمندر میں ڈوبا ہوا ہے۔ بے ساختہ پن ان کی شاعری کا ایک بنیادی وصف ہے۔ لمحہ لمحہ وارفتگی اور خود سپردگی کا آئینہ دار ہے۔ فارسی زبان و ادب سے آشنائی ان کے نعتیہ ادب کا ایک منفرد پہلو ہے۔ اِن کا کشکولِ آرزو فارسی زبان و ادب کی شیرینی سے لبریز ہے۔ نعت میں استغاثے کا رنگ بھی نمایاں، شاعر دامنِ آرزو درِ اقدس پر پھیلائے نگاہِ کرم کا ملتجی ہے۔

والیِ شہرِ کرم، بس اک نظر!
یا کریمِ دو جہاں فریاد ہے

میری خاموشی کے کاسے پر پڑی اُنؐ کی نظر
میرے دامن میں دو عالم کی عطا کرتے گئے

مُلّا کی طلب ثروتِ دنیا سے کمالؔ آہ
ہم کعبے میں محبوبِؐ خدا مانگ رہے ہیں

محتاج سب انہیؐ کے
وہ صاحبِ عطا ہیں

صاحبؐ عطا کا درِ عطا کبھی بند نہیں ہوتا، رحمتوں کے کواڑ کبھی مُقفل نہیں ہوتے، عافیت کے دریچے کھلے رہتے ہیں، کرم کی بادِ بہاری خلدِ سخن کی پگڈنڈیوں پر رواں دواں رہتی ہے۔ اللہ ڈاکٹر صاحب کے شہرِ تخیل کو خاکِ مدینہ کی تجلیات سے منور رکھے۔ میں اپنی گزارشات کو ڈاکٹر صاحب کے اس شعر کے ساتھ سمیٹتا ہوں۔

ہم سے ادائے حقِ ثنا کیا ہو اے کمالؔ
شانِ نبیؐ لکھی ہے خدا کی کتاب میں

ریاض حسین چودھری

شہرِ اقبال، ۲۷ فروری ۲۰۱۳ء

# خوشبو تریؐ جوئے کرم : منظر اور پیش منظر

خوشبو تریؐ جُوئے کرم نعتیہ شعری مجموعہ: ریاض ندیم نیازی

قلم کی یہ مجال اور اربابِ قلم کی یہ جرأت کہاں کہ وہ ضیاعِ ازل کی تخلیقِ بے مثالؐ کے اوصافِ جمیلہ محامد و محاسن کو حیطۂ تحریر میں لانے اور اس منصبِ جلیلہ کا حق ادا کرنے کا تصور بھی ذہن میں لاسکیں۔ ہم غلامانِ کمتریں کی تو ہر سوچ ہی مواجۂ اقدس میں حرفِ التجاء بن کر، سر جھکائے، حضورؐ کی چشمِ کرم کی آرزومند رہتی ہے۔ یہ اعزازِ لازوال تو مقدر سے ملتا ہے۔

پاکستان ''غلامانِ محمدؐ'' کا حصارِ آہنی ہے۔ ارضِ وطن کی بھیگی ہوائیں بھی درودوں کے گجرے اور سلاموں کی ڈالیاں لئے درِ آقاؐ پہ اذنِ حضوری کی منتظر رہتی ہیں۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آج میرے پاکستان کا گوشہ گوشہ نعتِ حضورؐ کی ضیا پاشیوں سے منور ہے۔ فصیلِ ارضِ وطن پر دیدہ و دل کے انہی سرمدی چراغوں کی روشنی ہے۔ ہزار آندھیوں کے باوجود ان چراغوں کی روشنی مدھم نہیں ہوسکی اور نہ ہوسکتی ہے۔ بلاشبہ ''نعت'' وطنِ عزیز کی ثقافتی اور نظریاتی اکائی کا بلیغ استعارہ ہے۔ سب علامتیں اِسی استعارے سے روشنی مستعار لیتی ہیں۔

اکیسویں صدی بھی حضورؐ ہی کی صدی ہے۔ ہر زمانہ حضورؐ کا زمانہ ہے اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں جدید اردو نعت کے افق پر جو ستارے طلوع ہوئے ہیں ان میں ایک اہم نام ریاض ندیم نیازی کا بھی ہے۔ ''خوشبو تریؐ جوئے کرم'' ان کا پہلا نعتیہ مجموعہ ہے۔ اس سے قبل آپ منتخب نعتوں کے متعدد مجموعے ترتیب دے چکے ہیں جو کئی حوالوں سے خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ ریاض ندیم نیازی کے ہاں سادگی کا حسن اپنی رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ بے ساختہ پن آپ کے فن کا اساسی رویہ ہے۔

میری بینائیاں عرش سے جا ملیں
دیدہ ور آئینہ دیکھتے رہ گئے

اِن کا شعری وژن رنگوں، روشنیوں اور خوشبوؤں سے آباد ہے۔ یہ رنگ، روشنیاں اور خوشبوئیں جب درِ اقدسؐ پر عجز اور خود سپردگی کے چراغ جلاتی ہیں تو ''خوشبو تریؐ جوئے کرم'' کا منظر ہی نہیں، پیش منظر بھی روشن ہوجاتا ہے۔ میری دعا ہے کہ ریاض ندیم نیازی کو بارگاہِ رسالت مآبؐ سے سندِ جواز عطا ہو اور حرفِ پذیرائی ان کا مقدر بنے۔
(آمین)

ریاض حسین چودھری
(شہر اقبال۔۔۔۱۴ اگست ۲۰۰۹ء)

فروری ۱۹۹۷ء

# فرش پر عرش کے شاعر کا شعری وژن

سید محمد اشرفی جیلانی کچھوچھہ شریف فیض آباد انڈیا کے
نعتیہ مجموعہ ''فرش پر عرش'' پر ایک نظر

کسی بھی تخلیق کار کی تخلیق کو نقد و نظر کی کسوٹی پر پرکھنے سے پہلے خود صاحب تخلیق کے عمرانی، سماجی، ثقافتی، تہذیبی، مجلسی اور روحانی افکار و نظریات کے پس منظر سے ہی نہیں بلکہ اس کے پیش منظر سے بھی آگاہی ضروری ہے کیونکہ تخلیق، تخلیق کار کی اپنی شخصیت ہی کے جمالیاتی اظہار کا نام ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ تخلیق کار کی سوچ کے مختلف زاویے اور رویے اس کی تخلیق میں شعوری یا لاشعوری طور پر در نہ آئیں۔ اگر یہ زاویے اور رویے اخباری کالموں جیسے ردعمل کے مظہر ہوں تو وہ تخلیق پروپیگنڈے کی حدود میں مقید ہوکر اپنی اہمیت کھو بیٹھتی ہے، تب ایک تخلیق کار اور ایک ڈھول پیٹنے والے اجرتی میں کوئی فرق باقی نہیں رہ جاتا لیکن اگر ردعمل تخلیق کار کے لہو میں شامل ہوکر اس کی رگوں میں گردش کرنے لگے اور تخلیق کار کے دل کے تاروں پر ایک جہانِ معانی آباد ہوجائے اور اس جہان میں سوز و گداز کے پیکر اترنے لگیں تو یہ تخلیق جمالیاتی حوالے سے بھی افق شعر و ادب پر ایک شاہکار بن کر طلوع ہوتی ہے اور اس کا شمار ادب عالیہ میں ہونے لگتا ہے، اس کے برعکس اگر تخلیقِ ادب کا دعویٰ بھی کیا جائے اور اپنے عہد کی آوازوں پر اپنی سماعت کے کواڑ بند بھی کر لیے جائیں اور دلخراش مناظر دیکھ کر اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ لی جائے کہ ہم تو ادب کو زندگی کی ہوا تک نہ لگنے دیں گے تو اسے منافقت کے علاوہ کوئی دوسرا نام نہیں دیا جاسکے گا۔ تخلیق کار کے اردگرد پھیلی ہوئی کثافتوں اور لطافتوں دونوں کا فکری سطح پر ادراک اس لیے بھی ضروری ہے کہ ہر فن پارے کے اندر جو زیریں لہر رواں دواں ہوتی ہے اور ظاہر کی آنکھ سے ہمیشہ اوجھل رہتی ہے انہی کثافتوں اور لطافتوں کی مختلف صورتوں

کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ چنانچہ ضروری ہوتا ہے کہ ان دونوں کی جزئیات تک کا اس طرح مطالعہ کیا جائے کہ زیرِ بحث فن پارہ اپنی تمام تر تفہیمات کے ساتھ قاری کے ذہن میں روشن ہوجائے اور باطنی اور ظاہری سطح پر کوئی ابہام باقی نہ رہے، ''فرش پر عرش'' تحریک پاکستان کے ممتاز رہنما سید محمد اشرفی الجیلانی کچھوچھوی محدث اعظم ہند کے عارفانہ، حکیمانہ اور نعتیہ کلام پر مشتمل ہے۔ ان کے کلام کا ادبی جائزہ لینے سے پہلے ضروری ہے کہ اس عہد کے سیاسی، سماجی اور ثقافتی رویوں سے بھی بحث کی جائے جن رویوں نے اس شعری مجموعہ کے خالق کے شعری وژن کی حنابندی کا فریضہ سرانجام دیا تھا۔

1857ء کی جنگ آزادی کے بعد ثقافتی اور مجلسی سطح پر اسلامیان ہند کے اندر جو توڑ پھوڑ کا عمل شروع ہوا اس نے مسلمانوں کی فکری اور نظری بنیادوں تک کو ہلا دیا۔ ان پر مصائب و آلام کا کوہ گراں ٹوٹ پڑا۔ ان پر سرکاری ملازمتوں کے دروازے بند کردیے گئے، معاشی طور پر ان کے قتل عام کی سازش کی گئی، مغلیہ سلطنت آخری ہچکی لے کر تاریخ کے سینے میں دفن ہوچکی تھی۔ ایشیا کے اس اہم خطے میں ایک نیا معاشرہ جنم لے رہا تھا۔ افق در افق نئے امکانات کے آثار نمایاں ہورہے تھے، تاریخ از سرِ نو اپنی راہیں متعین کررہی تھی، انگریز نے ہندوستان کی سلطنت مسلمانوں سے چھینی تھی اس لیے انتقام کا پہلا نشانہ بھی مسلمانوں ہی کو بننا تھا۔ ہندو کو مسلمانوں سے اپنی ایک ہزار سالہ غلامی کا بدلہ لینے کا موقع ملا تھا اور وہ اس موقع کو ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتا تھا۔ مسلمانوں کو جسمانی اور روحانی عذاب میں مبتلا کردیا گیا۔ مولانا فضل حق خیر بادی اور دوسرے جید علما کو کالے پانی کی سزا سے برطانوی استعمار کے عزائم کھل کر سامنے آگئے، مسلمانوں کے نظام تعلیم پر کاری ضرب لگائی گئی۔ ان کے ثقافتی اثاثوں کو شکوک و شبہات کے پانیوں کی نذر کردیا گیا۔ اپنے شاندار ماضی سے کٹ کر انہیں زندہ رہنے کی تلقین کی گئی، جان بوجھ کر انہیں ہر شعبہ زندگی میں پسماندہ رکھا گیا۔ مسلم اکثریت کے علاقوں میں صنعتی ترقی کے پہیے کو روک دیا گیا، انگریز اور ہندو کی ملی بھگت سے ہندوستان کا جو سماجی، سیاسی اور ثقافتی منظر نامہ تحریر

ہوا اس میں اسلامیانِ ہند کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔

مسلمانوں کی ذہنی صلاحیتوں کو مفلوج کرنے کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا گیا۔ ان کے اعصاب پر شکست خوردگی کے احساس کو اس طرح مسلط کر دیا گیا کہ وہ شعوری سطح پر بھی اپنی ثقافتی اکائی کے تحفظ کے جذبے کو فراموش کرنے لگے۔ برطانوی استعمار نے فاقہ کش مسلمان کے سینے میں محبتِ رسول کے چراغوں کو بجھانے کے ابلیسی منصوبے پر عمل کا آغاز کر دیا۔ قادیانیت کے پودے کو کاشت کیا گیا اور اس فتنے کی سرپرستی کر کے قصر ایمان میں شگاف ڈالنے کی ناپاک سازش کی گئی۔ حضور ختمی مرتبتؐ کی ذات اقدس کو مباحث کا موضوع بنا کر احترام و اعتماد کی فضا کا دامن تار تار کرنے کی جسارت ہوئی۔ اکبر کے دینِ الٰہی کے بعد ذہنوں میں تشکیک کے بیج بونے کا عمل شروع ہو چکا تھا اور سیکولرازم کی فصل پک کر تیار ہو چکی تھی۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ اور ان کے عظیم رفقاء نے اسلامیان ہند کی فکری رہنمائی کا جو فریضہ سرانجام دیا تھا اور دینِ مصطفٰی کو ہندومت کی آلائشوں سے پاک رکھنے کی سعی فرما کر دوقومی نظریئے کی عملی تفسیر پیش کی تھی اب سرسید، اقبال اور قائداعظم نے اسلامیان ہند کی شیرازہ بندی کا کام اپنے ہاتھوں میں لے رکھا تھا اور عصرِ نو کے تقاضوں کی روشنی میں اسلامیان ہند کے لیے سیاسی بیداریوں کا ایک نیا لائحہ عمل تیار کیا تھا، علما اور مشائخ حجروں سے نکل کر رسم شبیری ادا کر رہے تھے۔ ہر سطح پر شاتمانِ رسول کا تعاقب جاری تھا اور انگریز اور ہندو کی سازش کو بے نقاب کر کے اسلامیان ہند کو اتحاد کی دعوت دی جا رہی تھی۔ مسلم لیگ کا قیام عمل میں آ چکا تھا۔ اقبال کے خطبہ الہ آباد (1930ء) کے بعد اسلامیان ہند کو دوقومی نظریئے کی عملی تفسیر مسلمانوں کے لیے ایک الگ خطے کی صورت میں واضح طور پر نظر آ رہی تھی۔ بلاشبہ علماء و مشائخ نے بنارس سنی کانفرنس کے ذریعہ پاکستان کی بنیادوں کو استحکام عطا کیا اور قومیں اوطان سے بنتی ہیں کا گمراہ کن نعرہ لگانے والے قوم پرستوں کے سارے خواب ہوا میں بکھر کر رہ گئے اور پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ کا

نعرہ ہندوستان کے مسلمانوں کے دل کی دھڑکن بن گیا۔ اس فضا میں جو ادب تخلیق ہوا وہ سیاسی بیداریوں کا بھی آئینہ دار تھا اور فکری حوالوں سے بھی اپنی مضبوط اور توانا روایات کا حامل تھا، اقبال کا عظیم الشان فکری نظام کھوئے ہوؤں سے عبارت ہے، عظمتِ رفتہ کی بازیابی کی وہ تڑپ جو قیام پاکستان کی بنیاد بنی کو تحریک کا رنگ اس وقت ملا جب مسلم لیگ کے مطالبہ پاکستان کو علماء و مشائخ نے اپنا فرض منصبی سمجھتے ہوئے ہندوستان کے کونے کونے میں پہنچایا اور اس مطالبے کو منانے کے لیے سر پر کفن باندھ کر برطانوی استعمار اور ہندو سامراج کے سامنے سینہ سپر ہوگئے، ''فرش پر عرش'' کی شاعری کا خمیر بھی کشتِ دیدہ و دل کی اسی مٹی سے اٹھایا گیا ہے جس مٹی کے ایک ایک ذرے پر ''پاکستان زندہ باد'' کا نعرہ لکھا ہوا ہے وہ نعرہ جسے سن کر لہو کی ایک ایک بوند جھوم اٹھتی ہے اور پلکوں کی دہلیز پر ارضِ دعا کی محبت کے ان گنت چراغ رقص میں آ کر پاکستان کے عظیم شہیدوں کو خراج تحسین پیش کرنے لگتے ہیں۔ اگرچہ ''فرش پر عرش'' کی شاعری براہ راست قومی یا تحریکی شاعری کی ذیل میں نہیں آتی لیکن جو جذبہ اس شاعری کا محرک بنا ہے وہ وہی جذبہ ہے جو اقبال کی شاعری کی بنیاد بنا یعنی عظمت رفتہ کی بازیابی کا سفر، دہر میں اس محمدؐ سے اجالا کرنے کی آرزو۔

اقبالؒ آنے والی ہر صدی کے شاعر ہیں۔ اس لیے کہ انہوں نے اپنے عصر کو ہی متاثر نہیں کیا بلکہ آنے والی نسلوں کے شعری اور فکری شعور کی آبیاری کا فریضہ بھی سرانجام دیا ہے، ''فرش پر عرش'' کا شاعر بھی اسی وقار و اعتماد اور اسی آہنگ میں بات کرتا ہے۔ شاعر کا دامن فکری و نظری تضادات سے بالکل پاک ہے۔ وہ ایک نظریاتی شاعر ہے اور اپنے عقائد اور سماجی رویوں کے بارے میں کسی ابہام کا شکار نہیں لیکن وہ اپنی مقصدی شاعری کو اشتہار کا مضمون بھی بننے نہیں دیتا۔ کہیں بھی تخلیق کے آبگینوں کا خون نہیں ہوتا۔ سید صاحب کا نقطہ نظر یہ ہے کہ شعر کو پہلے شعر ہونا چاہیے پھر اس سے مقصدیت کے چراغ بھی جلائے جاسکتے ہیں۔ آپ شباب و شراب کے شاعر نہیں بلکہ ''فرش پر عرش'' کی شاعری

قلوب کی تطہیر اور فکر کی پاکیزگی کی شاعری ہے۔ غزل کا رچاؤ پوری تخلیقی توانائی کے ساتھ ان کو شہرِ سخن میں رعنائیوں کے جھرمٹ میں جلوہ گر ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ مسائل حیات پر گہری نظر رکھتے ہیں اس لیے کہ ان کا نظریاتی تشخص کسی مفروضے پر قائم نہیں بلکہ ٹھوس حقائق اور دلائل پر ان کے شعری وژن کی بنیاد استوار ہے، ذات سے کائنات کے سفر میں یہ اپنے نصب العین کو کبھی اوجھل نہیں ہونے دیتے۔ یاسیت کی ان کے فن کو ہوا بھی نہیں لگی۔ قدم قدم پر رجائیت کا سورج طلوع ہوتا نظر آتا ہے۔ ان کی شاعری ہمارے ثقافتی رویوں کے دلآویز مظہر کا نام ہے جو اپنے قاری کو بھی اطمینان قلب کی دولت عطا کرتی ہے۔ یہ ایک عارف کامل کی شاعری ہے جس میں مسائل تصوف کا بیان بھی ہے اور رموز حیات کی پردہ کشائی بھی کی گئی ہے۔ شاعر نے عصری آوازوں سے اثر ضرور قبول کیا ہے لیکن آوازوں کے اس چنگل میں اپنے منفرد لہجے کی پہچان کرانے میں بھی کامیاب رہے ہیں۔ غالبؔ نے وبائے عام میں مرنا بھی پسند نہیں کیا تھا۔ سید صاحب کی انفرادیت پسندی دیکھئے:

اس بھنور سے نہ الٰہی مری کشتی ابھرے
جس کی ہر موج کا دستور ہے ساحل دینا

گویا وہ جہد مسلسل کے قائل ہیں، تندی بادمخالف کو خاطر میں نہیں لاتے، وقت کے چیلنجوں کو قبول بھی کرتے ہیں اور دشوار گذار بھاٹیوں کو عبور کرنے کا طنطنہ بھی رکھتے ہیں۔ اگر سید صاحب کے دامن خیال میں یہی ایک شعر ہوتا تو صرف یہی ایک شعر انہیں دنیائے شعروسخن میں زندہ رکھنے کے لیے کافی ہوتا۔ شاعر کے تیور دیکھئے۔

عشقِ بتاں نے صاحب ایماں بنا دیا
اس کافری نے مجھ کو مسلماں بنا دیا

''فرش پر عرش'' کی زیادہ تر منظومات غزل کی ہیئت میں کہی گئی ہیں اور باقاعدہ

ان کے عنوانات باندھے گئے ہیں، غزل کی ہیئت ہی نہیں غزل کا مزاج بھی اپنایا گیا ہے اور تخلیقی سطح پر غزل کی روح کو بھی محسوس کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مشکل لیکن غیر مانوس ردیفیں سید صاحب کی قادرالکلامی کا منہ بولتا ثبوت ہیں مثلاً تعویذ، گھمنڈ، باعث پہاڑ، خاموش وغیرہ، عنوانات خوبصورت اور بامعنی تراکیب پر مشتمل ہیں اور شاعر کی علمی وجاہت کے آئینہ دار ہیں مثلاً رازِ پنہاں، داغ جبیں، جنونِ عشق، صحیفہ نور وغیرہ، اساتذہ کے معروف نعتیہ کلام پر تضمین اور مخمس کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ فارسی اور عربی تراکیب کی کثرت ہے لیکن کہیں بھی اپنی علمیت کے اظہار کا داعیہ نہیں ملتا بلکہ شاعر کا عجز اور انکسار ہی تخلیقی عمل سے گذرتا دکھائی دیتا ہے، اس مجموعہ کلام میں شاعر کا فارسی کلام بھی شامل ہے، شاعر نے مظاہر فطرت کا سرسری مطالعہ نہیں کیا بلکہ اپنی اجتہادی بصیرت سے مشاہدے کی قوت کو مزید استحکام بخشا ہے۔ سادگی کا حسن ایک ایک مصرع میں جلوہ گر ہے۔ بے ساختہ پن شاعر کو قدرت کی طرف سے وافر مقدار میں عطا کیا گیا ہے، محاورے کا استعمال بڑے سلیقے سے کرتے ہیں کہ معانی کی ان گنت پرتیں خود بخود کھلتی چلی جاتی ہیں، ثنائے رسولِ کون و مکاں کے علاوہ ''فرش پر عرش'' میں عظمت صحابہؓ سے محبت اہل بیتؓ تک ہزاروں رنگ بکھرے ہوئے ہیں، کربلا کا استعارہ ان کے شعری اسلوب کی آبرو ہے۔ شہید کربلا کو حریت فکر کی علامت سمجھتے ہیں، شعرائے دربار رسالت مآبؐ حضرت حسان بن ثابتؓ، حضرت کعب بن زبیرؓ اور حضرت عبداللہ بن رواحہؓ نے فن شاعری کو اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کے دفاع میں انتہائی موثر طریقے سے استعمال کیا تھا۔ قلم دو دھاری تلوار سے بھی زیادہ کاٹ رکھتا ہے، اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کے دفاع کی تابندہ روایت ہر دور میں زندہ رہی ہے، زندہ ہے اور زندہ رہے گی اس لیے کہ مدحتِ رسولﷺ کے باب میں دستِ قدرت سے لفظ زوال درج ہی نہیں کیا، والیٔ کون و مکاں کی محبت کے چراغ تو خود خالق کائنات نے روشن کئے ہیں بھلا ان چراغوں کی روشنی کیسے مدہم ہوسکتی ہے؟ قرآن آسمانی ہدایت کا آخری صحیفہ ہے۔ یہ ممدوح رب کائنات ﷺ کی ایک مسلسل نعت ہی تو ہے۔ قرآن مجید فرقان حمید میں ہر طرف محامد سرکار کی دھنک پرفشاں نظر آتی ہے، ''فرش پر عرش'' کے شاعر

نے بھی سنت رب جلیل پر عمل کرتے ہوئے حضورؐ کی بارگاہ بیکس پناہ میں دل کے آبگینوں کا نذرانہ پیش کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔''فرش پر عرش'' کا پہلا شعر ۔

نام ہی نام ہے جو کچھ ہے حقیقت کے سوا
راستہ کوئی نہیں اُن کی شریعت کے سوا

سید صاحب تحفظِ ناموس رسالت ﷺ کا عہد نامہ اپنے قول وعمل سے تحریر کرتے ہیں، کسی مصلحت کو پاؤں کی زنجیر نہیں بننے دیتے معاملہ تاجدارِ کائنات ﷺ کے ناموس کا ہو تو مجرمانہ خاموشی کی وجہ سے رواداری، بردباری، تحمل اور صبر جیسے الفاظ بھی بے غیرتی اور بے حمیتی کے مفہوم میں استعمال ہونے لگتے ہیں کیونکہ عشقِ رسول ﷺ ہی معیارِ ایمان ہے، سید صاحب بھی اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں بریلویؒ کی طرح تند و تیز آندھیوں میں عشق مصطفیٰ ﷺ کے چراغوں کی تھرتھراتی ہوئی لووں کے آگے جذباتِ محبت کی دیوار چنتے اور اپنی ہتھیلیوں کا بند باندھتے نظر آتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ چراغ سے چراغ جلانے کا منصب بھی سنبھالتے دکھائی دیتے ہیں۔منکرین شان رسالت سے کسی سطح پر بھی مروت کے قائل نہیں۔ تاریخ شاہد و عادل ہے کہ حق کبھی بھی باطل کے ساتھ سمجھوتے کا روادار نہیں ہوا۔

میں مجرم ہوں تو اپنے ساقیٔ کوثر کی الفت کا
مری تر دامنی اب رشکِ زمزم ہوتی جاتی ہے
خدا کی شان سیّد شرک کا فتویٰ وہ دیتے ہیں
کہ خود توحید جن کی شرک میں ضم ہوتی جاتی ہے

واسطۂ رسالت کے بغیر خدا تک پہنچنے کا ہر تصور ابلیسی تصور ہے، تعلیماتِ اسلامی اور قرآن کی منشاء کے سراسر منافی ہے۔

مل نہیں سکتا خدا اُنؐ کا وسیلہ چھوڑ کر
غیر ممکن ہے کہ چڑھیئے چھت پہ زینہ چھوڑ کر

اللہ تعالیٰ قرآن میں شہرِ مکہ کی قسم کھاتا ہے، اس لیے نہیں کہ ایک مقدس تاریخی شہر ہے، اس لیے نہیں کہ اس میں خانہ کعبہ ہے، حطیم ہے، مطاف ہے بلکہ اس لیے کہ اے محبوبؐ یہ تیرا شہر ہے، اس لیے کہ تُو اس بستی میں چلتا پھرتا ہے، اس لیے کہ اس شہر کی مٹی نے تیرے تلووں کا دھوَن پیا ہے اس لیے کہ اس خطۂ زمین کو اے محبوبؐ تیرے نقوشِ پا کو بوسہ دینے کا اعزاز حاصل ہوا ہے۔

بھلا تلووں کی رفعت کو کوئی سمجھے تو کیا سمجھے
کہ خاکِ پائے اقدس کی قسم آئی ہے قرآں میں

حضورؐ کے دارالہجرت کا ذکر آتا ہے تو سیّد صاحب کی روح جھومنے لگتی ہیں، لہو کی ایک ایک بوند وجد میں آجاتی ہے، وہ شہرِ خنک جس کا تصور بھی تھکے ماندے انسانوں میں آسودہ لمحوں کی خیرات بانٹتا ہے، وہ شہرِ دلنواز جس کی فضاؤں میں آج بھی آمنہ کے لالؐ کے انفاسِ پاک کی خوشبو رچی بسی ہے، وہ خطۂ دیدہ و دل جو پوری کائنات میں عرشیوں اور فرشیوں کی نگاہوں کا مرکز ہے۔

ضرور جائیں گے اب خلد میں کہ سنتے ہیں
اتار لائی ہے طیبہ سے رنگ و بوئے رسولؐ

طیبہ کی گلیوں کا ذکر کرتے ہیں تو آنکھوں کے گوشے بھیگ جاتے ہیں اور پلکیں بہرِ سلامی جھک جاتی ہیں، چشمِ تصور اپنے حضورؐ کو ان گلیوں میں چلتے پھرتے دیکھتی ہے تو عقیدت کے سارے پھول حضورؐ کے قدومِ پاک پر نثار کر دیتی ہے۔

جنت کی بہاروں کا خلاصہ تجھے پایا
آ سینے میں رکھ لوں تجھے اے خارِ مدینہ

کچھ خاک کے ذرے ہیں جہاں ایسے بھی سیّد
خود عرش سے بڑھ جاتا ہے معیار مدینہ

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

مدینے کی زمیں بھی کیا زمیں معلوم ہوتی ہے
لیے آغوش میں خلدِ بریں معلوم ہوتی ہے
نتیجہ یہ ہوا اُس آستاں پر جبہ سائی کا
بجائے سنگِ در میری جبیں معلوم ہوتی ہے
نگاہِ یار کی تاثیر سیّد ایسی ہے انمٹ
جہاں پر تھی کسک ابتک وہیں معلوم ہوتی ہے

ایک اور خوبصورت شعر دیکھئے:

ہماری خاک اڑا کرتی ہے اسی در پر
قیام بھی ہے مگر مستقل سفر کی طرح

شہرِ حضورؐ گنبدِ خضرا کی ٹھنڈی چھاؤں کا امانت دار ہے۔ مسائل اور مصائب کی آگ میں جھلسی ہوئی خلقِ خدا کی آخری پناہ گاہ ہے۔ گنبد خضرا جس کی ایک جھلک کی آرزو لیے چشم تر میں ہزاروں آئنے ٹوٹتے رہتے ہیں لیکن نظریں ہیں کہ جمالِ گنبدِ خضرا سے بھرتی ہی نہیں، نگاہیں ہیں کہ طوافِ گنبدِ خضرا سے تھکتی ہی نہیں۔

فلک پر کہکشاں صورت زمیں پر ضوفشاں سیرت
سراپا نور ہیں گرد و غبارِ گنبدِ خضرا

اس سے اس کی شانِ مرکزیت صاف ظاہر ہے
مدارِ خلق ہے دار و مدارِ گنبدِ خضرا
بلا تاویل جنت کی فضائیں دیکھ لیتا ہوں
جہاں یاد آگئے نقش و نگارِ گنبد خضرا

اولیاء اللہ کی عظمت و رفعت کا بیان قرآن پاک میں بھی آیا ہے۔ اب جبکہ نبوت کا دروازہ بند ہو چکا ہے، نبی آخرالزماں حضور رحمت عالمؐ دنیا میں تشریف لا چکے ہیں۔ اب قیامت تک کوئی نبی نہیں آئے گا۔ تاجِ رسالت کسی کے سر پر نہیں سجایا جائے گا اور آسمانوں سے وحی لے کر جبریل کا زمین پر نزول نہیں ہوگا، ''فرش پر عرش'' کا شاعر اولیاء اللہ سے گہری عقیدت رکھتا ہے بلکہ خود بھی گلستانِ طریقت کا ایک مہکتا ہوا پھول ہے۔ مدینہ پاک میں موت کی آرزو عشاق مصطفیٰ کی وہ تمنا ہے جو عمر بھر ان کے سینوں میں طوفان برپا کیے رہتی ہے۔ ایسے خوش نصیب بھی ہیں جنہیں غبار مدینہ کا کفن عطا ہوتا ہے، سید صاحب بھی اس مقطع میں حضورؐ کی چوکھٹ پر موت کو گلے سے لگانے کے آرزو مند ہیں۔ ملتجی ہیں کہ اگر سرزمین مدینہ میں دفن ہونا ان کے مقدر میں نہیں تو اے خدا اولیاء اللہ کے پہلو میں تھوڑی سی جگہ دے دینا، اس لیے کہ تیرے اولیاء بھی تیرے محبوبؐ کی غلامی کے پٹکے کو اپنے گلے کا ہار بناتے ہیں۔

موت آئے تو درِ پاک نبی پر سیدؔ،
ورنہ تھوڑی سی زمیں ہو شہِ سمناں کے قریب

شعرا نے حضورؐ کے قدموں پر گر کر مرجانے کی بھی تمنا کی ہے۔ اس مضمون کو سو طرح سے باندھتے ہیں اور حضورؐ سے اپنی نسبتِ غلامی کا اظہار بڑے والہانہ انداز میں کرتے ہیں اور ریاض الجنہ میں کھڑے ہوکر پکار اٹھتے ہیں یارسولﷺ آپؐ کے فرمان کے مطابق یہ جنت کا ٹکڑا ہے، یہ حق ہے لیکن حضورؐ ہم غلاموں کی جنت تو آپؐ کے قدموں

میں ہے، سیّد صاحب حضورؐ کے قدومِ پاک تک رسائی کو اہل وفا کی معراج گردانتے ہیں۔

وصل کی دھڑکنیں ہجر کی الجھنیں
دل کو دن رات کا مشغلہ مل گیا
دونوں عالم سے سیّد غنی ہوگیا
جس کو سلطانِ ہر دو سرا مل گیا

چوما تھا جس کو عرش نے ایسے قدم پہ السلام
جن کے نقیب انبیاء ان کے حشم پہ السلام
رحمتِ دو جہاں ہیں جو ان کے کرم پہ السلام
شاہِ عرب پہ السلام شاہِ عجم پہ السلام

زندگی کے کٹھن مراحل طے کرتے ہوئے نظریں رہ رہ کر اپنے شفیق آقاؐ کی طرف اٹھ جاتی ہیں، اس عالم میں شاعر بے ساختہ انہیں پکار اٹھتا ہے۔

دور ہے منزل مسافر ہے تھکا ماندہ ہوا
پشت پر ہے معصیت کا بوجھ بھاری یارسولؐ
اپنے در پر اپنے منگتے کو بلا لیجئے حضورؐ
در بدر پھرتا رہے کب تک بھکاری یارسولؐ

اسی حوالے سے دو شعر ملاحظہ فرمائیے:

یہ کس کے قدم آئے کہ اب اوج پہ پہنچی
خوش بختیٔ تعمیرِ سلیماں شبِ معراج

یہ میرے سر کو نوازا ہے کس کے تلووں نے
کہ عرش ہی پہ میں ایسا دماغ رکھتا ہوں

امتِ مسلمہ کی زبوں حالی پر خون کے آنسو روتے ہیں، اپنے آقاؐ کی بارگاہ میں امت کا استغاثہ پیش کرکے نظر کرم کے ملتجی ہوتے ہیں۔ مولانا حالیؔ نے کہا تھا:

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے
امت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے

جب سیدؔ صاحب نے شعور کی آنکھ کھولی تو غالب اور حالی کی انقلابی کاوش سے شعر و ادب کی دنیا انقلاب آفریں تبدیلیوں سے آشنا ہورہی تھی۔ اقبال کا ملّی اور ثقافتی شعور اپنی تمام تر تخلیقی توانائیوں کے ساتھ منصۂ شہود پر آچکا تھا۔ سید صاحب کے ہاں حالی کی مسدس کا رنگ بھی ملتا ہے اور اقبال کا آہنگ بھی سنائی دیتا ہے۔ مثلاً

دہائی ہے مرے مولا، دہائی ہے مرے آقاؐ
عرب سے تا عجم امت میں تیری ایک ماتم ہے
آپ کی ہر غزل میں اے سیدؔ
ساز ہندی ہے لَے حجازی ہے

عالمِ کفر کے مقابلے میں جب عالم اسلام کو پارہ پارہ دیکھتے ہیں تو دل مسوس کر رہ جاتے ہیں۔

کفر سے کفر بغل گیر نظر آتا ہے
کیوں نہیں ہوتے مسلماں بھی مسلماں کے قریب

سید صاحب کے چمنستانِ نعت سے چند پھول:

کون سیّد کو ڈھونڈنے پائے
کالی کملی کی وہ پناہ میں ہے
خدا ہرگز نہیں ہیں وہ خدا کے خاص بندے ہیں
مگر بعد از خدا جو کچھ انہیں کہئے وہی کم ہے
میں جن کی جستجو میں ہوں مجھے وہ آپ ڈھونڈیں گے
خداوندا میں تیرے حشر کے میدان کے صدقے
مجھے بیمار رہنے دیجئے عشق محمد کا
مسیحا میں ترے صدقے، ترے درمان کے صدقے
زمانہ اپنے تقویٰ کا فدائی ہے مگر سید،
شفیع المذنبیں پر اپنے اطمینان کے صدقے
لبِ جبریل سے پیہم صدا آتی ہے یہ سید
نویدِ عیدِ میلادِ شہنشاہِ دو عالم ہے
ہمیں کیا گر خزاں آئے کہ گلشن میں بہار آئے
نہ تم آئے تو پھر دنیا میں کوئی بھی ہزار آئے
اگر آنا ہے آئے شرط اتنی ہے مگر سید
نویدِ عیدِ میلادِ النبی لے کر بہار آئے

حضورؐ کی ولادتِ باسعادت کا مضمون ایک جگہ یوں باندھتے ہیں:

ازل کی صبح کے مہر مبیں تشریف لاتے ہیں
شبستانِ ابد کے مہ جبیں تشریف لاتے ہیں

نگاہِ کبریا کے نازنیں تشریف لاتے ہیں
جنابِ رحمۃ للعالمیں تشریف لاتے ہیں

امام نعت گویاں اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں بریلویؒ نے نعت کو دو دھاری تلوار پہ چلنے کے مترادف قرار دیا تھا۔ ذرا سا غلو الوہیت کی حدود میں لے جاتا ہے اور ذرا سی لغزش سوءِ ادب میں شمار ہوجاتی ہے۔ ہر قدم پر احتیاط بے حد لازم ہے۔

نبی کا نام ہے ہر جا خدا کے نام کے بعد
کہیں درود سے پہلے کہیں سلام کے بعد
نہ وہ مٹھاس کسی میں نہ وہ ادائے لطیف
کلام کس کا سنیں آپؐ کے کلام کے بعد

سید صاحب کی نعت میں جدید و قدیم نعت کے دونوں رنگ موجود ہیں، جذبات نگاری کے ساتھ سیرت نگاری کے آثارِ قلم بھی جگہ جگہ بکھرے ہوئے ہیں۔

حشر میں جاتے ہوئے مل گئی کالی کملی
مفت میں ہوگیا سید کا بھلا آپ ہی آپ
اُس قدِ زیبا کے آگے کوئی آسکتا نہیں
باغ میں سیدؔ مری ہے دیکھی بھالی شاخ شاخ
کچھ بھی تو شورِ حشر کا خطرہ نہیں انہیں
پائی جنہوں نے طیبہ میں امن و اماں کی نیند

بارانِ کرم دیکھ کے سیّد بھی ہے آیا
ہاتھوں میں لیے دفترِ عصیاں شبِ معراج
مدینے کا کچھ کام کرنا ہے سیّد
مدینے سے بس اس لیے جا رہا ہوں

محدث کچھوچھوی نے اقبال، احمد رضا اور ظفر علی خاں کا زمانہ پایا ہے۔ ان باکمال شعرا نے دہلیز مصطفیٰ ﷺ سے اپنی نسبتِ غلامی کے چراغ روشن کرنے کی سعادت حاصل کی ہے، شعوری اور لاشعوری دونوں سطحوں پر اپنے احساسِ غلامی کو اپنے لہو کی حرارت میں زندہ رکھا ہے۔ دامنِ نعت کو علمی وجاہت اور فکری شان کے معطر ومعنبر پھولوں سے آراستہ و پیراستہ کرنے کا اعزاز حاصل کیا ہے اور جدید اردو نعت کے خدوخال کو واضح کرکے آنے والوں کو فکرونظر کی پگڈنڈیوں پر نئے دن کے سورج کی روشنی کی موجودگی کا احساس دلایا ہے۔ اس شعری فضا میں اپنی انفرادیت برقرار رکھنا اور اپنے عصری شعور کو اپنے جمالیاتی شعور میں ضم کرنا یقیناً ایک غیر معمولی بات ہے اور یہی غیر معمولی بات ''فرش پر عرش'' کے شاعر کو دنیائے شعر میں ممتاز کرتی ہے۔

غلامِ غلامانِ آلِ نبی کا یہاں بول بالا وہاں بول بالا
یہ سیّد ادائے غلامی تمہاری سیادت نہیں ہے تو پھر اور کیا ہے

https://archive.org/stream/FARSH_201401

ریاض حسین چودھری

۲۰۱۴ء

# دردِ دل اور اشکوں کی برسات

## علامہ محمد قمرالزماں اعظمی کے مجموعہ نعت ''بعد از خدا'' پر ایک نظر

اکیسویں صدی کی پہلی دہائی کا منظر نامہ بھی نعت کے الوہی نغمات سے معمور ہے اور قصرِ نعت کی ہر اینٹ عشق ومحبت کے نقش و نگار سے مصور ہے۔ مدحتِ رسولؐ کے چراغ حریمِ دیدہ و دل کے دریچوں میں روشن ہیں۔ یہی روشنی انسانی تمدن کے گھپ اندھیروں میں سرو چراغاں بنی ہوئی ہے۔ بیسویں صدی کی آخری تین چار دہائیوں میں نعت کا کینوس خلا کی وسعتوں سے بھی زیادہ وسیع ہوا تھا۔ اقلیمِ نعت میں مضامین نو کے سرمدی ایوان تعمیر ہوئے تھے، مقدار اور معیار دونوں کے لحاظ سے نعت شہرِ سخن میں ہر سمت پھول بکھیر رہی تھی، اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں دھنک کے سات رنگوں کی تابانی میں مزید اضافہ ہوا ہے اور نعت اجتماعی اور انفرادی دونوں سطحوں پر نئے تخلیقی آفاق کی تسخیر میں مصروف ہے۔ ''بعد از خدا'' کے شاعرِ خوش نوا علامہ محمد قمرالزماں اعظمی بھی جدید اردو نعت کے انہی معماروں کی صفِ اول میں شامل ہیں۔

آج امتِ مسلمہ کربلائے عصر میں کھڑی ہے، اس پر عرصۂ حیات تنگ کیا جارہا ہے حضورؐ کی دکھی امت زخموں سے چور چور ہے اور کوئی اس کا پرسانِ حال نہیں۔ ہمارے ناخداؤں نے امت کی کشتی کو گردابِ ابتلا میں سرکش موجوں کے حوالے کررکھا ہے، ساحلوں کی روشنی تو ایک طرف بے آباد جزیرے بھی دور دور تک دکھائی نہیں دیتے۔ برہنہ سروں پر سورج آگ برسا رہا ہے اور تشنہ لبی ہمارا مقدر بنادی گئی ہے۔ آج امتِ مسلمہ اجتماعی خودکشی کے دہانے پر کھڑی ہے ایسے میں نظریں رہ رہ کر افقِ مدینہ کی جانب اٹھ رہی ہیں۔ آج کی نعت امتِ مسلمہ کے فطری ردِعمل کا تخلیقی روپ ہے، علامہ صاحب کا داخل ہی نہیں خارج بھی اشکبار ہے۔ انہوں نے اپنا ہی نہیں امتِ مسلمہ کا بھی مرثیہ لکھا

ہے۔

سوچ اور اظہار کے بدلتے ہوئے پیمانوں میں استغاثے کا رنگ بدستور نمایاں ہے۔ مولانا حالی کے پیرایہ اظہار کا ظہور آج کی نعت میں تواتر سے ہورہا ہے۔ اس پس منظر میں اگر علامہ محمد قمرالزماں اعظمی کے نعتیہ مجموعے ''بعد از خدا'' کا تنقیدی جائزہ لیا جائے تو یہ خوشگوار حیرت دل کے آئینہ خانے میں تجسیم ہوجاتی ہے کہ شاعر کا درد مند دل مسلم امہ کی زبوں حالی پر خون کے آنسو برسارہا ہے۔ شاعر منتظر ہے کہ کربلائے عصر میں گہری ہوتی ہوئی شامِ غریباں میں روشنی کا کوئی ستارا ابھرے، اپنی ثقافتی اکائی اور تہذیبی وجود کی سلامتی اور بقا کی آرزو ہر لفظ کے پیراہن میں ڈھلتی نظر آرہی ہے۔ ہر لفظ تصویرِ ادب بن کر درِ اقدس پر حاضری دے تو نعت ہوتی ہے، نعت حضوری کے لمحات کا عکسِ جمیل ہے۔ ''بعد از خدا'' کے شاعر علامہ محمد قمرالزماں اعظمی اسی کیفِ مسلسل میں سرشار ہیں۔ ان کے چمنستانِ نعت میں اشکوں کی برسات کا منظر دیدنی ہے۔ آپ نے تلمیحات سرمدی کو بھی شعر کا موضوع بنایا ہے جو ان کے انفرادی پہلوؤں کا ایک اور نمایاں وصف ہے۔ غزل کی ساری رعنائیاں ان کی نعت میں خوشبوئیں بکھیر رہی ہیں۔ نفسِ مضمون پر تخلیقی گرفت اپنی مثال آپ ہے۔ تخلیقِ حسن میں ان کا قلم مسلسل رواں دواں ہے۔ میری دعا ہے کہ ان کا قلم اقلیمِ نعت میں نئے نئے چراغ جلاتا رہے اور حضورِ حسن مسلسل پھول بکھیرتا رہے۔

ریاض حسین چودھری

# خوشبوئے ''ریاضِ مدحت''

## ریاض حسین زیدی کے مجموعہ نعت پر تاثرات

ابتدائے آفرینش سے لے کر لمحۂ موجود تک تخلیق کائنات کا پس منظر اور پیش منظر دونوں ممدوح ارض و سماوات کے نعلینِ مقدسہ کی رعنائیوں کا مرقع بنے ہوئے ہیں۔ روشنیوں، رنگوں اور خوشبوؤں کا یہی جھرمٹ کائنات کے ہر حسن کا مرکز و محور ہے اور ابد تک بلکہ ابد کے بعد بھی روشنیوں، رنگوں اور خوشبوؤں کا یہی سائبانِ کرم کائنات کی ہر چیز کو خنک موسموں اور شاداب ساعتوں کے دامنِ رحمت میں لیے رہے گا۔ اس لیے کہ تمام مخلوقات... انسان، جنات، ملائکہ، چرند، پرند، عرش، کرسی، لوح، قلم، زمین، آسمان، چاند، ستارے... ہر چیز حضور کے قدموں کی خیرات ہے۔ برناباس کی انجیلِ مقدس کے مطابق دنیا کے پہلے انسان نے بارگاہِ خداوندی میں یونہی التماس نہیں گزاری تھی کہ باری تعالیٰ! میرے ایک ناخن پر اپنا اور دوسرے ناخن پر اپنے محبوب رسول ﷺ کا نام لکھ دے جس کی خاطر تو نے یہ سب کچھ پیدا کیا ہے اور جب کاتبِ تقدیر نے دنیا کے پہلے انسان کے ایک ناخن پر ''اللہ'' اور دوسرے پر ''محمد'' ﷺ کے الفاظ تحریر کردیئے تو دنیا کے اس پہلے انسان نے فرطِ عقیدت سے اپنے دونوں انگوٹھوں کو چوم لیا۔ گویا اس کرۂ ارض پر نعت کی باقاعدہ ابتداء بھی اسی عملِ معتبر کے ساتھ ہوگئی۔ ایوانِ نعت میں تو چراغاں اس وقت سے ہو رہا تھا جب ربِ کائنات نے تخلیق کائنات سے بھی پہلے نورِ محمدی ﷺ تخلیق کیا، ملائکہ کا ظہور عمل میں آیا تو یقیناً لامکاں کی وسعتیں نغمہ صلِ علیٰ سے گونج اٹھیں۔ ہدایتِ آسمانی کی آخری دستاویز میں خدائے عظیم نے فرمایا کہ میں اور میرے فرشتے حضور پر درود بھیجتے ہیں۔ اے آسمان والو! تم بھی حضور ﷺ پر خوب درود بھیجو۔ نعت درود و سلام ہی کے شعری پیکر کا نام ہے۔ لامکاں کی وسعتیں ازل ہی سے نغمۂ صلِ علیٰ سے معمور ہیں اور ابد تک نغمہ صلِ علیٰ سے معمور رہیں

گی۔ اس لیے کہ ربِ ذوالجلال حیی بھی ہے اور قیوم بھی، وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اس لیے ریاضِ مدحت میں خوشبوؤں کے رتجگوں کو بھی اذنِ دوام حاصل ہے۔

ریاضِ مدحت سید ریاض حسین زیدی کا اولین نعتیہ مجموعہ ہے جو نئی صدی کے آغاز پر منصۂ شہود پر آرہا ہے۔ ہر صدی میرے حضور کی صدی ہے، ہر لمحہ میرے حضور کا لمحہ ہے، ہر ساعت آمنہؓ کے لال کی چوکھٹ پر منتظرِ کرم ہے۔ پرچمِ خوشبوئے اسمِ محمد کائنات کے ہر افق پر لہرا رہا ہے، ثنائے رسول کون و مکاں کی گردشِ ماہ و سال سے بے نیاز ہے۔ میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ ہر عہد نعت کا عہد ہے، ہر دور نعت کا دور ہے۔ روئے زمین پر آج تک ایک بھی ایسی ساعت نہیں اتری جس کے ہاتھ میں ثنائے حضور کا پرچم نہ ہو۔ البتہ بیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں حضور کی نعت کو جو فروغ ملا وہ اس صدی کا سب سے بڑا اعزاز ہے اور سید ریاض حسین زیدی بھی اس اعزاز میں برابر کے شریک ہیں۔ قافلۂ نعت نگاراں میں ذرا دیر کے بعد شامل ہوئے ہیں لیکن انہوں نے اپنے بے پایاں استقلال سے ''دیرآید درست آید'' والا محاورہ عملاً درست ثابت کردکھایا ہے۔

''ریاضِ مدحت'' کے ورق ورق پر محامدِ سرکارؐ اور محاسنِ مصطفیٰ ﷺ کے تذکارِ جلیلہ سے چراغاں ہورہا ہے۔ شاعر تمنائے طلوعِ سحر میں کشکول گدائی لیے درِ حضور پر سر جھکائے کھڑا ہے۔ ریاض کا گلشنِ احساس فیض شفاعت کے سدا بہار پھولوں سے مہک رہا ہے اور ان کی رنگینی سے مرکزِ نگاہ بنا ہوا ہے۔ سید ریاض حسین زیدی کا نعتیہ کلام پڑھ کر یہ احساس ذہن کے ہر گوشے کو منور کردیتا ہے کہ حضور رحمتِ عالم ﷺ کے درِ اقدس پر شعورِ بندگی اور سرور بندگی کا قرینہ ملتا ہے، فضائلِ مصطفیٰ ﷺ سے حروفِ ثنا اجالوں کے پیامبر بنے ہوئے ہیں اور فضائے گلستانِ نعت میں ہر لمحہ رم جھم کرنوں کا نزول جاری ہے۔ ان کی نعت پڑھ کر یہ احساس بھی ابھرتا ہے کہ سیرتِ رسول کی روشنی میں قلوب کی تالیف بھی تسخیر کائنات سے کم نہیں کیونکہ اسوہ خیرالبشر کی پیروی کا صلہ شاعر کو احترامِ آدمیت کی پائندگی کی صورت میں ملا ہے۔ ریاض کے قصرِ تخیل میں غارحرا کا روزن کھلتا ہے تو مضامین نعت تواتر سے اترنے لگتے ہیں۔ بے نوائی میں مقدر کا مسکرانا غلامِ بے نوا کی پذیرائی کا منطق

نتیجہ ہے کیونکہ ہم غلاموں کا تو ہر حوالہ ہی والیٔ کون و مکاں کے غبارِ نقوشِ پا سے اعتبار و اعتماد کی سند حاصل کرتا ہے۔ ریاض بجا طور پر اس شعور کو عام کرتے دکھائی دیتے ہیں کہ جو آنکھ تاجدارِ کائنات کے تصور دلپذیر سے آشنا نہیں وہ بینائی کے کسی تصور پر بھی پورا نہیں اترتی۔ شاعر نے شہرِ حضور کو قریۂ جمال کہا ہے جہاں ہر لحہ آسمانوں سے رحمت برستی ہے اور جہاں وارفتگی کا عجیب عالم ہوتا ہے۔ شاخِ ثنا پر تمنا کے پھول کھلتے ہیں، گنبدِ خضریٰ کی ہریالی اور شادابی خطۂ دل کی ویرانیوں میں اترتی ہے تو عہدِ خزاں کی پامالی کا ہر تصور خود بخود مٹنے لگتا ہے۔ روضۂ اطہر کی جالی دیدہ و دل میں گل افشانی کرتی ہے تو ہر طرف عروسِ صبحِ بہار اپنے پر پھیلا دیتی ہے اور کائنات کا ذرہ ذرہ وجد میں آجاتا ہے۔ نعت گوئی اسلوبِ قرآنی کی تجسیم کو کہتے ہیں۔ کسی حوالے سے بھی اس اساسِ ایمانی کو مشغلہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ عشاقِ مصطفیٰ ﷺ اللہ رب العزت کی آخری کتاب کو ایک مسلسل نعت سے تعبیر کرتے ہیں۔ آج کا شاعر دامن آرزو میں روشنی کے انہی پھولوں کو سجانے کا اعزاز حاصل کر رہا ہے۔ سید ریاض حسین زیدی نے سعادتوں کے اسی عہد نامے کو حیطۂ تحریر میں لانے کا اعزاز حاصل کیا ہے۔ ''ریاضِ مدحت'' کا شاعر یقیناً مقدر کا دھنی ہے۔ جسے نعت کہنے کا سلیقہ حضور کے درِ اقدس سے عطا ہوجائے اس کے مقدر کا کیا کہنا۔ ریاضِ دل میں غنچے ہی نہیں کھلتے اس کے لبِ تشنہ سے پھول بھی جھڑتے ہیں۔ حضور کے قدموں میں آکر ہمدوشِ ثریا ہونے کا تصور اتنا ایمان افروز ہے کہ ستارے بھی شاعر کے بختِ رسا پر رشک کرتے ہیں۔ واقعی جان کنی کے عالم میں تاجدارِ مدینہ کی چشمِ کرم کی تلاش ہم غلاموں کے سفرِ زندگی کا حاصل ہے۔ ریاضِ مدحت کے اکثر مصرعوں کے بارے میں ضرب المثل بننے کی پیشین گوئی بڑے وثوق سے کی جاسکتی ہے اور یہ یقیناً غیر معمولی بات ہے۔ ریاض زیدی گنجلک پن کی دلدل سے شعر کا دامن آلودہ نہیں ہونے دیتے۔ اکثر اشعار براہِ راست دل میں اتر جاتے ہیں اور اچھے شعر کی پہچان بھی اسی خوبی کو ٹھہرایا گیا ہے۔ میں بھی اپنی گزارشات کو ریاض زیدی صاحب کے اس شعر کے ساتھ سمیٹ رہا ہوں:

آپ کے حسنِ مجسم کو کہاں تک سوچے
نقش گر اس کے خد و خال بنائے کیسے

# منہاجِ نعت

## انتخاب: محمد رفیق حبیب

کائناتِ ہست و بود کے خالق و مالک نے اپنے سب سے برگزیدہ بندے اور رسول حضرت محمد مصطفیٰ و مجتبیٰ ﷺ کو دستارِ محبوبیت عطا کی، درودوں اور سلاموں کی خلعتِ فاخرہ میں اپنے محبوب ﷺ کے پیکر نورانی کو رکھا، سب فضیلتوں کی فضیلت کا عمامہ ان کے سر اقدس پر سجایا اور آخری آسمانی صحیفے میں اس شان سے تاجدار ارض و سماوات کے محامد و محاسن بیان کیے کہ عشاق مصطفیٰ ﷺ قرآن مجید فرقان حمید کو حضور ﷺ کی ایک نعت مسلسل سے تعبیر کرنے لگے۔ اس لیے حضرت ختمی مرتبت ﷺ کے خصائل، شمائل اور فضائل کا بیان سنت رب جلیل ہے۔ قرآن کا ورق ورق خوشبوئے اسم محمد ﷺ سے معطر ہے، سطر سطر میں حضور ﷺ کے فضائل و خصائل اور شمائل کا ذکر ہے بلکہ خدائے بزرگ و برتر خود اپنے بندوں کو آداب رسالت مآب ﷺ بجا لانے کی تلقین کر رہا ہے، خود اپنے بندوں کو اپنے آخری رسول ﷺ کا احترام کرنا سکھا رہا ہے کہ خبردار! میرے نبی ﷺ کی آواز سے اپنی آواز بھی بلند نہ کرنا، مبادا تمہارے سب اعمال پر پانی پھر جائے، اللہ رب العزت اور اس کے ملائکہ تاجدار اقلیم رسالت ﷺ پر ہر گھڑی درود بھیجتے ہیں، رب ذوالجلال اس عمل میں اپنے بندں کو بھی شریک کرتا ہے کہ تم بھی میرے حبیب ﷺ پر خوب خوب درود و سلام بھیجو۔

اس لیے نعت سنت رب جلیل ہی نہیں حکم خداوندی بھی ہے، غلامان رسول ہاشمی ﷺ اپنے رب کے اس حکم کی تعمیل میں دل کے آبگینے قرطاس وقلم کے سپرد کرتے چلے آرہے ہیں، یہ عمل روز ازل سے جاری ہے اور روز ابد کے بعد بھی جاری رہے گا۔ نعت اس محبوب رب کائنات کی توصیف و ثناء کو کہتے ہیں جس کا اسم گرامی ہر آسمانی صحیفے کا مرکزی خیال ہے، جس کے نقوش پا کا تصور ہی ثروتِ حسن و جمال ہے، شاداب موسموں کا

ہر جھونکا انفاس رسول عربیﷺ کی اترن، اسی پیکرِ جود و سخا کی ثنا سے گلزار ہستی معمور، اسی کے ذکرِ جمیل سے چاندنی عالمِ وجد میں اور باد صبا گلستانِ جہان کی روش روش پر محوِ خرام ہے۔ اس قلم کے مقدر کا کیا کہنا جو ہر وقت بارگاہِ رسالت مآبﷺ میں سربسجود رہتا ہے، ان ہاتھوں کی عظمت کا کیا ذکر جو اس قلم کو تھام کر کشورِ شعر و ادب میں پھول کھلانے اور چراغ جلانے کا منصب سنبھالتے ہیں۔ مقدر کے سکندر ہیں وہ لوگ جو حریم دیدہ و دل میں بزم نعت سجاتے ہیں اور باد صبح گاہی کے ہمزبان ہوکر لبِ تشنہ پر اپنے نبیﷺ کے ذکر کے گلاب سجاتے ہیں، کشکول آرزو میں کوئی اعزاز ہے تو یہی کہ ہمارے گلے میں غلامئ حضورﷺ کا پٹکا ہے، اسی گھر کی چوکھٹ سے نسبت ہمارا افتخار ہے، نعت اسی افتخار کا تخلیقی اظہار ہے، نعت کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی خود اس کائنات رنگ و بو کی، ظہور نبی آخرالزماںﷺ سے بھی پہلے نعت موجود تھی، عہد رسالت مآبﷺ میں نعت کی روایات کو مزید تابندگی عطا ہوئی، حسان بن ثابت، عبداللہ بن رواحہ، کعب بن زہیرؓ کے علاوہ حضرت ابوطالب، حضورﷺ کی والدہ ماجدہ سیدہ آمنہؓ، حضرت عائشہ صدیقہؓ، حضرت فاطمۃ الزہراؓ اور پھر اکابر صحابہ کرامؓ نے بھی ثنائے مصطفیٰ کے چراغ روشن کئے۔ یہ روایت ایران میں پہنچی تو فارسی کے نامور شعراء نے عقیدت و محبت کے جذبات کو شعر کا پیکر عطا کیا، سعدی اور جامی نے رعنائی خیال کے سب اثاثے آقا حضورﷺ کے قدموں پر نثار کردیئے، امیر خسرو، جان محمد قدسی سے آغا صادق، آغا یمین اور ڈاکٹر عبدالحمید عرفانی تک فارسی نعت کی روایت زندہ رہی ہے۔

اردو زبان کا ثقافتی پس منظر عربی اور فارسی کے مزاج سے ابلاغ پاتا ہے، محمد قلی، قطب شاہ، کرامت علی شہیدی، امیر مینائی، اعلیٰ حضرت احمد رضا خان بریلویؒ، محسن کاکوروی، بیدم وارثی، حسن رضا بریلوی، حسرت موہانی، الطاف حسین حالی اور علامہ اقبالؒ نے نعت گوئی کو نیا آہنگ عطا کیا اور اسے شعورِ ذات سے شعورِ کائنات تک کا مظہر بنایا۔ پاکستان نے اس ساری تابندگی کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔ پاکستان جو اللہ اور اس کے

رسولﷺ کے نام پر حاصل کیا گیا تھا، قدرتی طور پر اس کی فضا نعت کے لیے سازگار ثابت ہوئی، حفیظ جالندھری، احسان دانش، اثر صہبائی، ماہرالقادری، عبدالکریم ثمر، اختر الحامدی، سکندر لکھنوی، بہزاد لکھنوی، عزیز حاصل پوری، محشر بدایونی، محشر رسول نگری، احمد ندیم قاسمی، عبدالعزیز خالد، حافظ مظہرالدین، حفیظ تائب، حافظ لودھیانوی، راسخ عرفانی، علیم ناصری، طفیل ہوشیار پوری، یزدانی جالندھری، مظفر وارثی، صوفی محمد افضل فقیر، نعیم صدیقی، عارف عبدالمتین، ع س مسلم، عاصی کرنالی، انور جمال، امین علی نقوی، راز کاشمیری، ضیاء اللہ قادری، آفتاب احمد نقوی، قمر یزدانی، غافل کرنالی، خالد محمود، صائم چشتی، اقبال نجمی، محسن احسان، حمید صدیقی، صہبا اختر، ڈاکٹر خالد عباس الاسدی، نور محمد جرال، آثم میرزا، اقبال عظیم، حنیف اسعدی، محمد علی ظہوری، اعظم چشتی، اعجاز رحمانی، عابد نظامی، خالد احمد، راجا رشید محمود، لالہ صحرائی، سید منیر، منیر قصوری، ضیا نیر، ریاض مجید، غلام محمد قاصر، امید فاضلی، خالد بزمی، حفیظ صدیقی، بشیر حسین ناظم، جعفر بلوچ، عبدالغنی تائب، سجاد مرزا، رفیع الدین ذکی، جسٹس محمد الیاس، ڈاکٹر حسن رضوی، صبیح رحمانی، زاہد فخری اور دیگر شعرا نے نعت کی روایت کو آگے بڑھایا اور آج شہر سخن ان شعرا کی نعت کی خوشبو سے مہک رہا ہے۔

عزیزی محمد رفیق نے اس گلستان سخن سے چند پھول چن کر ''منہاج نعت'' کے گلدستے میں سجائے ہیں۔ ''منہاج نعت'' اس لحاظ سے تاریخی حیثیت کا حامل ہے کہ اپنے عہد کے سب سے بڑے نعت گو جناب حفیظ تائب نے یہ نام تجویز کیا، منہاج نعت قدیم و جدید نعت کا ایک نمائندہ انتخاب ہے جو بازار میں ان گنت انتخاب ہائے نعت میں اس لحاظ سے منفرد ہے کہ فاضل مرتب نے اس انتخاب میں محض محافل میلاد کی ضروریات کو مدنظر نہیں رکھا بلکہ انتخاب کا ایک معیار بھی قائم کیا ہے جس کے لیے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

حضور ختمی مرتبتﷺ کو کل جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا گیا اس لیے غیر مسلم شعراء نے بجا طور پر یہ نعرہ مستانہ بلند کیا کہ حضورﷺ کی ذات پر صرف مسلمانوں کا

ہی اجارہ نہیں، یہ ذات اقدس ہمارے لیے بھی محترم ہے، حضورﷺ سب کے لیے رحمت کی چھایا ہیں۔ مرتب نے غیر مسلم شعراء جن میں زیادہ تر ہندو اور سکھ شامل ہیں، کے نعتیہ کلام کا انتخاب بھی منہاج نعت میں شامل کیا ہے۔ یوں یہ انتخاب مزید باثروت ہوگیا ہے۔ مسیحی شعراء مثلاً نذیر قیصر نے بھی انتہائی خوبصورت نعتیں کہی ہیں اگر ان کا اور دوسرے مسیحی شعراء کا کلام بھی شامل اشاعت ہوتا تو یہ انتخاب مزید معتبر گردانا جاتا۔ کتاب کا ایک حصہ سلاموں پر مشتمل ہے اور ایک حصہ پنجابی نعت کے لیے وقف ہے، پنجابی نعت میں گہرائی بھی ہے اور گیرائی بھی۔

مختلف شعراء کے نعتیہ کلام کے مطالعہ سے نعت کے تہذیبی رویوں کی بھی نشاندہی ہوتی ہے اور ایک عہد کا ثقافتی آہنگ بھی نکھر کر سامنے آتا ہے۔ ذات سے اپنے عہد کے آشوب تک کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے اور نعت کے بارے میں ایک اجتماعی نقطہ نظر سامنے آتا ہے۔ اس لحاظ سے بھی ''منہاج نعت'' کا مطالعہ ذہن میں سوچ کے نئے راستوں کا انکشاف کرتا ہے۔ دراصل یہی انکشاف تخلیقی عمل سے گذرنے کے بعد جذبات ومحسوسات کی دنیا میں ذہنی آسودگی اور فکری طمانیت کا باعث بنتا ہے، ''منہاج نعت'' کا ورق ورق اس ذہنی آسودگی اور فکری طمانیت کی روشنی سے جگمگا رہا ہے، حضورﷺ کا ذکر انسان کو ہر غم سے آزاد کردیتا ہے، ''منہاج نعت'' ذکر جمال مصطفیٰﷺ کی رعنائیوں کے جھرمٹ میں طلوع ہونے والا ایک ایسا صحیفہ ہے جو قافلہ ہائے شوق کا زادِ راہ ہے، میری دعا ہے کہ وہ مقدس اور معطر جذبات جو''منہاج نعت'' کی اشاعت کا محرک بنے حضورﷺ کی بارگاہ بیکس پناہ میں شرف قبولیت حاصل کریں کہ مکین گنبد خضراﷺ کی بارگاہ میں یہی شرف قبولیت ہم غلاموں کے لیے توشہ آخرت ہے۔

# ضیا نیّر کی ثنائے کریمین

## حمد و نعت کا حسین امتزاج

نعت وہ واحد صنفِ سخن ہے جو کسی ایک ہیئت تک محدود نہیں بلکہ تمام اصناف سخن پر اس کی حکمرانی ہے۔ اس لیے نعت کائنات ہے اور کائناتِ نعت کا کینوس ارض و سما پر محیط ہے۔ پابند اور آزاد نظم سے لے کر نظم معریٰ تک اور نظم معریٰ سے قطعہ نگاری اور ہائیکو تک اور پھر ثلاثی سے نثری نظم تک، ہر طرف ثنائے رسولﷺ کی بہارِ جاوداں پرفشاں نظر آتی ہے۔ میرا وجدان کہتا ہے کہ اکیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں ہی میں ثلاثی، ہائیکو اور نثری نعت کا بھی عہدِ روشن طلوع ہوگا۔ مضامینِ نعت کا کسی ایک ہیئت تک محدود رہنا کسی بھی حوالے سے ممکن تھا اور نہ ہے لیکن غزل کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ آج بھی غزل کی ہیئت ہی مقبول ترین ہیئت ہے۔ اکیسویں صدی میں بھی زیادہ تر نعت غزل کی ہیئت ہی میں کہی جائے گی۔ غزل اپنے بختِ رسا پر جتنا بھی ناز کرے کم ہے کہ کائنات نعت میں اسے ہر سطح پر زبردست پذیرائی حاصل ہے اور آنے والی صدیوں میں بھی نعت کے لیے غزل کی ہیئت ہی مقبول ترین رہے گی۔ ضیا نیّر کا شمار بھی کاروانِ نعت کے اہم اور ممتاز شعراء میں ہوتا ہے جنھوں نے ''ثنائے کریمین'' کے لیے غزل کی ہیئت کا انتخاب کرکے اظہار و ابلاغ کے نئے دروازوں پر دستک دی ہے۔ ان کی نعت اعلیٰ حضرت احمد رضا خان بریلویؒ، محسن کاکورویؒ، امیر مینائیؒ، مولانا ظفر علی خانؒ، حافظ مظہرالدینؒ، حافظ لودھیانویؒ اور حفیظ تائبؒ کے تخلیقی تسلسل کی ہی ایک صورت ہے۔ اپنی شاندار روایات سے اپنے تخلیقی رشتوں کو مضبوط بناتے ہوئے ضیا نیّر کی نعت جدید تقاضوں کی پاسداری کرتے ہوئے شاہراہِ عشق پر نئے چراغ روشن کرنے میں مصروف ہے۔

اگر قربِ الٰہی کی آرزو ہے تو پہلے مدینے کی گلیوں کی خاکِ انور کو دامانِ چشمِ تر

میں چھپانے کا ہنر سیکھو اس لیے کہ دہلیزِ مصطفیٰ کو بوسہ دیئے بغیر الوہیت اور ربوبیت کی سرمدی وادیوں میں اترنے کا تصور بھی ممکن نہیں۔ خدائے وحدۂ لاشریک تک رسائی کا ہر راستہ حضور ختمی مرتبتﷺ کے دامانِ عجز اور ردائے بندگی کو چوم کر آگے بڑھتا ہے۔ واسطۂ رسالت کے بغیر عرفانِ الٰہی کا ہر دعویٰ بے بنیاد ہے اور یہی نقطہ نظر منشائے ایزدی کے عین مطابق ہے۔ اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں جدید اردو حمد و نعت کے تخلیقی اثاثوں پر سرسری سی نظر بھی ڈالیں تو یہ خوشگوار احساس ابھرتا ہے کہ آج کا نعت گو حمد گوئی کی طرف تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ حمدیہ مشاعروں سے حمدیہ کتب کی اشاعت تک ایک سلسلۂ نور ہے جو دور دور تک بلکہ لامحدود وسعتوں تک پھیلایا ہوا ہے۔ ''ثنائے کریمین'' حمد و نعت کی دلآویزیوں کا مرقع ہے۔ روحِ عصر ہر ورق پر بولتی ہے۔ امت مسلمہ کے مصائب اور مسائل کا ذکر استغاثے کی صورت اختیار کر لیتا ہے تو حمد و نعت کا کینوس سوچ اور اظہار کی لامحدود وسعتوں کی طرف محو پرواز نظر آتا ہے۔ یہ مجموعۂ حمد و نعت سچے جذبوں کی خوشبو کا امین ہے، شعر شعر میں شعورِ بندگی اور محبت رسول کا زمزم بہہ رہا ہے۔ شاعر کو یقین ہے کہ:

ے درِ حبیب پہ پہنچوں گا میں گرا کے اسے
جو میری راہ میں حائل ہے ہجر کی دیوار

یقیناً یہ ہجر کی دیوار ٹوٹ کر رہے گی۔

صحرائے شہر مدینہ کے حصارِ رحمت میں اربوں کھربوں دل روزِ ازل سے دھڑک رہے ہیں اور ابد تک ان دھڑکنوں کی گونج میں اُفق اُفق پر چاند ستارے رقم ہوتے رہیں گے۔ ربِ محمدﷺ ان کی طبع کو جولانی اور ان کے جذبوں کو مزید روانی عطا فرمائے۔ ان کا قلم رنگ و نور کی بارشوں میں بھیگتا رہے اور یہ بارشیں دیوارِ جاں پر آنسوؤں کے چراغ سجاتی رہیں۔

# جہانِ شوق۔ ابوبکر ناظم

رياض حسین چودھری

درود و سلام کے پیکر شعری کو نعت کہتے ہیں۔ نعت تخلیق کائنات کے دیباچے کا حرف اول ہے اس لیے کہ حضور ﷺ نہ ہوتے تو یہ زمین ہوتی اور نہ یہ آسمان، چاند ہوتا نہ ستارے، شاخوں پر پھول کھلتے اور نہ کشت آرزو میں فصل نو بہار لہلہاتی۔ کائنات کا ہر حسن حضور ﷺ کے قدموں کی خیرات ہے۔ رعنائی خیال کا ہر قافلہ مکینِ گنبدِ خضرا ﷺ کے درِ اقدس کی خاکِ انور کا دریوزہ گر ہے۔

درود سنت رب جلیل ہی نہیں حکم پروردگار عالم بھی ہے، یہ حکم صاحبانِ تقویٰ کے لیے ہے۔ عشقی اور قلبی حوالے سے وہ مفلس و نادار جن کا کشکول آرزو ایمان و ایقان کے سکوں ہی سے خالی ہے وہ سرے سے اس حکم ربی کے مخاطبین ہی میں شامل نہیں، ہدایت آسمانی کی آخری دستاویز کے اوراقِ منور سے اکتساب شعور اور کسب فیض کرنے کے بعد اس پیکرِ شعری کی تخلیق افق ادب پر طلوع ہوتی ہے۔ حروفِ نعت کی حنا بندی کا عمل شہرِ سخن کے اسلوب جمال کا آئینہ ہے اور اس آئینے میں درو دیوار شہر خنک کے عکس جمیل کے ظہور سے اقلیم دیدہ و دل میں رتجگوں کا نزول ہوتا ہے۔ آخر شب آنسوؤں کے آئینہ خانے میں جب عکسِ گنبد خضرا کے سرسبز و شاداب موسم اترتے ہیں تو فضائیں جھوم اٹھتی ہیں، پلکوں پر چراغاں سا ہونے لگتا ہے، کشت دیدہ و دل میں باد بہاری چلنے لگتی ہے۔ کونین کو وجد آجاتا ہے۔ ساعتیں درود پڑھنے لگتی ہیں۔ لہو کی ایک ایک بوند حرفِ سپاس بن جاتی ہے، صبا کا آنچل صل علی کی کلیوں سے بھر جاتا ہے، شامِ غم کی تنہائیوں میں سیدہ آمنہؓ کے لالؐ کے تصور کی چاندنی بکھرنے لگتی ہے اور دھنک کے ساتوں رنگ بہر سلامی جھک جاتے ہیں۔ رسولِ بے مثال ﷺ سے رشتۂ غلامی استوار کیے بغیر نہ تو قوموں کی برادری میں سر اٹھا کر

چلنے کی خوئے دلنواز کو ہی زندہ رکھا جاسکتا ہے اور نہ عظمت رفتہ کی بحالی کا خواب ہی شرمندۂ تعبیر ہوسکتا ہے، ہمیں خودسپردگی کی ہر کیفیت کو قدمینِ سرکارﷺ پر نثار کرنا ہوگا۔

لغزشِ مستانہ کے بغیر فنی سفر کی شاہراہِ ارتقاء پر پیش رفت کچھ ادھوری سی رہتی ہے اور منزل پر پہنچ کر بھی اپنے نقوش پا کی تلاش کا مرحلہ آسان نہیں لگتا لیکن ابوبکر ناظم نے تخلیقی حوالوں کو مربوط بناتے ہوئے یہ کٹھن مرحلہ بھی آسانی سے طے کرلیا ہے ورنہ خودنمائی، خودستائی اور خودپسندی کا زہر رگ و پے میں سرایت کرجاتا ہے اور نرگسیت کی امربیل کچھ اس طرح فنکار کے چمن خیال کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے کہ نخلستانِ شعر میں ادھ کھلی کلیاں مرجھائی مرجھائی سی دکھائی دیتی ہیں، چاروں طرف خودفریبی کے کانٹوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ خدا کا شکر ہے کہ ''جہانِ شوق'' کا شاعر فکری اور نظری مغالطوں کی ان بھول بھلیوں کی نذر نہیں ہوا اور یقیناً ایسا ہونا ممکن بھی نہ تھا کیونکہ نبی آخرالزماں حضور رحمت عالمﷺ سے شاعر کی کومٹ منٹ غیر مشروط بھی ہے اور غیر متزلزل بھی، مخلوقات میں سے، شاعر کا ہر حوالہ حضورﷺ کی ذات اقدس سے شروع ہوکر حضورﷺ کی ذاتِ اقدس پر ختم ہوجاتا ہے۔ اس کائناتی سچائی سے انکار ممکن نہیں کہ رب محمدﷺ نے مدحتِ رسولﷺ کے باب میں لفظ زوال درج ہی نہیں کیا۔ لامکاں کی وسعتیں اس وقت بھی درود و سلام کے زمزموں سے گونج رہی ہوں گی جب ہر چیز موت کی آغوش میں سوچکی ہوگی حتیٰ کہ موت کو بھی موت آچکی ہوگی۔

''جہانِ شوق'' نعتیہ ادب میں ایک گرانقدر اضافہ ہے، میری دعا ہے کہ ابوبکر ناظم کی طلبِ نعت کی تڑپ کو کبھی قرار نہ آئے۔ بارگاہِ حضورﷺ میں وہ دامنِ آرزو پھیلا کر دست بستہ کھڑے رہیں اور ان کا کاسۂ فن جذب و مستی کے سرمدی سکوں سے کبھی لبریز نہ ہو اور دیدہ و دل کی مشعلِ آرزو کبھی نہ بجھنے پائے۔

# حرفِ اوّل

## نقشِ اول۔ حسین محی الدین قادری

مقصدیت کا نور جب رعنائی خیال کے گرد منوّر ہالے کھینچتا ہے تو افقِ دیدہ و دل پر فکر و فن کی نئ صبحوں کے طلوع ہونے کی بشارتیں تحریر ہونے لگتی ہیں، جذبوں کی آنچ کچھ اور بھی تیز ہوجاتی ہے اور وادیٔ خیال میں بادِ بہاری چلنے لگتی ہے، مقصدیت کسی بھی فن کی آبرو ہے۔ جب صانعِ ازل نے کوئی چیز مقصدیت کے بغیر پیدا نہیں کی تو پھر شعر و ادب کی دنیا کیسے مقصدیت کے جوہرِ تخلیق سے محروم ہوسکتی ہے۔ ادب برائے ادب کا خود ساختہ فلسفہ اپنی موت آپ مر چکا ہے۔ اکیسویں صدی میں ادب برائے زندگی کا زندگی آمیز اور زندگی آموز نظریہ اپنی پوری تابانیوں اور جولانیوں کے ساتھ قریۂ لوح وقلم پر نور کی بارش کر رہا ہے۔ نور کی یہی بارش ہمارے نوجوان شاعر صاحبزادہ حسین محی الدین قادری کی کشتِ ہنر پر بھی ہورہی ہے۔

مری تحریر میں علم و ادب کے پھول مہکیں گے
فقط لوگوں کو بہلانا مجھے اچھا نہیں لگتا

کومٹ منٹ کی کوکھ سے کسی تخلیق کار کے اساسی رویے جنم لیتے ہیں، حسینؔ نے اسی کومٹ منٹ کے نور سے اقلیمِ شعر میں چراغاں کا اہتمام کیا ہے۔ اوراقِ جاں پر جذبوں کی ایک کہکشاں اترتی دکھائی دیتی ہے۔ تاریخِ ادب گواہ ہے کہ تخلیق کار کے تہذیبی، ثقافتی، روحانی اور عمرانی نظریات کا کسی نہ کسی حوالے سے اس کے فن میں ضرور اظہار ہوتا ہے۔ اگر وہ شعوری طور پر ان نظریات کو چھپانے کی کوشش کرے گا تو اسے منافقت کے علاوہ کوئی دوسرا نام نہیں دیا جاسکے گا۔ آئینہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا اور شاعری دل کا آئینہ ہی تو

ہے۔ اپنے نظریات کو تخلیقی رویوں میں تبدیل ہونے سے روکنا بذاتِ خود ایک غیر تخلیقی عمل ہے اور کسی بھی غیر تخلیقی عمل کو دیارِ شعر و سخن میں داخلے کا پروانہ جاری نہیں کیا جاسکتا۔ یہ دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوتی ہے کہ زمانۂ طالب علمی ہی میں حسینؔ محی الدین قادری مثبت اور رجائی سوچ کی راہ پر گامزن ہیں۔ یہ عطیہ خداوندی ہے۔ انہیں یہ وافر مقدار میں ملا ہے اور اس کا بے ساختہ اظہار بھی ہو رہا ہے۔

کتنے اہداف ہیں میرے سامان میں
آسماں چاہیے، بال و پر چاہیے

حسینؔ کو یہ بال و پر تصوف نے عطا کیے ہیں۔ ان کے تمام تر اساسی رویے تصوف کی گود میں پروان چڑھے ہیں۔ تصوف کا نور انہیں وراثت میں ملا ہے۔ آپ شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہرالقادری کے صاحبزادے ہیں، میں ڈاکٹر صاحب کو اپنے عہد کی دانش سے تعبیر کرتا ہوں۔ دانشِ عصر کی جملہ تخلیقی توانائیاں انہیں ورثے میں ملی ہیں۔ شاعر کے شعری وژن کی حنا بندی انہی تخلیقی توانائیوں سے ہوئی ہے۔

لاہور کی مٹی سے کیا کیا ہے سحر پھوٹی
اس مٹی کی خوشبو بھی سانسوں میں اتر آئی

ان کے نقشِ اوّل کا مطالعہ کرتے وقت یہ بات قاری کے ذہن نشین رہنی چاہیے کہ شاعر ایک واضح پیغام لے کر افقِ ادب پر طلوع ہوا ہے۔ حسینؔ الفاظ کے گورکھ دھندے میں نہیں الجھتے بلکہ پورے اعتماد کے ساتھ ابلاغ کے مراحل سے گزر جاتے ہیں۔ ان کی کومٹ منٹ غیر متزلزل اور غیر مشروط ہے۔ انہیں اپنے نصب العین پر کامل یقین ہے۔ ان کی شاعری تیقّن کے انہی چراغوں کا عکسِ جمیل ہے۔ ان کی آواز آوازوں کے اس جنگل میں الگ پہچانی جاتی ہے۔ ان کی شاعری جذبوں کے تیز بہاؤ کا نام ہے۔ سوچ کے اَن گنت دائرے ان کے اپنے ہیں، اظہار کا سلیقہ بھی منفرد ہے۔ اپنی دنیا آپ پیدا

کرنے والے نوجوان شاعر کا مستقبل روشن ہی نہیں روشن تر ہے۔ غزل کا رچاؤ مثنوی کا بہاؤ اور نظم کی تمکنت پوری تخلیقی توانائیوں کے ساتھ ان کے شعر میں جلوہ گر ہے۔ ربِ کائنات نے انہیں جذبۂ عشق سے نوازا ہے۔ عشق ان کے فکری اور نظری حوالوں کا مرکزی نقطہ ہے۔ اقبالؒ نے کہا تھا:

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

عشق کی یہ آگ حسینؔ کے لفظ لفظ میں الاؤ بن کر دہک رہی ہے ان کے آئینہ خانے میں عشق ایک جامد اور ساکت تصویر کی طرح محض دیوار پر آویزاں نہیں بلکہ ایک متحرک عکس کی صورت میں جلوہ گر ہے اور یہی تحرک زندگی کی سب سے روشن اور واضح علامت ہے۔ یہ شعری دستاویز رعنائیِ خیال کا دلکش مرقع ہے۔ ایک تڑپ ہے جو شاعر کو مضطرب رکھتی ہے۔ عملِ تخلیق میں یہی اضطراب مہمیز کا کام دیتا ہے اور فنی ارتقاء کے مختلف مراحل طے ہونے لگتے ہیں۔ ان کا شعری وژن کسی خاموش اور پرسکون جھیل کے مانند نہیں بلکہ ایک گنگناتی ہوئی ندی کی طرح ہے جس کی رقص کرتی موجیں زندگی اور حرکت کا پیغام دیتی ہیں۔ ان کا فن تموج آشنا ہے۔ ملتِ اسلامیہ پر صدیوں سے طاری جمود کو دیکھ کر اقبالؒ نے کہا تھا:

خدا تجھے کسی طوفان سے آشنا کردے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

کربلا کا استعارہ اپنے تمام تہذیبی اور ثقافتی پس منظر کے ساتھ بھی ان کے ہاں مختلف انداز میں آیا ہے۔ تفہیم کے نئے دروازے کھلتے ہیں، سوچ اور اظہار کے نئے آفاق روشن ہوتے ہیں تو شاعر ظلم کے خلاف خود ایک صدائے احتجاج بن جاتا ہے۔

حسینؔ نے بڑے فلاسفروں کی طرح عظمتِ آدم کے گیت گائے ہیں کہ اے

ربِ کائنات، تیری اس دنیائے رنگ و بو میں انسان ہی عظیم و معتبر ہے۔ آزاد نظم لکھتے ہیں تو وادی فکر و خیال مزید پھیل جاتی ہیں۔ ان کا ڈکشن بھی اپنا ہے، تفہیم کی نئی دنیاؤں کی دریافت عمل میں آتی ہے۔ اسلوب انتہائی دلکش ہے۔ جذبوں کی آنچ پر پگھلنے کا شعور رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری آمد اور آورد کا حسین امتزاج پیش کرتی ہے۔ نقشِ اوّل میں حمد بھی ہے اور نعت بھی، منقبت بھی ہے اور غزل بھی، اکثر نظمیں تحریکی شعور کی آئینہ بردار ہیں۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ اس نے اظہارِ ذات کے لیے مختلف پیمانے اختیار کیے ہیں اور اپنے فن کو کسی ایک صنفِ سخن تک محدود نہیں رکھا۔ زندگی کے تلخ حقائق سے آنکھیں نہیں چراتے بلکہ مسائل اور مصائب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وقت کے چیلنجوں کو قبول بھی کرتے ہیں۔ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ شاعر کا ذہن تصوف کی روشنی سے منور ہے۔ آگے چل کر شاعر تصوف کی اسی روشنی پر اپنے فکری نظام کی بنیاد رکھے گا۔ میری دعا ہے کہ تخلیق کی شاہراہ پر اعتبار و اعتماد کی یہی روشنی چراغِ راہ بنتی رہے اور قدم قدم پر حرفِ پذیرائی اس کا مقدر بنے۔

# کلیاتِ مظہر

نعت درود و سلام کے پیکرِ شعری کا نام ہے۔ تاجدارِ کائنات حضور رحمتِ عالمؐ کے شمائل، فضائل، خصائل اور خصائص کے تخلیقی اظہار پر نعت کی بنیادیں استوار ہیں، حافظ مظہر الدین کی نعت اسی اساسی رویے کی علمبردار ہے۔ حضورؐ کے اوصافِ حمیدہ کا ذکرِ جمیل شعر کے پیراہنوں میں سجتا ہے تو روح ہی نہیں کائناتِ رنگ و بو بھی وجد میں آجاتی ہے اور ساعتیں درود پڑھنے لگتی ہیں۔ اگرچہ حافظ مظہرالدین نے اپنے عہد اور اس کے زندہ مسائل کے حوالے سے بھی درِ اقدس پر فریاد کی ہے لیکن بنیادی طور پر ان کی نعت وادئ بطحا کی شاداب فضاؤں میں محوِ پرواز ہے۔ چشمِ آرزو رقص مسلسل میں ہے، اشک ہیں کہ تھمتے ہی نہیں۔

بے وضو عشق کے مذہب میں عبادت ہے حرام
خوب رو لیتا ہوں آقاؐ کی ثنا سے پہلے

آپ جب محوِ ثنا ہوتے ہیں تو اپنے ہونے کا احساس بھی تجلیاتِ نعت میں گم ہوجاتا ہے۔

حافظ مظہرالدین، حافظ لدھیانوی، احمدندیم قاسمی، حفیظ تائب، عبدالعزیز خالد اور مظفر وارثی ماضی قریب کے وہ جلیل القدر شعرائے رسولﷺ ہیں جنہوں نے مولانا احمد رضا خاں بریلوی، مولانا ظفرعلی خان، حفیظ جالندھری اور علامہ اقبال کی روایتِ علمی سے اکتسابِ شعور کرتے ہوئے نعت میں نئے امکانات کی نشاندہی کی ہے۔ حافظ مظہرالدین ایک درویش صفت انسان تھے۔ صلہ و ستائش سے بے نیاز اپنے آقاؐ کی توصیف و تحسین بیان کرتے رہے۔ اپنے ماتھے پر اپنا اشتہار چسپاں کرکے شہرت سمیٹنے کی بدعت سے محفوظ رہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اربابِ نعت و نظر حافظ صاحب کے تخلیقی سرمائے کا جائزہ

لیں،ان کے فنی نکات اور منفرد اسلوب کو سامنے لائیں، دنیائے نعت میں اس مردِ قلندر کی وارفتگی اور خودسپردگی سے روشنی کشید کرتے ہوئے شاعر رسول ﷺ کو خراجِ تحسین پیش کریں۔ نوجوان شاعر ارسلان احمد ارسل نے کلیاتِ مظہر میں مرحوم کے تمام شعری مجموعوں کو یکجا کرکے تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے بنیادیں فراہم کردی ہیں، کلیات مظہر کی ترتیب و تدوین ارسلان احمدارسل کے ادبی کارناموں میں شمار ہوگا۔ اداروں کا کام تن تنہا ایک نوجوان نے سرانجام دیا ہے جو یقیناً ہماری مبارکباد کے مستحق ہیں۔

حافظ مظہر نعت میں لپٹے ہوئے مدحت نگار، کیفیات حضوری میں گم، جانبِ عقبیٰ رواں رہے۔ روزِ محشر جس دولت اور سرمایے کی ضرورت پڑتی ہے وہ خوب سمیٹتے رہے۔ جناب احمد ندیم قاسمی، ماہر القادری، عبدالعزیز خالد، حفیظ تائب اور دیگر سرکردہ اہل فکر ونظر نے حافظ مظہر الدین مظہر کی مدحت نگاری کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور ان کے کلام کے فنی محاسن کو اجاگر کیا ہے۔ ان کے نور مدحت نگاری کی جھلک ان اشعار میں ملاحظہ فرمائیں۔

مزا تو جب ہے کہ طیبہ میں اس طرح پہنچوں
زباں پہ نعت ہو، چہرے پہ خاکِ راہِ رسول ﷺ

نعت لکھتا ہوں کہ دل نور سے بھر جاتا ہے
یوں مرے کام بہت میرا ہنر آتا ہے

عمر بھر سیدِ کونین ﷺ کی مدحت کی ہے
میں نے عقبیٰ کے لئے جمع یہ دولت کی ہے

# حق چار یار

## علامہ عارف جاوید کا انتخابِ مناقب

مخزنِ علومِ لوح وقلم، تجلی حرائے دیدہ و دل، محبوبِ خالق ارض و سماوات، وجہ تخلیقِ جہانِ رنگ و بو، انتہا ومنتہائے دانش وحکمت، آبروئے جیشِ مقبلاں، زینتِ عرشِ بریں، رونقِ بزم یقیں، رحمۃ للعالمیں، شفیع المذنبین، آقائے جن و بشر، آرزوئے چشمِ کون ومکاں، معلمِ اعظم، حبیبِ مکرم، رسولِ معظم، نبی آخرالزماں، حضور رحمتِ عالم حضرت محمد ﷺ کا براہِ راست تعلیم و تربیت یافتہ گروہِ پاکبازاں ان عظیم انسانوں پر مشتمل تھا کہ بارگاہِ خداوندی سے انہیں رضائے الٰہی کی خلعتیں عطا ہوئیں اور اُنؓ کے نقوشِ قدوم متلاشیانِ حق کے لیے انوار کے مینار ٹھہرے۔ اصحابِ رسولؐ کا ہر عمل رسولِ محتشم ﷺ کے دائرہ عمل سے اس طرح منسلک تھا کہ اس کی سرمدی شعاعیں آج بھی چار دانگ عالم کو بقعہ نور بنا رہی ہیں۔ ہر عمل انہی لمحات کی سنگت کا آرزومند ہے۔ اصحابِ مصطفیٰ ﷺ کی ہر ادا آقا علیہ السلام کے دامنِ پرنور کی خیرات ہے۔ان کا ہر عمل اطاعتِ رسولؐ، اتباعِ خیرالبشرؐ اور سیرت وکردارِ مصطفیٰ ﷺ کا پرتوِ جمیل ہے۔

سیدنا فاروقِ اعظم حضرت بلالِ حبشیؓ کو اپنا سردار کہہ کر پکارتے۔ یہی فاروق اعظم، حضرت علیؓ سے پروانۂ غلامی کے ملتجی ہیں، امام حسنؓ اور حسینؓ کاشانہ عثمانؓ پر پہرہ دیتے ہیں۔منفی قوتوں کی ریشہ دوانیاں دم توڑ جاتی ہیں۔ خارجیوں کے مکروہ اور خارشی چہرے خود بے نقاب ہوجاتے ہیں، غلط فہمیوں کی گرد چھٹ جاتی ہے اور محبت کی خوشبو ہر دل کے دروازے پر پھر سے دستک دینے لگتی ہے۔

تاریخ، عہدِ رسالت مآبؐ کے بعد خلفائے راشدین کے عہدِ جمال کو ہر لحاظ سے مثالی قرار دیتی ہے۔''حق چاریار'' کے مرتب ممتاز مذہبی سکالر عارف جاوید نے

خلفائے راشدین کے مناقب مرتب کرتے وقت شعوری اور لاشعوری دونوں سطحوں پر اتحاد امت کی انہی مضبوط بنیادوں کو اپنے شاندار اور مثالی انتخاب کا مرکز ومحور بنایا ہے۔عارف جاوید نے تخلیقی سطح پر ایک عظیم کارنامہ سرانجام دیا ہے۔مختلف ادوار اور مختلف طبقات کے فکری اور نظری حوالوں کو نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔کتاب کے مرتب نے نہ صرف اربابِ فن کی علمی تشنگی کا مداوا کیا ہے بلکہ مورخین اور محققین کے لیے بھی فکرونظر کے نئے دروازے کھولے ہیں۔ عارف جاوید نے ’’حق چار یار‘‘ میں قدم قدم پر اس احساس کو اجاگر کیا ہے کہ آج بھی اگر ہم اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لیں، آپس میں تفرقہ نہ ڈالیں اور خلفائے راشدین کے نقوشِ محبت کو چراغِ راہ بناتے ہوئے عظمتِ رفتہ کی بازیابی کے سفر پر نکلیں تو ہم ہر ہر قدم پر کامرانیوں کو اپنا منتظر پائیں گے۔اس ادبی دستاویز کا پیغام ہے:

ہیں کرنیں ایک ہی مشعل کی، بوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ
ہم مرتبہ ہیں یارانِ نبیؐ کچھ فرق نہیں ان چاروں میں

۲۳ جون ۲۰۱۴ء

شعورِ نعت اور نقد و نظر کے حوالے سے واضحیت پر مبنی

ریاض حسین چودھریؒ کے

# انٹرویوز

ڈاکٹر آفتاب احمد نقوی

ابرار حنیف: کاروانِ نعت

عمران نقوی

اشفاق نیاز

فاروق قمر صحرائی

## نعت گوئی کی سند

میرے بیٹے مدثر سے (جب وہ ابھی چھوٹا سا تھا) کسی نے پوچھا تھا کہ تمہارے ابو کیا کرتے ہیں تو اس نے جواب دیا تھا: نعت لکھتے ہیں۔ اب پچھلے دنوں نرسری کلاس میں داخلے کے وقت میری چھوٹی بچی شفق نے اپنی میڈم کو بھی یہی جواب دیا تھا، میرے لیے یہی سند بہت ہے۔

(ریاض حسین چودھری: انٹرویو: ڈاکٹر آفتاب احمد نقوی)

# ریاض حسین چودھری

## انٹرویو: ڈاکٹر آفتاب احمد نقوی

**گورنمنٹ کالج شاہدرہ کے مجلّہ ''اوج'' کے نعت نمبر۹۳۔۱۹۹۲ میں شائع ہوا**

(یہ انٹرویو ان کے پہلے نعتیہ مجموعے ''زرِمعتبر'' کی اشاعت سے پہلے کا ہے۔)

ریاض حسین چودھری (پ: 8 نومبر 1941ء) سیالکوٹ کے رہنے والے ہیں اور بنیادی طور پر ایکسپورٹ اور امپورٹ کا کاروبار کرتے ہیں۔'' خونِ رگِ جاں'' کے نام سے قومی اور ملی شاعری پر مشتمل مجموعہ کلام شائع ہوچکا ہے۔ جدید شاعری کے اہم لکھنے والے ہیں لیکن کچھ عرصہ سے مسلسل نعتیں لکھ رہے ہیں۔''زرِمعتبر'' کے نام سے مجموعہ نعت زیرترتیب ہے۔ نعت میں جدید رویوں کے قائل ہیں۔ ان دنوں ادارہ منہاج القرآن سے وابستہ ہیں اور ادارے کے پرچے ''تحریک'' کے مدیراعلیٰ ہیں۔

۱۔ معلوم نہیں، مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے ازل سے میری روح حصارِ عشق محمدؐ میں پناہ گزین ہے۔ جیسے ازل سے انہی کے قدم مبارک میں جبین نیاز سربسجود ہے، شعور کی آنکھ کھولی تو گھر میں اللہ اور اس کے حبیب ﷺ کے ذکرِ اطہر سے فضا کو معمور پایا۔ میں شعوری طور پر نعت کی طرف نہیں آیا، اس لیے ''بنیادی'' محرکات کی توجیہ کرنے سے قاصر ہوں۔

دیکھا ہے میں نے چشمِ تصور میں بارہا
سردار کائنات کی چوکھٹ کو تھام کے
جیسے ازل سے والی کونین ﷺ کے حضور
گجرے لیے کھڑا ہوں درود و سلام کے

اولین نعت کون سی تھی، وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ آج سے ایک عرصہ قبل (۶۲-۱۹۶۱ میں) جب بچوں کے لیے لکھا کرتا تھا تو مدحتِ رسول ﷺ بھی لبِ تشنہ پر پھول بن کر مہک اٹھتی تھی۔ میری پہلی باقاعدہ نعت ''نوائے وقت'' کے ہفت روزہ ''قندیل'' میں شائع ہوئی تھی۔ مطلع یاد آ رہا ہے۔

خدا کے جلوؤں میں جلوہ فرما تھے آپ شمس و قمر سے پہلے
انہی کا چرچا تھا لامکاں میں ہجومِ شام و سحر سے پہلے

۲۔ ایک نعتیہ قطعہ دیکھئے:

لب پر ورق ورق کے درود و سلام ہے
لاریب لفظ خدا کا کلام ہے
ہر سمت ہے محامد سرکارؐ کی دھنک
قرآن ایک نعت مسلسل کا نام ہے

اس ''نعت مسلسل'' سے اکتساب شعور کیا۔ اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں بریلوی، حالی، علامہ اقبال، مولانا ظفر علی خاں، حفیظ جالندھری اور اس کے بعد حفیظ تائب اور احمد ندیم قاسمی کے نغمات نعت نے خارجی اثرات بھی مرتب کئے اور اعلیٰ سطح پر بھی ان کے جلال و جمال کے عکس جلوہ گر ہوئے۔

پورے قد سے میں کھڑا ہوں تو یہ تیرا ہے کرم
مجھ کو جھکنے نہیں دیتا ہے سہارا تیرا

احمد ندیم قاسمی کا یہ لافانی شعر پوری جدید نعت کا نمائندہ شعر ہے۔

۳۔ نعت تو سنت رب جلیل ہے، تمام الہامی صحیفے اٹھا کر دیکھئے ان کی پیشانیاں ذکر مصطفیٰ ﷺ کے نور سے چمک رہی ہیں۔ نعت کے حوالے سے میری سوچ قرآن کے فلسفہ

نعت سے مختلف نہیں۔ قرآن کا فلسفہ نعت ربط رسالت سے ابلاغ پاتا ہے اور ربط رسالت کے لیے عشق رسول، احترام و ادب رسول، اتباع و اطاعت رسول اور نصرت رسول ﷺ کے عنوانات کے تحت شعورِ نعت کا فروغ پذیر ہونا ضروری ہے۔ ربط رسالت قرآن کے اسلوب ہدایت کا وہ دلکش عنوان ہے جس سے ایمان کے سوتے ہی نہیں پھوٹتے بلکہ یقین کو نظریاتی تحفظات کی ضمانت بھی ملتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک ربط رسالت یقین کی اساس نہ بنے اس وقت تک ایمان کے تقاضے پورے ہو ہی نہیں سکتے۔ تعلق باللہ کے لیے بھی ربط رسالت پہلی اور سب سے اہم کڑی ہے۔

۴۔ ربط رسالت کے چاروں عنوانات (عشق رسول، احترام و ادب رسول، اتباع و اطاعت رسول اور نصرت رسول ﷺ) جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ نعت گو محسوس کرے کہ وہ دست بستہ حضورؐ کی بارگاہ اقدس میں سلام پیش کر رہا ہے۔ حضورؐ کی گلیوں کے کتوں کی رضا کا بھی جویا رہے۔ اس تصور میں گم رہے کہ

مرے حضورؐ مری نعت سن رہے ہیں ریاضؔ
چمک رہا ہے ستارا مرے مقدر کا

کوئی لفظ کوئی خیال تاجدارِ کائنات ﷺ کی شانِ اقدس سے فروتر نہ ہو، دراصل جب تک لفظ احرام باندھ کر نہ نکلے اور خیال باوضو نہ ہو، ذہن نعت کا مضمون سوچ ہی نہیں سکتا۔ سانسوں میں عقیدت کے آبگینے پھوٹیں، دل کی ہر دھڑکن حرف سپاس بن جائے۔ لہو کی ایک ایک بوند وجد میں آجائے۔ چشم تر طوافِ گنبد خضرا میں مصروف ہو، حضورؐ کے نقشِ پا کے تصور سے حرمِ دل کی گلیاں ہر آن آباد رہیں۔ پلکیں بھیگتی رہیں۔ ساعتیں درود پڑھتی رہیں۔ حریم دیدہ و دل میں چراغاں ہوتا رہے اور قلم کے ساتھ سر بھی ورق پر جھکا رہے۔

۵۔ درست نعت گوئی دو دھاری تلوار پر چلنا ہے۔ یہاں تو آنسوؤں کا رقصِ بے حجاب بھی سوء ادب میں شمار ہوتا ہے، نعت گو کے لیے ہر آن احتیاط لازمی ہے۔ ذرا سی

بھی شوخی، گستاخی سمجھی جائے گی۔ ان کی آواز سے اپنی آواز بلند کرنے کی بھی ممانعت ہے۔ یہ بے تکلفی کی جا نہیں، یہاں تو یزید و جنید بھی نفس گم کردہ آتے ہیں۔ اسی حوالے سے یا کسی دوسرے حوالے سے اپنی نعتیہ شاعری کا جائزہ لینے یا کوئی تبصرہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔

۶۔ نعت کے سلسلے میں جدید و قدیم کی اصطلاحات سے اتفاق نہ کرنے کی کوئی وجہ میری سمجھ میں نہیں آتی، نعت نگاری ایک صنف سخن ہے اور دیگر اصناف سخن کی طرح اس میں بھی فنی ارتقا ممکن ہے بلکہ ہوتا ہے۔ جدید نعت قدیم نعت سے کئی حوالوں سے مختلف ہے۔جدید نعت میں سوچ اور اظہار کے بھی نئے آفاق مسخر ہورہے ہیں۔بعض لوگ بغیر کسی استدلال کے کہہ دیتے ہیں کہ ہم نعت میں جدید و قدیم کے قائل ہی نہیں۔حسنِ کرشمہ ساز جو چاہے کرتا پھرے بھلا اسے روکنے والا کون ہے۔ جدید نعت تاجدار کائنات کی سیرت اطہر سے بھی اکتساب شعور کرتی ہے اور جذباتی سطح پر ہی نہیں عقلی اورلاشعوری سطح پر بھی حضور کی ذات اقدس کے حوالے سے اپنی اور اپنے عہد کی پہچان چاہتی ہے۔ جدید نعت کا کینوس بہت وسیع ہوچکا ہے۔ اب نعت شہر آشوب کے پیرائے میں بھی لکھی جارہی ہے۔مسائل و مصائب کی آگ میں جلتا ہوا انسان اپنے سارے دکھ اپنے سارے کرب تاجدار مدینہ کی بارگاہ بیکس پناہ میں پیش کررہا ہے۔جدید نعت میں استغاثے کا رنگ بھی نمایاں ہے۔

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقت دعا ہے
امت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے

جدید شعراء مولانا حالیؒ کی اتباع اور اقبالؒ کی تقلید میں اسی رنگ کو نمایاں کررہے ہیں۔ بے جہت منزلوں کی طرف رواں دواں نسل انسانی کو اگر ہوائے خنک کا جھونکا نصیب ہوسکتا ہے تو صرف اورصرف بطحا کی وادی سے مل سکتا ہے۔

۷۔ جی ہاں، نعت میں ہیئت اور مضامین دونوں حوالوں سے کامیاب تجربے ہورہے ہیں۔ نظم معریٰ، آزاد نظم، نثری نظم، ہائیکو میں نئے شعر نے اظہار کے نئے پیکر تراشے ہیں۔ بعض شعرا نے نعتیہ قطعہ نگاری کی طرف بھی خصوصی توجہ دی ہے۔ ہائیکو اور نعتیہ قطعات پر مشتمل شعری مجموعے بھی منظر عام پر آچکے ہیں۔ اب نعت کا مضمون صرف نعتیہ غزل کی اصطلاح میں مقید نہیں، میں فنی حوالے سے بات کررہا ہیں۔ نعت کا ظاہر و باطن اس طرح نکھر رہا ہے کہ روح کی بالیدگی کے ساتھ ساتھ ذوق کی آبیاری بھی ہورہی ہے۔ خود میں نے نظم معریٰ اور قطعہ نگاری میں نعت کہی ہے۔ ''غبار جاں میں آفتاب'' ایک طویل نعتیہ نظم ہے اور یہ نعتیہ نظم، نظم معریٰ میں ہے۔ اس بارے میں میری رائے یہ ہے کہ یہ خوشگوار تجربات نعت کو محض ''تبرک'' کے دائرے سے نکال کر وسیع تر پیرایہ اور مفہوم عطا کریں گے اور نعت ذہنوں کی تہذیب اور قلوب کی تطہیر کا فریضہ پہلے سے بھی زیادہ موثر انداز میں سرانجام دے گی۔

۸۔ جی ہاں، بعض لوگ دور حاضر کو نعت کا دور کہتے ہیں لیکن یہ درست نہیں۔ اس لیے کہ تخلیق کائنات سے لے کر آج تک روئے زمین پر کوئی ایسا لمحہ نہیں گذرا جس کی ہتھیلیوں پر محامد سرکارؐ کی قندیلیں فروزاں نہ ہوں۔ آج تک کوئی ایسی ساعت کائنات کا مقدر نہیں بنی جو خوشبوئے اسم محمدﷺ سے نہ مہک رہی ہو۔ ہر لمحہ حضورؐ کے تذکار کا لمحہ ہے۔ ہر دور نعت کا دور ہے۔ ہر عہد نعت کا عہد ہے۔ ضیاء الحق مرحوم کے عہد میں نعت کو ایک حد تک فروغ دیا گیا، پس پردہ کیا سیاسی محرکات تھے؟ کچھ نہیں کہا جاسکتا بہر حال نیتوں کا حال اللہ جانتا ہے۔

۹۔ نعت کے حوالے سے تنقید و تحقیق کا جو کام ہوا ہے وہ حوصلہ افزا ضرور ہے لیکن اس سلسلے میں ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ہمارے بعض حلقے آج بھی نعت کو محض ثواب کمانے کی چیز سمجھتے ہیں۔ وہ لوگ تصور بھی نہیں کرسکتے کہ نعت کو تنقید کی کسوٹی پر بھی پرکھا جاسکتا ہے۔ ان کے جذباتِ محبت و عقیدت کی نفی مقصود نہیں۔ حضورؐ کی

یاد میں بہنے والے ایک آنسو کی بھی کوئی قیمت نہیں چکا سکتا۔ بہر حال سوچ کے دھارے تنقید، تحقیق اور جستجو کی طرف مڑ رہے ہیں جو ایک خوش آئند بات ہے۔

۱۰۔ شاید اس کا تعین کرنا بھی میرے لیے ممکن نہ ہو، غالباً بیدم وارثی نے کہا تھا:

عدم سے لائی ہے ہستی میں آرزوئے رسول
کہاں کہاں لیے پھرتی ہے جستجوئے رسول

مدینہ منورہ سے دوری کی کیفیت؟ لیکن کون کافر حضورؐ کے قدموں سے دور رہتا ہے۔

تجھے تو یہ سعادت اپنے بچپن ہی سے حاصل ہے
تصور میں درِ اقدس پہ جاکر چشم تر رکھنا

یہ تو وجدان کی بات تھی، میں نے اپنے پہلے نعتیہ مجموعے کا نام ''زرِ معتبر'' رکھا ہے۔ یہ در اقدس کی حاضری تک کا کلام ہے۔ دوسرا مجموعہ ''غبار جاں میں آفتاب'' یہ درِ اقدس کی حاضری کے بعد کا کلام ہے۔

۱۱۔ جون 1985ء (رمضان المبارک کا آخری عشرہ) قسمت نے یاوری کی، مقدر کا ستارا چمکا، آرزوؤں اور تمناؤں کی کھیتی شاداب ساعتوں سے ہمکنار ہوئی۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہرالقادری قافلۂ محبت لے کر عمرہ کی ادائیگی اور حضور کی بارگاہ بیکس پناہ میں حاضری کے لیے جارہے تھے، سوت کی انٹی لے کر میں بھی یوسف کے خریداروں میں نام لکھوانے کی تمنا کر بیٹھا، اجتماعی طور پر ویزا نہ لگ سکا، دل پر کیا قیمت گذری کچھ نہ پوچھئے۔ انفرادی کوششوں سے ویزا لگوایا اور تن تنہا اس شہر خنک کو چل پڑا۔

رستہ کسی سے پوچھنا توہین ہے مری
ہر رہگذار شہر پیمبرؐ کو جائے ہے

سفرِ رحمت شروع ہونے سے پہلے میری عجیب حالت تھی۔ جب بادِ صبا حضوری کا پروانہ لے کر پہنچی، روح جھوم اٹھی، وجدان وجد میں آ گیا۔ جی چاہتا تھا حضوری کا پروانہ لے کر گلیوں میں نکل جاؤں، دیوانہ وار رقص کروں۔

میں تصور میں درِ اقدس پہ جا پہنچوں ''ریاضؔ''
لوگ کہتے ہی رہیں گلیوں میں دیوانہ مجھے

یہ چاند رات تھی، عمرہ کی ادائیگی کے بعد عید حضور کے قدموں میں گزارنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ آنکھیں حیرت کے سمندر میں غوطہ زن تھیں، آنکھوں میں چمکنے والے آنسو بھی جذبوں کو زبان دینے سے قاصر تھے۔ جذبات و احساسات کی تمام بیساکھیاں ٹوٹ گئیں۔ سامنے حضور کی سنہری جالیاں تھیں، پلکیں بہر سلامی جھکی ہوئی تھیں۔ ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ بدن پر لرزہ طاری تھا۔ ایک نعت کہہ رکھی تھی۔ ''حضور حاضر ہے ایک مجرم''۔ میں ستونوں کے پیچھے چھپتا رہا۔ کہیں حضورؐ کی نظر مجھ گنہ گار پر نہ پڑ جائے کہ یہ روسیاہ منہ اٹھائے کہاں چلا آیا۔ ندامت سے جسم پسینے میں شرابور تھا۔ لیکن ایک عجیب سکون دل و نظر پر محیط تھا۔ جیسے کوئی بچہ روتے روتے ماں کی آغوش میں گہری نیند سو جائے، اضطراب نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ سقوط ڈھاکہ کے بعد میں نے کہا تھا:

جی چاہتا ہے گنبدِ خضرا کے سامنے
ٹوٹے ہوئے وطن کی کبھی داستاں کہوں

حضور کی بارگاہ میں وطن کی ہواؤں کا سلام پیش کیا۔، عرض کی، یارسول اللہ! میں غلاموں کے اس وطن سے آیا ہوں جہاں سے آپ کو ٹھنڈی ہوا آیا کرتی تھی۔ آقاؐ میرا وطن دولخت ہوگیا ہے، عرض کی آقاؐ گھر کی کنیزیں سلام کہتی تھیں، بچے دونوں ہاتھ اٹھا کر سلام کرتے تھے۔ بہر سلامی اٹھئے ننھے منے ہاتھوں کا سلام قبول کیجئے۔ غلام گھرانے کے ہر فرد کی درخواست گزاری۔ مؤذن کی اذان پر چونکا۔ پونے دو گھنٹے پلک جھپکتے گذر گئے۔

۱۲۔ نعت میں جمال مصطفیٰ اور سیرت رسول ﷺ دو اہم ترین موضوعات واقعی دو رویے ہیں لیکن میں انہیں دو مختلف رویے نہیں کہوں گا، یہ دونوں رویے حضور کی ذات اقدس سے شروع ہوکر حضورؐ کی ذات اقدس پر ہی ختم ہوجاتے ہیں۔ یہ ایک ہی ہستی کے گرد عقیدت کے دو ہالے ہیں جنہیں جدا کیا ہی نہیں جاسکتا۔ دونوں ہی موضوعات میں سے کبھی جمال کی کیفیت کا غلبہ زیادہ ہوجاتا ہے اور کبھی سیرت کی روشنی قرطاس وقلم کی راہداریوں کو وجد آفریں لمحوں سے ہمکنار کرتی ہے، اس کا انحصار نعت گو کے باطنی اور وجدانی سفر پر ہوتا ہے۔ سوال کے دوسرے حصے کا جواب بھی پہلے حصے کے جواب میں پنہاں ہے۔البتہ یہ دو رویے جدید وقدیم نعت کی حدود متعین کرتے ضرور دکھائی دیتے ہیں لیکن جدید تر نعت میں ان دونوں رویوں کا حسین امتزاج دیکھ رہا ہوں۔

۱۳۔ تخلیق کار اور نقاد کی راہیں غالباً جدا جدا ہوتی ہیں گو ہر تخلیق کار کے اندر ایک نقاد بھی ہوتا ہے لیکن یہ نقاد خود احتسابی کے عمل سے گزرنے کے لیے ہوتا ہے۔ نعت میں موضوع یا فن کے حوالے سے اب اپنی نعت کے بارے میں کیا کہوں، شاید یہ میرا منصب بھی نہیں۔

۱۴۔ نعت خوانی اور نعت گوئی میں خوبصورت تخلیقی رشتوں کے باوجود یہ دونوں جدا جدا فن ہیں۔ مجھے نعت خوانی کی سعادت حاصل نہیں لیکن یہ کمی شعوری سطح پر کبھی احساس کمتری کا باعث نہیں بنی، میں نے نعت گو کی حیثیت سے اپنی پہچان کی آرزو کی تھی۔

ہو تری ذات کے اب حوالے سے طے
میری پہچان کا مرحلہ یا نبیؐ

میں اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ جس آرزو کا اظہار میں نے اپنے آقا کی بارگاہ میں کیا تھا وہ میری زندگی میں ہی پوری ہوگئی ہے۔اس خواہش کے بعد اب کوئی دوسری خواہش نہیں، اس حوالے کے بعد شاید کسی دوسرے حوالے کی گنجائش بھی باقی نہیں

رہتی۔ البتہ ایک تمنا ہے کہ

میرے بچوں کو وراثت میں ملے حبِ رسولؐ
یہ اثاثہ بعد میرے بھی تو گھر میں چاہیے

میرے بیٹے مدثر سے (جب وہ ابھی چھوٹا سا تھا) کسی نے پوچھا تھا کہ تمہارے ابو کیا کرتے ہیں تو اس نے جواب دیا تھا نعت لکھتے ہیں۔ اب پچھلے دنوں نرسری کلاس میں داخلے کے وقت میری چھوٹی بچی شفق نے اپنی میڈم کو بھی یہی جواب دیا تھا، میرے لیے یہی سند بہت ہے۔

۱۵۔ فروغِ نعت کے لیے شہر اقبال میں نعت اکیڈمی بنائی تھی۔ لیکن بوجوہ تمام منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ سیالکوٹ میں نعتیہ مشاعروں کی روایت کو آگے بڑھانے کی سعی کی۔ ان مشاعروں کے لیے ان لوگوں نے بھی نعتیں لکھیں جو صرف شہر غزل میں فصاحت و بلاغت کے دریا بہایا کرتے تھے۔ افسوس کوئی قابل ذکر کام نہیں کرسکا۔ دامن آرزو میں ندامت کے آنسوؤں کے سوا کچھ بھی نہیں۔

اقبال کی زمیں سے حرم کی زمین تک
اشکوں نے جو کیا ہے چراغاں قبول ہو

۱۶۔ نئی نسل سے یہی کہنا چاہوں گا کہ حضورؐ کی غلامی کا پٹکا اگر گلے میں نہ ہو تو جبینوں پر سجنے والے محراب بھی ریا کاری کے مترادفات میں شمار ہوتے ہیں۔ غبار راہ مدینہ سے دامن شوق اگر مصور نہ ہو تو ایمان کے راستوں پر تشکیک کی دھول اڑتی رہتی ہے۔ اس لیے حضورؐ کی ذات گرامی کو اپنی عقیدتوں اور محبتوں کا مرکز ومحور بنا کر اسلامیان عالم کو بے توقیری کے بھنور سے نکالنے کے لیے عالمی سطح پر اسلام کے خلاف ہونے والی سازشوں کا دیوانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے احیائے اسلام، اتحاد امت، غلبۂ دین حق کی بحالی اورعظمت رفتہ کی بازیابی کے لیے اپنی صلاحیتوں کو وقف کردیں، پاکستان کو صحیح معنوں میں اسلام کا قلعہ بنائیں اور مصطفوی انقلاب کے سپاہی بن کر قیام پاکستان کے حقیقی مقاصد

کے حصول کے لیے انقلابی جدوجہد کا آغاز کریں۔ اور اپنے قول وعمل سے اس نعرہ کو کہ دنیا بھر کے مسلمانو! ایک ہوجاؤ، ایک تحریک بنادیں۔ فرقہ واریت کے بتوں کو پاش پاش کر کے حضورؐ کی ساری امت کے لیے ایک باعزت اور باغیرت مستقبل کے لیے کوشش تیز کردیں کہ نسل نو کے مقدر میں روشنی ہی روشنی ہے۔

# ریاض حسین چودھریؒ کی
# نعت گوئی کے حوالے سے گفتگو

## انٹرویو: محمد طاہر۔ ابرار حنیف مغل

## ''کاروانِ نعت'' فروری۔ مارچ ۲۰۰۷ء

☆ آپ نعت گوئی کی طرف کب مائل ہوئے اور اس کی بنیادی محرکات کیا تھے؟ اولین نعت کے چند اشعار عنایت فرمائیں۔

میں نعت گوئی کی طرف شعوری طور پر نہیں آیا، اس لیے بنیادی محرکات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے دنیا میں آنے سے پہلے میری روح فضائے نعت میں سانس لیتی رہی ہے۔ البتہ گھر کا ماحول دینی تھا، عشقِ رسول ﷺ وراثت میں ملا ہے:

مجھے تو یہ سعادت اپنے بچپن ہی سے حاصل ہے
تصور میں درِ اقدس پہ جا کر چشم تر رکھنا

تحدیث نعمت کے طور پر عرض کر رہا ہوں کہ نعت گوئی میری سرشت میں شامل ہے، قدرت ہزار زندگیاں بھی دے تو ہر زندگی میں نعت گو بننا ہی پسند کروں گا۔ جہانِ نعت میں زندہ ہوں اور نعت کہتے کہتے ہی دنیا سے رخصت ہونا چاہتا ہوں۔

بچو! دمِ رخصت مرے، کہنا یہ اجل سے،
ابو تو ابھی مدحتِ سرکارؐ میں گُم ہیں

دادا جان مرحوم حاجی عطا محمد ہمیں حضور ﷺ کی باتیں سنایا کرتے تھے۔ آقا علیہ

السلام کا نام ہونٹوں پر آتا تو آنکھیں چھلک پڑتیں، آواز رندہ ہوجاتی، بچپن سے یہ عادت ہے کوئی اچھا شعر پڑھتا ہوں تو وہ رسالہ یا اخبار آنکھوں سے لگا لیتا ہوں، سیرت اطہر کے کئی مقامات آنسوؤں میں ڈوب جاتے ہیں۔ اور زبان بیان سے قاصر رہتی ہے۔ یہی آنسو میرا سرمایۂ حیات اور میرا توشہ آخرت ہیں۔

رخصت کے وقت میرے لبوں پر مرے رفیق!
کشتِ ثناء و حمد سے کلیاں اٹھا کے رکھ
لکھوں گا میں لحد میں بھی اپنے نبیؐ کی نعت
میرے قلم کو میرے کفن میں چھپا کے رکھ

اپنے بچپن میں بچوں کے لیے نظمیں لکھیں جن میں نعت بھی سرفہرست تھی، یہ نظمیں بچوں کے مختلف رسائل میں شائع ہوئیں۔ باقاعدہ نعت جسے میں اپنی پہلی نعت کہتا ہوں ''نوائے وقت'' کے ہفت روزہ ''قندیل'' میں شائع ہوئی جس کا مطلع یاد آرہا ہے۔

خدا کے جلوؤں میں جلوہ فرما تھے آپؐ شمس و قمر سے پہلے
انہی کا چرچا تھا لامکاں میں ہجوم شام و سحر سے پہلے

☆ آپ نعت کے کن شعرا سے متاثر ہیں؟

اپنے شہر کے مردِ قلندر سے۔ اقبالؒ نے نعت کو جس علمی مقام پر لا کھڑا کیا ہے ابھی تک نعت کا کوئی شاعر اس سے آگے نہیں جاسکا (نعت کے شعرا کی گراں قدر کنٹری بیوشن سے انکار نہیں، مقصود اقبالؒ کی شعری عظمت کا بیان ہے) میں تو اکثر کہا کرتا ہوں کہ ابھی تک پوری اردو شاعری اقبالؒ کے کسی ایک مصرعے کا بھی جواب نہیں دے سکی، مولانا احمد رضا خاں بریلویؒ سے حفیظ تائب تک تقریباً ہر بڑے شاعر کی نعتیہ شاعری نے میرے ذہن میں سوچ اور اظہار کے ان گنت چراغ روشن کئے ہیں، عبدالعزیز خالد،، مظفر وارثی، کس کس کا نام لوں۔ نئی نسل افقِ نعت پر تازگی اور شگفتگی کی نئی لہریں لے کر طلوع ہوئی

ہے، راجا رشید محمود، خالد احمد، زاہد فخری، پروفیسر اکرم رضا اور سید صبیح رحمانی کا نام لینا چاہوں گا، میں سمجھتا ہوں کہ یہ عہد بھی حفیظ تائب ہی کا عہد ہے۔

تائب کو ساتھ لے کر سر حشر مَیں ریاضؔ
آقا حضورؐ کو نئی نعتیں سناؤں گا

☆ نعت کے حوالے سے آپ کی سوچ یا نظریہ کیا ہے؟ تفصیل سے ارشاد فرمائیں۔

نعت درود و سلام کے پیکرِ شعری کا نام ہے اور درود و سلام سنت رب جلیل ہی نہیں حکم خداوندی بھی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ میں اور میرے فرشتے حضورﷺ پر درود بھیجتے ہیں اور اے ایمان والو! تم بھی حضورﷺ پر خوب خوب درود و سلام بھیجا کرو، نعت کے حوالے سے میری سوچ یا میرا نظریہ یہی ہے جو ہدایت آسمانی کی آخری دستاویز قرآن حکیم کا ہے:

لب پر ورق ورق کے درود و سلام ہے
لاریب لفظ لفظ خدا کا کلام ہے
ہر سمت ہے محامدِ سرکارؐ کی دھنک
قرآن ایک نعتِ مسلسل کا نام ہے

شعرائے دربار رسالت نے نعت سے دفاع رسول کا کام بھی لیا ہے اس لیے کہ دفاع رسولﷺ میں دفاع اسلام ہے۔ خود خدا بھی ابولہب جیسے کافر سے کہہ رہا ہے کہ ٹوٹ جائیں تیرے دونوں ہاتھ، اعلیٰ حضرت سے لے کر زاہد فخری تک شعرا نے اپنی اس ذمہ داری کو بدرجہ اتم نبھایا ہے۔ جدید اردو نعت اولاد آدم کو ایک مرکز پر لانے میں بھی بنیادی مگر خاموش کردار ادا کررہی ہے۔ اپنے تمام تر تعصّبات کے باوجود مغربی مفکرین اس نتیجہ پر پہنچ چکے ہیں کہ اگر نسل آدم کو امن اور سکون کی تلاش ہے تو اسے جھک جانا ہوگا دہلیز مصطفیٰ پر، مکین گنبد خضرا کے چوکھٹ کو تھامے بغیر اولاد آدم کا ہر خواب ادھورا رہے گا۔

مصلحتیں پاؤں کی زنجیر بن جائیں تو اور بات ہے، آج پورا یورپ قبول اسلام کی دہلیز پر کھڑا ہے۔ مغرب کے اربابِ علم و دانش کی راتوں کی نیند حرام ہو چکی ہے۔ یہ جو روس کے ساتھ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد دشمنانانِ اسلام کی توپوں کا رخ اسلام اور مسلمانوں کی طرف مڑ گیا ہے تو اس کی بنیادی وجہ بھی یہ ہے کہ مغربی مفکرین اسلام سے خوفزدہ ہیں اس لیے ہر سطح پر اسلام کا راستہ روکنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں لیکن دشمنانانِ اسلام کی ننگی جارحیت کے باوجود اسلام کرہ ارض پر بسنے والے انسانوں کی نگاہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ نائن الیون کے بعد مغرب کی بوکھلاہٹ اس کے اندرونی خوف کی چغلی کھا رہی ہے۔ مغرب کو نوشتہ دیوار پڑھ لینا چاہیے۔ دراصل امریکہ اپنی بقا کی جنگ لڑ رہا ہے۔ وہ وقت اب زیادہ دور نہیں جب سوویت روس کی طرح امریکہ بھی تاش کے پتوں کی طرح بکھر جائے گا اور پوری دنیا سر جھکائے حضورﷺ کی دہلیز پر کھڑی ہوگی اور درِ اقدس کو تھام کر نظرِ کرم کی بھیک مانگے گی، اس ضمن میں نعت آگے چل کر اور بھی بھرپور کردار ادا کرے گی اس لیے آج کے نعت نگار پر بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ نعت کے حوالے سے اولادِ آدم کی شیرازہ بندی کا فریضہ بھی سرانجام دے۔ نعت کائنات ہے اور ہمیں کائناتِ نعت میں زندہ رہنا ہے۔

☆ آپ کے خیال میں نعت گو کو بطور خاص کن باتوں کا خیال رکھنا چاہیے؟

نعت گو کو قرآن سے نعت گوئی سیکھنا چاہیے۔ رب کائنات قرآن میں اپنے بندوں کو اپنے محبوبﷺ کی بارگاہ کے آداب سکھاتا ہے۔ خبردار! میرے نبیﷺ کی آواز سے تمہاری آواز بلند نہ ہونے پائے، ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال پر پانی پھر جائے اور تمہیں اس کی خبر بھی نہ ہو، نعت گو کو باادب ہونا چاہیے، اس کے تمام حروف احرام باندھ کر بارگاہ نبویﷺ میں حاضر ہوں تو اسے نعت کے لیے قلم اٹھانا چاہیے، مجھے جب حضورﷺ کی بارگاہ اقدس میں حاضری کی سعادت نصیب ہوئی تو میں اپنے قلم کو بھی ساتھ لے گیا تھا کہ یارسول اللہﷺ رات کے پچھلے پہر ہم دونوں مل کر آپ کی یاد میں آنسو بہایا کرتے ہیں۔

حسان بن ثابتؓ، کعب بن زبیرؓ، عبداللہ بن رواحہؓ اور دوسرے شعرائے دربارِ نبویﷺ کے نقوش ادب کی تلاش آج کے نعت گو کا اولین فریضہ ہونا چاہیے۔ یہ احساس ہر طور زندہ رہنا چاہئے کہ وہ وحدہٗ لاشریک ہے، اس کی الوہیت اور ربوبیت ہر لمحہ پیش نظر رہے، قلم ورق پر سجدہ ریز رہے۔

☆ ''نعت گوئی تلوار کی تیز دھار پر چلنا ہے''، اس کی روشنی میں آپ اپنی نعتیہ شاعری کو کس طرح پرکھتے ہیں؟

خالق اور مخلوق کے فرق کو نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دینا چاہیے، یہ خیال رہے کہ عظمتِ رسول کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے، بعض لوگ کم علمی کی بنا پر اپنے سیاسی رہنماؤں کو بھی انسان کامل لکھ دیتے ہیں، وہ مدینہ منورہ کا نام اس طرح لیتے ہیں جیسے کراچی اور لاہور کا ذکر کر رہے ہیں۔ لوگو! ادب، حضورﷺ سے نسبت رکھنے والی ہر چیز کا ادب، اپنی شاعری کے بارے میں کچھ عرض کرنا میرا منصب نہیں، یہ نقاد کا کام ہے، تاہم اتنا عرض کرنا چاہوں گا کوئی لفظ حضورﷺ کی شان سے فروتر نہیں ہونا چاہیے، کوشش کرتا ہوں کہ کسی حوالے سے بھی غلط مفہوم اخذ نہ کیا جاسکے، یہی خوف دامن گیر رہتا ہے کہ قلم کہیں بے قابو ہوکر حدود سے تجاوز نہ کر جائے کیونکہ بارگاہ رسالت مآبﷺ میں ذرا سی بھی شوخی سوء ادب میں شمار ہوگی۔ ابھی تک نعت میں کوئی لفظ بھی حضورﷺ کے شایانِ شان تخلیق نہیں ہوسکا۔ ہر لفظ حصارِ عجز میں ہے اور ہر نعت گو بلکہ ہر امتی کو اسی حصار عجز میں زندہ رہنا چاہیے۔ اگر کوئی صاحبِ علم یا عام قاری بھی کسی سہو کی نشاندہی کرتا ہے تو فوراً اس شعر یا لفظ کو قلمزد کر دیتا ہوں اور اللہ اور اس کے رسولﷺ کی بارگاہ میں معافی کا طلب گار ہوتا ہوں۔

☆ نعت کے سلسلے میں جدید نعت اور قدیم نعت کی اصطلاحات سے آپ کہاں تک اتفاق کرتے ہیں آپ کے نزدیک جدید نعت کیا ہے؟

بعض لوگ کہتے ہیں کہ نعت نعت ہوتی ہے، جدید و قدیم نہیں ہوتی۔ یہ منطق

آج تک میری سمجھ میں نہیں آسکی۔ نعت واقعی نعت ہی ہوتی ہے اور اسے نعت ہی ہونا چاہیے لیکن مضامین نو پر تخلیق کے دروازے کیسے بند کیے جاسکتے ہیں، نعت میں آقائے محتشم ﷺ کے شمائل، خصائل، فضائل اور خصائص کا ذکر بے حد ضروری ہے۔ ان کے ذکر جمیل کے بغیر بات نہیں بنتی لیکن حضور ﷺ رسول کائنات بھی ہیں اس لیے کائنات کے تمام مسائل اور مصائب کا ذکر بھی نعت میں ہونا ایک فطری سی بات ہے، کیا اعلیٰ حضرت کی نعت آج کی نعت سے مختلف نہیں؟ ہر دور اور عہد کے تقاضے مختلف ہوتے ہیں اور مختلف خطوں میں بسنے والے لوگوں کے معمولاتِ شب و روز بھی مختلف ہوتے ہیں۔ تہذیبی اور ثقافتی پیمانے بھی مختلف ہوتے ہیں، سوچ اور اظہار کے معیارات بھی جدا ہوتے ہیں۔ کیا آج بھی سو سال قبل ہائیکو یا سانیٹ میں نعت کہی جارہی تھی؟ یقیناً جواب نفی میں ہوگا۔ ہمیں تسلیم کرلینا چاہیے کہ ہم اکیسویں صدی میں داخل ہوچکے ہیں۔ اکیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں یہ تقاضے اور احوال آج کے تقاضوں اور احوال سے مختلف ہوں گے۔ آج نعت کا کینوس بہت وسیع ہوچکا ہے۔ مولانا حالی نے نعت میں استغاثے کا جو انداز اپنایا تھا اس کی بازگشت آج بھی سنائی دے رہی ہے لیکن اس کی صورت یقیناً مختلف ہے۔ جدید اردو نعت تاجدار کائنات حضور رحمت عالم ﷺ کے شمائل، خصائل اور خصائص سے بھی اکتساب نور کرتی ہے اور زمینی حقائق سے بھی اپنا نصابِ نعت مرتب کرتی ہے۔ آشوب ذات سے آشوب عہد بلکہ آشوب کائنات تک تمام مسائل اور مصائب کا احاطہ کرکے جدید اردو نعت بارگاہ نبوی ﷺ میں نظر کرم کی ملتجی ہوتی ہے۔ جدید اردو نعت کو اپنے اس اعزاز لازوال پر بجا طور پر ناز ہے کہ اس کی سوچ کا مرکز ومحور رسول کائنات ﷺ کی ذات اقدس ہے اور وہ آج کے انسان کے تہذیبی، تمدنی، معاشی مسائل کو انفرادی اور اجتماعی حوالوں سے نظر انداز نہیں کرتی۔ یہی آج کی نعت کا اساسی رویہ ہے۔ جدید اردو نعت صرف غزل کی ہیئت تک ہی محدود نہیں بلکہ آزاد نظم، نظم معریٰ، قطعات، ہائیکو، سانیٹ ثلاثی اور پابند نظم غرض ہر صنف سخن میں نئے نئے تجربات ہورہے ہیں۔ تازگی اور شگفتگی نے نعت گو کے ذہن کے گرد ایک ہالہ نور بنا رکھا ہے اور وہ مسلسل کشتِ ثنا میں صلِ علیٰ کے پھول اگا رہا

ہے۔ سیرت اطہر کی خوشبو جدید اردو نعت کا نمایاں وصف ہے،نعت کے حوالے سے گلوبل ویلج کا خواب شرمندہ تعبیر ہورہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضورﷺ کی ذات اقدس کا مرکز ومحور تسلیم کئے بغیر نہ افق عالم پر دائمی امن کی بشارتیں تحریر ہوسکتی ہیں اور نہ اولادِ آدم کو ایک مرکز پر جمع کیا جاسکتا ہے۔ تہذیبوں کے تصادم کو روکنے میں بھی نعت حضورﷺ ہی مرکزی کردار ادا کرسکتی ہے۔

☆ عام شاعری کی طرح نعت میں بھی معریٰ نظم، آزاد نظم، نثری نظم، ہائیکو وغیرہ کی صورت میں نئے شعری تجربے ہورہے ہیں، آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟

بڑی خوش آئند بات ہے میں عرض کرچکا ہوں کہ نعت کا کینوس وسیع سے وسیع تر ہوتا جارہا ہے، ایک زمانے میں صرف غزل کی ہیئت میں نعت کہی جارہی تھی لیکن اب ہر صنفِ سخن میں نعت کہی جارہی ہے۔ خود میں نے نظم معریٰ میں بطور خاص نعت کہی ہے۔ اللہ کے فضل وکرم اور آقائے محتشمﷺ کی خصوصی توجہات سے ''طلوعِ فجر'' کے نام سے میں نے طویل نعت کہی ہے۔ یہ نعت 500 بندوں پر مشتمل ہے۔ یہ طویل نعت بھی نظم معریٰ میں ہے۔ میں نے نظم معریٰ کے آخری دو مصرعوں کو ہم قافیہ اور ہم ردیف بنانے کی طرح ڈالی ہے۔ اس طرح موضوع کو سمیٹنے میں مدد ملی ہے۔ امید ہے یہ تجربہ پسند کیا جائے گا۔ میری ایک اور طویل نعت ''غبارِ جاں میں آفتاب'' بھی نظم معریٰ میں ہے۔ ''نئے دن کا سورج'' آزاد نعتیہ نظم ہے۔

☆ دورِ حاضر کو نعت کا دور کہا جاتا ہے، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس دور میں نعت کو زیادہ فروغ حاصل ہوا ہے۔ آپ ان آراء سے کہاں تک اتفاق کرتے ہیں؟

اس میں شک نہیں کہ اس دور میں نعت کو زبردست فروغ حاصل ہوا ہے۔ یہ فروغ قیامِ پاکستان کا منطقی نتیجہ بھی ہے۔ اس لیے کہ تحریک پاکستان اسلامی تشخص کی تلاش کا دوسرا نام ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہر دور نعت کا دور ہے۔ آج تک روئے زمین پر ایک بھی ساعت ایسی نہیں اتری جس کے ہاتھ میں ثنائے رسول اللہﷺ کا پرچم نہ ہو۔

رب کائنات حضورﷺ کا ذکر بلند کررہا ہے۔ ہم غلامانِ رسول تو اپنے خالق کے حکم کی بجا آوری میں مصروف ہیں۔

☆ نعت کے باب میں تنقید وتحقیق کے حوالے سے جو کام ہوا ہے۔آپ کے خیال میں اس کی حیثیت و افادیت کیا ہے؟ کیا مزید کام کی ضرورت ہے؟ آپ اس سلسلے میں کیا خدمات سرانجام دے سکتے ہیں یا دے رہے ہیں؟

اب علمی و ادبی سطح پر یہ تسلیم کرلیا گیا ہے کہ نعت ایک صنف سخن ہے۔ یہ وہ صنف سخن ہے جو کسی ایک ہیئت تک محدود نہیں، اس کا حیطۂ ادراک لامحدود ہے اس لیے تنقید وتحقیق کا دائرہ بھی ممکن حد تک پھیلنا چاہیے۔ اس سے نعت کی ضمنی حنا بندی میں بھی مدد ملے گی اور نعت گوشعرا کی ضمنی اور فکری رہنمائی کا فریضہ بھی سرانجام پائے گا۔ اگر ہم نے نعت کو محض ثواب کمانے کی چیز سمجھ لیا (اگرچہ نعت کے اس پہلو سے انکار ممکن نہیں بلکہ میں تو نعت کو اپنا توشہ آخرت اور وسیلہ نجات سمجھتا ہوں) تو اس کا فنی ارتقا رک جائے گا بیسویں صدی کی آخری دو تین دہائیوں میں نعت کی تنقید وتحقیق کی طرف خصوصی توجہ دی گئی ہے۔تنقید وتحقیق کے شجر سایہ دار پر ابد تک موسم بہار سایہ فگن رہے گا۔ راجا رشید محمود، سید صبیح رحمانی، پروفیسر اکرم رضا، طاہر سلطانی، شفقت رضوی، عزیز احسن، جعفر بلوچ، پروفیسر محمد فیروز شاہ، ڈاکٹر ریاض مجید، پروفیسر غفور شاہ قاسم، قیصر نجفی گراں بہا خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر ابوالخیر کشفی، پروفیسر محمد جاوید اقبال، ڈاکٹر عاصی کرنالی، ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی کی خدمات آب زر سے لکھی جائیں گی۔''نعت رنگ'' کا بطور خاص ذکر کرنا چاہوں گا۔تنقید وتحقیق کی افادیت سے کون انکار کرے گا؟ فروغ نعت کے لیے تنقید وتحقیق کے کام کی رفتار سے مطمئن ضرور ہوں لیکن اس حوالے سے ابھی پورے انہماک اور عرق ریزی سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔ مجھے اپنی علمی کم مائیگی کا احساس ہے۔ کاش، سوت کی انٹی ہی میسر آجائے اور روز محشر یوسفِ نعت کے خریداروں میں نام ہی شامل ہوجائے۔

☆ نعت لکھتے ہوئے آپ کے دل میں روضۂ رسول پاکؐ پر حاضری کی تمنا کب پیدا ہوئی، آپ مدینہ منورہ سے دوری کی کیفیت کن حالات میں شدت سے محسوس کرتے ہیں؟

روضۂ رسولﷺ پر حاضری کی تمنا کسی خاص وقت کی محتاج نہیں البتہ نعت کہتے وقت یہ تمنا دو چند ہوجاتی ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ نعت لکھتے وقت روح بھی حضوری کی کیفیتوں میں سرشار رہتی ہے۔ مدینہ منورہ سے دور کون ہے؟ حضورﷺ کے غلام تو دوری میں رہ کر بھی حضوری کی کیفیتوں میں ڈوبے رہتے ہیں۔

کتنا بڑا کرم ہے یہ میرے حضورؐ کا
پورا غریبِ شہر کا ارمان ہوگیا
شہرِ سیالکوٹ میں رہتے ہوئے ریاضؔ
ہر روز حاضری کا بھی سامان ہوگیا

ایک اور شعر عرض کرتا ہوں:

دیدارِ مصطفیؐ کی تمنا لیے ہوئے
روزِ ازل سے ایک پرندہ سفر میں ہے

زمینی فاصلوں کی اگرچہ کوئی حیثیت نہیں تاہم جب حوادث چاروں طرف سے گھیر لیتے ہیں، اپنوں کی ناانصافیاں اور چیرہ دستیاں حد سے تجاوز کرنے لگتی ہیں اور تضحیک و تحقیر کے نشتر روح میں اتر جاتے ہیں تو نظریں جانب مدینہ اٹھ جاتی ہیں، دل پکار اٹھتا ہے:

بے حد اداس آپؐ کا شاعر ہے یا نبیؐ
اس مخمصے میں ہے کہ کرے بھی تو کیا کرے
آنگن کے زرد پیڑوں کی شاخوں پہ رات دن
آقاؐ! شفیق لمحوں کی بارش خدا کرے

کیا آپ کو حرمین شریفین اور روضہ رسولﷺ پر حاضری کی سعادت حاصل ہوئی؟ کیا مدینہ منورہ میں حاضری کے موقعہ پر آپ نے نعت لکھی یا پیش کی؟ اس لمحۂ خاص کے محسوسات سے مستفید فرمائیں۔

جی ہاں، 1985ء میں مجھے عمرہ کی ادائیگی کی سعادت حاصل ہوئی اور عمرہ کی ادائیگی کے بعد اپنے آقا کی بارگاہ میں حاضری کا اعزاز ملا۔ مدینہ منورہ کا سفر میں نے ہوائی جہاز کے ذریعہ طے نہیں کیا، سر کے بل حضورﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہونے کی آرزو تھی لیکن اپنا یہ مقدر کہاں! مدینہ منورہ کا سفر بذریعہ بس طے ہوا۔ یہاں عطا الحق قاسمیؔ کا یہ شعر یاد آرہا ہے۔

تو نے کچھ بھی تو دیکھنے نہ دیا
اے مری چشم تر مدینے میں

حضور رحمت عالمﷺ کی بارگاہ بیکس پناہ میں حاضری سے قبل ایک نعت ''حضورﷺ حاضر ہے ایک مجرم'' یہ نعت میرے اولین نعتیہ مجموعے ''زرِمعتبر'' میں شامل ہے۔مواجہہ شریف میں دست بستہ کھڑے ہوکر آقا علیہ السلام کی بارگاہ میں یہ نعت پیش کی، در اقدس پر میں نے تو الفاظ کی بیساکھیاں بھی ٹوٹتے ہوئے دیکھی ہیں۔ میں ستونوں کے پیچھے چھپ رہا تھا۔ جالیوں کے سامنے آنے کی جرأت نہیں ہورہی تھی۔ اشک احتراماً زمین پر گرنے نہیں پارہے تھے۔ یہ نعتیہ نظم ہی نہیں، آنے والے دنوں میں ''زرمعتبر'' میں شامل تقریباً سارا کلام حضورﷺ کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ میں اپنے ساتھ تقریباً ساڑھے تین سو شعرا کا ایک ایک نعتیہ شعر ڈائری میں لکھ کر اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ یہ تمام اشعار شعرا کا نام لے لے کر آقا حضورﷺ کی بارگاہ میں پیش کیے۔ چاند رات مدینہ منورہ پہنچا تھا۔ صبح عیدالفطر تھی، نماز عید کی ادائیگی کے بعد آقائے کائناتﷺ کی بارگاہ میں حاضری ہوئی۔ ایک روز باب جبریل کے باہر حضورﷺ کے قدمین شریفین کی طرف بیٹھا تھا۔ ایک نعت ہوئی جس کی ردیف ہے ''قدموں میں بیٹھ

کر''۔ میرے ساتھ ایک بزرگ بھی تشریف فرما تھے، لباس اور چہرے مہرے سے پاکستانی نظر آرہے تھے،ان کی ہچکی بندھی ہوئی تھی۔ میری آنکھیں بھی چھلک پڑیں۔ میں نے ان کے گھٹنے پر ہاتھ رکھتے ہوئے رندھی ہوئی آواز میں آہستہ سے کہا بابا جی! ہم کتنے خوش نصیب ہیں کہ اپنے حضورﷺ کے قدموں میں بیٹھے ہیں۔ میرا یہ کہنا تھا کہ ضبط کا ہر بندھن ٹوٹ گیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے گلے لگ کر دیر تک روتے رہے۔ یا اللہ! کیا ہم واقعی گنبدِ خضرا کی چھاؤں میں بیٹھے ہیں۔ اے بخت رسا! آ میں تیری بلائیں لوں، آ تجھے میں اپنے سینے سے لگا لوں، آ مل کر حضورﷺ کے قدموں میں اپنا سب کچھ نثار کریں۔ میں اپنا سفر نامہ ''لبیک یارسول اللہ لبیک'' کے نام سے لکھ رہا ہوں۔ اس کے بعض حصے نوائے وقت اور دیگر جرائد میں شائع بھی ہو چکے ہیں۔

☆ نعت میں سیرت نگاری اور سراپا نگاری دو اہم ترین موضوع ہی نہیں بلکہ دو مختلف رویے بھی ہیں۔ آپ دونوں میں سے کس کے حق میں ہیں یا اعتدال کو کیسے محسوس کرتے ہیں؟

سیرت نگاری اور سراپا نگاری نعت کے دو اہم ترین موضوع ضرور ہیں لیکن یہ دو مختلف رویے ہرگز نہیں، ایک ہی ذاتِ اقدس کے ظاہری اور باطنی اوصاف کا بیانِ دل پذیر ہے۔ دونوں میں سے ایک کا انتخاب؟ بات سمجھ میں نہیں آسکی۔ مجھے دونوں موضوعات عزیز ہیں۔ اعتدال والی بات بھی سمجھ میں نہیں آسکی۔

☆ آپ نے نعت میں موضوع یا فن کے حوالے سے جو نیا کام کیا ہے۔ وضاحت سے بیان کریں۔

اپنے بارے میں کیا عرض کروں، بھائی! یہ میرا منصب نہیں، اظہارِ عجز کے سوا کیا عرض کرسکتا ہوں۔

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے

عمر بیت چلی ہے لیکن کوئی کام بھی ڈھب سے نہ کر سکا۔ اظہار کے لیے غزل کی ہیئت کو اپنایا ہے، نظم معریٰ میں بھی خاصے تجربے کئے ہیں، آزاد نظم کی ہیئت میں بھی نعت کہی ہے۔ قطعہ نگاری کی طرف بھی خصوصی توجہ دی ہے۔ نعت میں ہر قسم کے موضوع کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ بیسویں صدی کی آخری طویل نعتیہ نظم (تمنائے حضوری) اور اکیسویں صدی کی پہلی طویل نعتیہ نظم (سلامٌ علیکَ) کہنے کا اعزاز حاصل ہوا ہے۔ یہ دونوں نظمیں الگ الگ کتابی صورت میں شائع ہوچکی ہیں۔ انفرادی اور اجتماعی مسائل و مصائب جدید اردو نعت کا موضوع ہیں اور میری نعت بھی انہی حوالوں کی آئینہ دار ہے اور یوں ان گنت موضوعات اقلیم نعت میں درآئے ہیں۔

☆ آپ نعت خوانی اور نعت گوئی میں کیا فرق محسوس کرتے ہیں؟ کیا آپ کو نعت خوانی (ترنم سے) کی سعادت بھی حاصل ہے۔ اگر ایسا نہیں تو اس کمی کو آپ کیسے محسوس کرتے ہیں؟

نعت خوانی اور نعت گوئی دو الگ الگ فنون ہیں اگرچہ ان کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔نعت سرائی یا نعت خوانی ترنم سے نعت پڑھنے کو کہتے ہیں اور نعت گوئی نعت کہنے کو کہتے ہیں۔بعض خوش قسمت افراد کو دونوں فنون پر عبور حاصل ہوتا ہے۔ مثلاً اعظم چشتی، محمد علی ظہوری، مظفر وارثی، سید صبیح رحمانی وغیرہ لیکن نعت کے اکثر شعرا تحت اللفظ ہی پڑھتے ہیں، ترنم سے نعت پڑھنے کی کمی کبھی محسوس نہیں ہوئی۔

☆ فروغ نعت کے حوالے سے آپ نے ذاتی یا اجتماعی سطح پر کیا خدمات انجام دی ہیں؟

تہی دامنی کے احساس کے سوا دامن میں کچھ بھی نہیں۔

☆ نعت گوئی کی وجہ سے کسی بھی سطح پر کوئی ایوارڈ ملا ہو تو بتائیں۔

میرے دوسرے نعتیہ مجموعہ ''رزق ثنا'' پر حکومت پاکستان نے صدارتی اور

حکومت پنجاب نے سیرت ایوارڈ دیا تھا۔ اس کے علاوہ سیرت سٹڈی سنٹر سیالکوٹ، تحریک منہاج القرآن اور دیگر تنظیمات کی طرف سے مختلف اوقات میں ایوارڈز ملتے رہے۔ بعض ایوارڈز کی اطلاع تو بذریعہ اخبار ملتی ہے۔ لیکن اصل ایوارڈ تو وہ ہے جو دربار رسالت مآب ﷺ سے عطا ہو۔ اہل محبت کی محبتوں کا اظہار بھی تو کسی ایوارڈ سے کم نہیں۔

☆ نعت گوئی کے حوالے سے اپنے اساتذہ کرام کے بارے میں بتائیں؟

استاد مکرم حضرت آسی ضیائی، ان سے نیاز مندی اور شاگردی کا عرصہ تقریباً 45 برسوں پر محیط ہے۔ مرے کالج سیالکوٹ میں ہم ان سے ''طلسم ہوشربا'' سبقاً سبقاً پڑھا کرتے تھے۔ آج کل لاہور میں منصورہ کے قریب رہائش پذیر ہیں۔ میں ان سے مسلسل رابطے میں ہوں اور ان سے باقاعدہ اصلاح لیتا ہوں۔ لاء کالج لاہور میں جب شبیر انصاری اب مولانا شبیر انصاری میرے ہم جماعت بنے تو کچھ عرصہ آغا صادق مرحوم سے بھی فنی مشورے لیتا رہا ہوں۔

☆ نعت گوئی کے حوالے سے اپنی زندگی کا ایسا واقعہ جسے آپ بیان کرنا چاہیں؟

خواب میں دیکھا کہ میں شہرِ حضور ﷺ میں ہوں۔ علامہ محمد یعقوب خان کے بیٹے مختار احمد میرے ساتھ ہیں اور ہم اس شہرِ خنک کی گلیوں میں گھوم پھر رہے ہیں۔ خواب کے عالم میں نعت کا ایک شعر ہوا۔ جب بیدار ہوا تو وہ شعر میری زبان پر تھا جسے میں نے فوراً نوٹ کرلیا:

جی بھر کے ترے شہر کی گلیوں کو تو دیکھا
پر آنکھیں مری پیاسی کی پیاسی رہیں پھر بھی

☆ نسل نو کے لیے اپنے پیغام سے نوازیں؟

حضور ﷺ کے در سے ٹوٹے ہوئے غلامی کے رشتے کو از سرِ نو استوار کر لیجئے عظمتِ رفتہ کی بحالی کا خواب خود بخود شرمندہ تعبیر ہو جائے گا۔

# انٹرویو: عمران نقوی

روزنامہ پاکستان: ۲۶ فروری، ۲۰۱۰ء کو شائع ہوا

اقبال کی زمیں سے حرم کی زمیں تک
اشکوں نے جو کیا ہے چراغاں قبول ہو

اس خوبصورت شعر کے خالق جدید اردو نعت کے نمائندہ شاعر ریاض حسین چودھری ہیں۔ احمد ندیم قاسی نے کہا تھا ''جن شعراء نے اس صنف سخن (نعت) میں ہمیشہ زندہ رہنے والے اضافے کیے ہیں ان میں ریاض حسین چودھری کا نام بوجوہ روشن ہے۔'' ریاض حسین چودھری 8 نومبر 1941ء کو شہر اقبال کے ایک مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ ہائی سکول سے میٹرک اور مرے کالج سے بی اے کیا۔ دو سال تک مرے کالج میگزین کے اردو سیکشن کے ایڈیٹر رہے۔ پنجاب یونیورسٹی ہی سے اردو میں ایم اے کیا۔ لاء کالج کے مجلّہ ''المیزان'' کے بھی دو سال تک ایڈیٹر رہے۔ حلقہ ارباب ذوق سیالکوٹ کے دو سال تک سیکرٹری منتخب ہوتے رہے۔ پاکستان رائٹرز گلڈ سب ریجن سیالکوٹ کے بھی سیکرٹری چنے گئے۔ تحریک منہاج القرآن کے مرکزی سیکرٹریٹ لاہور میں مختلف عہدوں پر خدمات سرانجام دیں۔ دس سال تک پندرہ روزہ ''تحریک'' کے چیف ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ''خونِ رگ جاں'' ان کی ملی نظموں کا مجموعہ ہے جو 1970ء میں شائع ہوا۔ ''زرمعتبر'' ان کا پہلا نعتیہ مجموعہ ہے۔ ''رزق ثناء'' پر انہیں صدارتی ایوارڈ ملا۔ حکومت پنجاب نے بھی ''رزق ثناء'' کو سیرت ایوارڈ سے نوازا۔ ''تمنائے حضوری'' 20ویں صدی کی آخری طویل نعتیہ نظم ہے۔۔ دیگر مجموعوں میں ''متاع قلم'' اور ''کشکول آرزو'' شامل ہیں۔

ریاض حسین چودھری سے ہونے والی گفتگو کی تفصیلات نذرِ قارئین ہیں:

س: لکھنے لکھانے کا آغاز کیسے ہوا؟

ج: جب سے ہوش سنبھالا ہے مسلسل لکھ رہا ہوں۔ 55 برس کے تخلیقی سفر میں ایک دن کے لیے بھی دنیائے ادب سے غیر حاضر نہیں رہا۔ لڑکپن میں بچوں کے لیے نظمیں لکھ کر رہگذار شعر پر قدم رکھا۔ چشم تصور میں کئی بار خود کو ایڈیٹر کی کرسی پر بیٹھے دیکھا۔ مرے کالج سیالکوٹ میں داخلہ لیا تو وارث میر اور ع۔ ادیب کا طوطی بول رہا تھا۔ ممتاز محقق محمد اکرام چغتائی، صوفی نیاز احمد، پروفیسر منیر احمد بھٹہ، کرنل (ر) ریاض احمد چغتائی اور مشتاق احمد باجوہ میرے کالج فیلوز تھے۔ آسی ضیائی اردو ادب کے استاد تھے۔ انہی کے زیر سایہ خیابان ذوق کی آبیاری ہوئی۔ کالج ٹائم کے بعد ہم چند لڑکے ان سے ''طلسم ہوشربا'' سبقاً سبقاً پڑھا کرتے تھے۔ آسی ضیائی صاحب کے علاوہ آغا صادق سے بھی اصلاح لیتا رہا ہوں۔

س: نعت گوئی کی طرف کیسے اور کب آئے؟

ج: چھٹی یا ساتویں کلاس میں تھا کہ پہلی نعت کہی، یہ نعت بچوں کے ایک رسالے ''کھلونا'' لاہور میں شائع بھی ہوئی۔ 1975ء کے لگ بھگ سید آفتاب احمد نقوی، انور جمال، شفیع ضامن، گلزار بخاری اور اعزاز احمد آذر مختلف کالجوں اور اداروں میں ٹرانسفر ہوکر آئے۔ میں ان دنوں حلقہ ارباب ذوق سیالکوٹ کا سیکرٹری تھا۔ یہ شہر اقبال کی ادبی زندگی کا سنہری دور تھا۔ نعت ان دنوں بھی کہہ رہا تھا۔ نعتیہ مشاعروں کا آغاز بھی ہوچکا تھا۔ آفتاب احمد نقوی (مرحوم) نے خلوص سے مشورہ دیا کہ میں صرف نعت لکھا کروں۔ میں غزل کو ترک تو نہ کرسکا البتہ اب نعتوں کی تعداد غزلوں کی تعداد سے بڑھ گئی۔

س: آپ نثری نعت سے کیا مراد لیں گے؟

ج: آقائے محتشم کے محامد و محاسن کا دلآویز تذکرہ نثر میں بھی ممکن ہے۔ شبلی نعمانی،

پیر کرم شاہ الازہری اور ڈاکٹر محمد طاہرالقادری کی سیرت النبیﷺ کی کتابوں میں نثری نعت کے ان گنت نمونے ملتے ہیں۔تخلیقی اور جمالیاتی اوصاف کی حامل نثر کو نثری نعت کہا جائے گا۔ نعت عمومی معنوں میں درود و سلام کے پیکر شعری کا نام ہے۔ نعت کی ایک امتیازی خوبی یہ ہے کہ یہ تمام اصناف سخن میں کہی جارہی ہے اور کہی جاتی رہے گی۔ خوشبوئے توصیف کسی ایک صنف سخن کی پابندنہیں ہوسکتی۔

لب پہ ورق ورق کے درود و سلام ہے
لاریب لفظ لفظ خدا کا کلام ہے
ہر سمت ہے محامد سرکارؐ کی دھنک
قرآن ایک نعت مسلسل کا نام ہے

قرآن نثر ہے نظم نہیں، ہر دور کا نعت گو ہدایت آسمانی کی آخری کتاب سے ہی اکتساب شعور کرتا ہے اور کرتا رہے گا۔ اسی طرح کئی احادیث جو حضورﷺ کے شمائل، خصائل، فضائل اور خصائص کو بیان کرتی ہیں نثری نعت کے زمرے میں آتی ہیں۔بعض علماء کی تقاریر بھی نثری نعت کے خوبصورت نمونے ہیں۔

س: جدید اردو نعت کے موضوعاتی خدوخال کے حوالے سے آپ کیا کہیں گے؟

ج: جدید اردو نعت کا کینوس بہت وسیع ہو چکا ہے۔ جدید اردو نعت آج کے انسان کے انفرادی اور اجتماعی مسائل کے علاوہ اس کے تہذیبی، ثقافتی اور سماجی حوالوں کو بھی اعتبار کا نور عطا کرتی دکھائی دیتی ہے۔ مولانا احمد رضا خاں اور حفیظ تائب کی نعت اسلوب کے حوالے ہی سے نہیں، موضوعات اور ڈکشن کے حوالے سے بھی مختلف ہے۔ آج کا انسان ان گنت مسائل اور مصائب کی آگ میں جل رہا ہے۔ ہر تخلیق کو نقد و نظر کی کسوٹی پر پرکھتے ہوئے اس کے تہذیبی، سماجی اور ثقافتی پس منظر کا احاطہ ضرور کرنا چاہئے ورنہ کسی بھی فن پارے کا تنقیدی محاکمہ ممکن نہیں۔ آج کی نعت کو بھی عالمی تناظر میں دیکھنا چاہیے۔ خود

ساختہ فلسفہ ہائے زندگی، بحرانوں کی شکار اولاد آدم کو امن اور سکون کی دولت عطا کرنے سے قاصر ہیں۔ دائمی امن عالم صرف حضورؐ کے درِ کرم کی عطا ہے۔

س: نعتیہ مشاعروں میں تقدیم و تاخیر کے قائل ہیں؟

ج: بالکل نہیں۔

س: قیامِ پاکستان کے بعد کی نعت گوئی کو کس زاویہ نگاہ سے دیکھتے ہیں؟

ج: دوقومی نظریہ قیام پاکستان کی بنیاد ہے۔ پاکستان اسلامی تشخص کی تلاش کا دوسرا نام ہے۔ یہ غلامانِ محمدؐ کا حصارِ آہنی ہے۔ قیام پاکستان کے بعد نعت کو فروغ ملنا ایک قدرتی امر تھا۔ موضوعات کے حوالے سے پہلے بات ہوچکی ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد جب اہل وطن کو نئے مسائل اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا تو اپنی ثقافتی اکائی کے تحفظ کا احساس اجاگر ہوا۔ نعت کا منظر نامہ وسیع ہونے لگا۔ ہر زمانے کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں، اپنی زبان ہوتی ہے اور اپنا لہجہ ہوتا ہے۔ اب زبان و ادب کے حوالے سے مزید نکھار پیدا ہوا۔ اقبال کی عظیم فکری فتوحات کی روشنی میں تخلیقِ فن نے ایک نئی کروٹ لی اور دامن شعر میں بادِ بہاری چلنے لگی۔ استغاثے کا رنگ نمایاں ہوا اور ایک صنفِ سخن کے حوالے سے نعت کا دامن مزید باثروت ہوا۔

س: ایک نعت گو کا سب سے بڑا اعزاز کیا ہے؟

ج: بارگاہ رسالت مآبؐ میں اس کی کہی ہوئی نعت کو سند جواز عطا ہوجائے۔

س: اردو نعت کی تخلیق کے ساتھ تنقید و تحقیق کے حوالے سے بھی کام ہورہا ہے، کیا یہ کام کافی ہے؟

ج: کافی تو نہیں البتہ حوصلہ افزا ضرور ہے، اسے جاری رہنا چاہیے۔ نعت کو جب ایک صنفِ سخن تسلیم کرلیا گیا ہے تو اس پر فنی حوالے سے تنقید بھی ممکن ہے۔ تحقیق کا کام بھی تسلی بخش حد تک آگے بڑھ رہا ہے جو ایک خوش آئند امر ہے۔ سید صبیح رحمانی ''نعت رنگ''

کے حوالے سے گرانقدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ''نعت رنگ'' کا ہر شمارہ ایک حوالے کی کتاب ہے، اللہ مزید توفیق عطا فرمائے۔ یہ جریدہ بیک وقت تخلیق نعت، تنقید نعت اور تحقیق نعت کے تینوں محاذوں پر دادِ شجاعت دے رہا ہے۔ راجا رشید محمود کا ماہنامہ ''نعت'' اپنے دائرہ عمل میں روشنیاں بکھیر رہا ہے۔ شہرِ نعت، کاروانِ نعت اور دیگر پرچے نعت حضورؐ کے فروغ کے لیے وقف ہیں۔ سرور حسین نقشبندی کے رسالے ''مدحت'' کی آمد آمد ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر ابوالخیر کشفی، پروفیسر محمد اکرم رضا، پروفیسر محمد اقبال جاوید، ڈاکٹر سید محمد یحیٰ نشیط، ڈاکٹر خورشید رضوی، عزیز احسن، ڈاکٹر غفور شاہ قاسم، پروفیسر افضال احمد انور، ڈاکٹر ریاض مجید، انور محمود خالد، ڈاکٹر عاصی کرنالی، ڈاکٹر عبدالنعیم عزیزی، ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی اور ریاض احمد قادری کی خدمات آبِ زر سے لکھی جائیں گی۔ لیکن ابھی بہت سا کام باقی ہے۔

س: اردو میں ہائیکو، سانیٹ، ترائیلے اور دیگر غیر ملکی اصناف سخن میں بھی نعت کہی جارہی ہے۔ یہ نعت غزل کی ہیئت میں لکھی جانے والی نعت سے کس حد تک مختلف ہے؟

ج: ہر صنف سخن کا اپنا مزاج ہوتا ہے، ہر ملک کے لوگوں کے تخلیقی رویئے بھی مختلف ہوتے ہیں، ہر صنف سخن کا اپنا ایک آہنگ ہوتا ہے۔ ہائیکو ایک جاپانی صنف سخن ہے، جس نے ہمارے شعراء کو تیزی سے اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔ اب تو نعتیہ ہائیکو، سانیٹ اور دیگر اصناف وطن عزیز کی آب و ہوا میں اجنبی نہیں لگتیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ نعت میں بھی نئے نئے تجربے ہونے چاہئیں لیکن ادب و احترام کے دامن کو تھامتے ہوئے کوچہ غیر کی سیاحی کا اہتمام کیا جائے۔ جدت پسندی کہیں ایمان ہی کو نہ لے ڈوبے۔ یقیناً یہ اصناف، غزل کی ہیئت میں کہی جانے والی نعت سے موضوعات اور اظہار دونوں حوالوں سے مختلف ہیں۔ غزل کی ہیئت میں کہی جانے والی نعت آج بھی مقبول ترین نعت ہے۔ غزل کا لوچ اور رچاؤ دیگر اصناف سخن کو کہاں نصیب ہے۔ آج کا نعت نگار قطعہ نگاری کی طرف پھر سے لوٹ رہا ہے۔ نظم معریٰ میں بھی نعت کہی جارہی ہے۔ 21 ویں صدی کی آخری دہائی میں

جدید تر اردو نعت کے موضوعات کیا ہوں گے اس کا اندازہ ایک حد تک 21 ویں صدی کی پہلی دہائی میں کہی جانے والی نعت سے لگایا جاسکتا ہے۔

س: نعتیہ قصائد کی روایت کو کیونکر زندہ کیا جاسکتا ہے؟

ج: زندگی کا سفر اتنی تیزی سے طے ہورہا ہے کہ شاعر شعوری طور پر بھی اختصار پسندی کے دائرے میں سمٹ رہا ہے۔ قصائد کی روایت کو زندہ کرنے کی کوئی کوشش شاید زیادہ کامیاب نہ ہوسکے۔ ادب کے افق پر بھی نئے ستارے دریافت ہوتے رہتے ہیں اور کئی کہکشائیں خلاء کی وسعتوں میں گم ہوتی رہتی ہیں، آپ قانون فطرت کے خلاف جنگ تو نہیں کر سکتے۔

س: بعض لوگوں نے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز ہی نعت سے کیا جبکہ اکثر شعراء غزل سے نعت کی طرف آئے۔ ان دونوں طبقات کی نعتیہ شاعری میں کیا فرق ہے؟

ج: مَیں سمجھتا ہوں کہ ایک نعت گو کے لیے غزل گو ہونا بہت ضروری ہے۔ غزل کے کوچے میں جب اسے فنی پختگی حاصل ہوجائے، شعریت کی صحیح تفہیم سے آشنائی کا مرحلہ طے ہوجائے، تو پھر اسے اقلیم نعت میں داخلے کی اجازت ملنی چاہیے۔ نعت فنی محاسن اور شعری لطافت سے کیوں محروم رہے، نعت تو تمام اصنافِ سخن کی سرتاج ہے۔

س: شہر اقبال کا نعتیہ منظر نامہ آپ کو کیسا لگتا ہے؟

ج: بہت خوبصورت۔ شہر اقبال کے ماتھے کا جھومر اقبالؒ کی نعت ہے۔ اقبال کی فکری بلندیوں کی دہلیز کون عبور کرے گا۔ جس شہر کے نعتیہ منظر نامے میں اقبال بارگاہ رسالت مآبؐ میں اشکبار دکھائی دیں اس کا مقابلہ کون کرے گا۔ شجر طہرانی، اثر صہبائی، عشق الہاشمی نے اہتمام سے نعت کہی۔ مرے کالج میں میرا پہلا سال تھا۔ ہال میں نعتیہ مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اصغر سودائی اپنی معروف نعت مہمانِ عرش پڑھ رہے تھے اور میں اشکبار آنکھوں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

برستی رہتی ہیں ساون کے بادلوں کی طرح
حضورؐ! میری بھی آنکھیں مرے بڑوں کی طرح

قمر تابش، ابرار حسین ابرار، رفیق ارشد، عباس اثر، اطہر سلیمی، شفیق مشفق، آثم میرزا، ساغر جعفری، ریاست علی چودھری، سردار شاہجہان پوری، محبوب شفیع، یونس رضوی، جمیل نظامی، مرتضیٰ جعفری خار، کلیم سیالکوٹی، نیاز سیالکوٹی، شہر اقبال کے نعتیہ منظر نامے کے روشن چراغ تھے۔ اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ لمحۂ موجود میں بھی تاب اسلم، رشید آفرین، طارق اسماعیل، فاروق قمر صحرائی، افضل ایاز، منصور خاور، وحید انجم غزالی، حکیم خلیق حسین ممتاز، اعجاز عزائی، شاہد ذکی، ارشد طہرانی، وارث رضا، عابد چودھری، طالب بھٹی اور زاہد بخاری باقاعدگی سے نعت کہہ رہے ہیں۔ شہر اقبال کا نعتیہ منظر نامہ تازہ کاری کی ایک مثال ہے۔ آصف بھلی شہر اقبال کے ادبی منظر نامے میں رنگوں، روشنیوں اور خوشبوؤں کے اجتماع کا اہتمام کرتے رہتے ہیں۔

س: آپ کے خیال میں اردو کے چار بڑے نعت گو؟

ج: امیر مینائی، محسن کاکوروی، مولانا احمد رضا خاں اور مولانا حالی۔

س: لمحہ موجود میں جدید اردو نعت کے نمائندہ شاعر؟

ج: مظفر وارثی، اقبال کوثر، آصف ثاقب، ڈاکٹر ریاض مجید، جلیل عالی، راجا رشید محمود، خالد احمد، اقبال نجمی، منیر قصوری، طارق سلطان پوری، پروفیسر محمد اکرم رضا، عبدالغنی تائب، مشرف حسین انجم، خالد محمود نقشبندی، جان کاشمیری، واجد امیر، تنویر پھول، عابد نظامی، شاکر کنڈان، محمد شہزاد مجددی، بشیر حسین ناظم، ناصر زیدی، جسٹس (ر) محمد الیاس، مشکور حسین یاد، حفیظ الرحمٰن احسن، محمد محبّ اللہ نوری، ریاض احمد قادری، جمشید چشتی، ذکی قریشی، زاہد فخری، ناصر بشیر، بشیر احمد مسعود، سید صبیح رحمانی، سرور حسین نقشبندی، ریاض حسین زیدی۔ ممکن ہے کچھ نام فوری طور پر ذہن میں نہ آسکے ہوں۔

س: حال ہی میں اردو کے ممتاز نعت گو عبدالعزیز خالد کا انتقال ہوا ہے۔ ان کے حوالے سے آپ کیا کہیں گے؟

ج: عبدالعزیز خالد ایک بڑے شاعر تھے، مَیں پورے اعتماد کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ حفیظ تائب کے بعد عبدالعزیز خالد اردو کے سب سے بڑے نعت گو تھے۔ مظفر وارثی لمحہ موجود کے سب سے بڑے نعت گو ہیں۔ اگرچہ انہوں نے بڑی حد تک گوشہ نشینی اختیار کر رکھی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے حبیبؐ کے صدقے میں انہیں صحت کاملہ عطا فرمائے۔

س: وطن عزیز کے جلتے ہوئے پیش منظر کا لمحۂ موجود کی نعت میں ردِعمل کس طرح ہوا ہے؟

ج: بڑا شدید اور کربناک۔ خدا وطن عزیز کو اپنے حصارِ رحمت میں رکھے:

آندھیوں کی زد میں ہیں آقاؐ مساجد کے چراغ
کب سے محرابِ یقیں کی آبرو خطرے میں ہے

### جدید اردو نعت کے نمائندہ شاعر

# ریاض حسین چودھری سے طویل ادبی نشست

### آپ نے فکر ونظر کے ان گنت گوشوں کو تخلیق کی روشنی سے منور کیا ہے
### آپ کے چھ نعتیہ مجموعوں کو صدارتی سیرت ایوارڈ سے نوازا گیا

## انٹرویو: اشفاق نیاز

ضربِ قلم، ۲۰۱۶ء میں شائع ہوا

شہر اقبال کی علمی، ادبی اور مجلسی زندگی میں جدید اردو نعت کے نمائندہ شاعر ریاض حسین چودھری کا کردار کسی رسمی تعارف کا محتاج نہیں، آپ نے فکر و نظر کے ان گنت گوشوں کو تخلیق کی روشنی سے منور کیا ہے۔ ریاض حسین چودھری 8 نومبر 1941ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے، آپ کے والد گرامی چوہدری حاجی عبدالحمید شہر اقبال کے معروف صنعتکار اور تاجر تھے۔ تحریک پاکستان میں ان کے بزرگوں نے بھرپور حصہ لیا تھا۔ دھاروؤال پرائمری سکول سے انہوں نے پرائمری کا امتحان پاس کیا۔ ان دنوں پرائمری سکول میں چوتھی تک کلاسز ہوا کرتی تھیں۔ پرائمری کے بعد آپ گورنمنٹ ہائی سکول میں داخل ہوئے جہاں سے 1957ء میں آپ نے میٹرک کا امتحان پاس کیا، 1963ء میں مرے کالج سیالکوٹ سے بی اے کرنے کے بعد آپ نے پنجاب یونیورسٹی لاہور کے لاء کالج میں داخلہ لیا۔ مرے کالج میں مرے کالج میگزین اور لاء کالج لاہور میں ''المیزان'' کے دو دو سال تک اردو سیکشن کے مدیر رہے۔ قانون کا امتحان پاس کرنے کے بعد پرائیویٹ طالب علم کی حیثیت

سے آپ نے پنجاب یونیورسٹی سے اردو میں ایم کیا اور اپنے آبائی کاروبار سے منسلک ہوگئے۔ آپ دو بار حلقہ اربابِ ذوق سیالکوٹ کے اور ایک بار پاکستان رائٹرز گلڈ سب ریجن سیالکوٹ کے سیکرٹری منتخب ہوئے۔تقریباً 13 سال تک تحریک منہاج القرآن کے مرکزی سیکرٹریٹ میں مختلف عہدوں پر کام کرتے رہے۔ ریاض حسین چودھری پندرہ روزہ ''تحریک'' لاہور کے چیف ایڈیٹر کی حیثیت سے بھی خدمات سرانجام دیتے رہے۔ 2002ء میں تحریکِ منہاج القرآن کے شعبہ ادبیات کے صدر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے،''خونِ رگِ جاں'' ان کی ملی نظموں کا مجموعہ ہے۔ اب تک آپ کے سات نعتیہ مجموعے شائع ہوچکے ہیں۔ جن کے نام یہ ہیں۔ زرِ معتبر، رزقِ ثنا، تمنائے حضوری، متاعِ قلم، کشکولِ آرزو، سلامٌ علیک اور خلدِ سخن۔ رزق ثنا اور خلدِ سخن پر دوبار آپ کو حکومت پاکستان کی طرف سے صدارتی ایوارڈ ملا۔''رزقِ ثنا'' کو حکومتِ پنجاب نے سیرت ایوارڈ سے بھی نوازا۔ آج کل آپ حمد و نعت، غزل اور قومی شاعری کے حوالے سے دس بارہ مسودہ جات کو آخری شکل دینے میں مصروف ہیں۔

**سوال:** شاعری کیا ہے؟

**جواب:** شاخِ آرزو پر پھول کے کھلنے اور خوشبو کا مشامِ جاں کو معطر کرنے کا نام شاعری ہے۔ شعر تخلیقِ حسن ہے اور تخلیقِ حسن شعر، رعنائیوں کے جھرمٹ میں جذبوں کے مچلنے کا نام شاعری ہے۔ جگنوؤں کی روشنی کے رقصِ مسلسل کو شاعری کہتے ہیں۔ دل کے آبگینوں اور تخیل کی پرواز سے ہمکلامی کا نام شاعری ہے، شاعری تخلیقی آسودگی کا نام ہے سوچ جذبوں سے ہمکلام ہوتو شعر قرطاس وقلم کے درمیان ابلاغ پاتا ہے دراصل لفظ اور جذبے کے باطن میں جھانکنے کا ردِعمل پیکرِ شعری میں ڈھل کر لمحہ مسرت کے حصول کا باعث بنتا ہے، دل کی دھڑکنوں کے رقصِ مسلسل کو شاعری کا نام دیا گیا ہے۔

**سوال:** کیا شاعری کو مشغلے کے طور پر اپنایا جاسکتا ہے؟

**جواب:** جی نہیں، شاعری فل ٹائم جاب ہے، یہ ایک خداداد صلاحیت ہے جو ڈگریوں سے حاصل نہیں کی جاسکتی، ٹکٹ جمع کرنا تو مشغلہ ہوسکتا ہے لیکن شاعری نہیں، کوئی شخص یا تو شاعر ہوتا ہے یا پھر نہیں ہوتا۔ تیسری مخلوق کا شہرِ سخن میں داخلہ ممنوع ہے۔

**سوال:** شعر آمد ہے یا آورد؟

**جواب:** بہت پرانا سوال ہے۔ ہر دور میں مباحث کا موضوع بنا لیکن آج تک فیصلہ نہیں ہوسکا کہ شعر آمد ہے یا آورد۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ شعر کہنا ایک خداداد صلاحیت ہے، کتابوں کی مدد سے علمِ عروض تو سیکھا جاسکتا ہے لیکن کتابوں کی مدد سے کوئی شاعر نہیں بن سکتا۔ میرے خیال میں شعر آمد بھی ہے اور آورد بھی، شعوری کوششوں کا انکار آفاقی سچائیوں کو جھٹلانے کے مترادف ہے۔ خداداد صلاحیتوں میں نکھار شعوری کوششوں سے بھی پیدا ہوتا ہے البتہ بعض اوقات جب تخلیقی لمحہ گرفت میں آتا ہے تو شعوری کوششیں پس منظر میں چلی جاتی ہیں، شعر قلبِ انسانی پر خوشبو کی طرح اترتا ہے، شعر شعور اور لاشعور دونوں کی عطا ہے۔

**سوال:** آپ نے شاعری کی ابتدا کب کی؟

**جواب:** چھٹی یا ساتویں کلاس میں شعر گوئی کا آغاز ہوا۔ بچوں کے لیے دو نظمیں لکھیں لیکن بڑوں نے حوصلہ افزائی نہیں کی، یہاں عرض کرتا چلوں کہ حوصلہ افزائی انسان کے اندر کی صلاحیتوں کو جلا بخشتی ہے جبکہ حوصلہ شکنی اندر کے انسان کے قتل کی مرتکب ہوتی ہے، بدقسمتی سے ہر مرحلے پر مجھے حوصلہ شکنی کا سامنا کرنا پڑا حتیٰ کہ میرے ذوق کو رسالہ بازی کا نام دیا گیا۔ لیکن خدا کا شکر ہے ادب کے ساتھ میری کومٹ منٹ کبھی تنزلی کا شکار نہیں ہوئی۔ تحدیثِ نعمت کے طور پر بیان کر رہا ہوں، دنیائے ادب سے ایک دن کے لیے بھی غیر حاضر نہیں رہا۔

**سوال:** بچپن میں آپ کس قسم کا لٹریچر پڑھا کرتے تھے؟

**جواب:** ''کھلونا'' دہلی سے آیا کرتا اور سٹال پر بآسانی دستیاب ہوتا۔''تعلیم و تربیت'' لاہور سے شائع ہوتا ''علم و ادب'' کا اجرا سیالکوٹ سے ہوا تھا۔ اسلم ملک اس کے ایڈیٹر تھے۔''بچوں کی دنیا'' ''کلیم'' بہت سے نام اب ذہن سے اتر چکے ہیں۔''نوائے وقت'' ہمارے ہاں باقاعدگی سے آتا۔ پاکستانیت کا شعور اور وطنِ عزیز سے غیر متزلزل اور غیر مشروط کومٹ منٹ ''نوائے وقت'' ہی کی عطا ہے۔ ترقی پسند تحریک کا علم بردار ہفت روزہ ''لیل و نہار'' بھی زیرِ مطالعہ رہتا۔ نوائے وقت کے ہفت روزہ قندیل اور لیل و نہار کے بچوں کے صفحات پر میری نظمیں شائع ہونا شروع ہوگئیں تھیں، نعتیہ شاعری کی اشاعت کا آغاز ہفت روزہ قندیل سے ہوا۔ اس وقت شرقی بن شائق اس ہفت روزہ کے ایڈیٹر تھے، روزناموں کے ہفتہ وار میگزین شائع کرنے کا ابھی رواج شروع نہیں ہوا تھا۔ ماہنامہ ''نقاد'' کراچی اور'' بیسویں صدی'' دہلی بھی باقاعدگی سے پڑھا کرتا۔ آٹھویں کلاس تک نسیم حجازی کے تقریباً تمام تاریخی ناول پڑھ چکا تھا۔ بچپن میں کلام اقبال بلند آواز سے پڑھتا۔ اکثر اشعار کے معانی پوری طرح سمجھ میں نہیں آتے تھے لیکن یہ اشعار پڑھ کر میں آبدیدہ ہوجاتا۔

وہ نظر آتا ہے تہذیب حجازی کا مزار

مَیں اکثر رو پڑتا۔ ملتِ اسلامیہ کی شیرازہ بندی کے خواب کو تعبیر نہ مل سکی۔ اب تو خود بھی مسلم امہ کی زبوں حالی پر خون کے آنسو روتا ہوں، حضورؐ کی امت کا ایک نوحہ گر ہوں۔ غالب، اقبال اور فیض میرے پسندیدہ شاعر ہیں، ساحر لودھیانوی کی مزاحمتی شاعری نے بے حد متاثر کیا۔

**سوال:** اپنے کالج کے احباب اور اساتذہ کا ذکر کرنا پسند کریں گے؟

**جواب:** 1957ء میں میٹرک کرنے کے بعد مرے کالج سیالکوٹ میں داخل ہوا لیکن شدید علالت کی وجہ سے میرا یہ سال ضائع ہوگیا۔ اگلے سال کالج جائن کیا۔ وارث میر اور ع ادیب کا طوطی بول رہا تھا دونوں بہت اچھے مقرر تھے، اب دونوں اللہ کو پیارے ہو چکے

ہیں، اللہ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے، ٹامس وحب کالج کے پرنسپل تھے جبکہ ٹریسلر وائس پرنسپل تھے۔ مرے کالج اُس وقت ایک مشنری کالج تھا۔ سٹیفن صاحب ہمارے پولیٹیکل سائنس کے ٹیچر تھے۔ آسی ضیائی صاحب اردو پڑھایا کرتے تھے، ہم کالج ٹائم کے بعد ان سے طلسم ہوشربا سبقاً پڑھا کرتے تھے۔ میں مرے کالج میگزین کا دو سال تک مدیر رہا۔ بزم اردو کے صدر کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ پروفیسر امین طارق بزم اردو کے سیکرٹری تھے، آج کل ریٹائرمنٹ کے بعد کسی پرائیویٹ کالج میں خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ ریاض احمد چغتائی، منیر احمد بھٹہ، اعجاز بھٹہ (جو اعظم بھٹہ کے چھوٹے بھائی تھے جوانی ہی میں ان کا انتقال ہوگیا) مشتاق احمد باجوہ، محمد اسلم خان، اقبال منہاس، خواجہ اعجاز احمد بٹ میرے قریبی ساتھی تھے۔ نیاز احمد صوفی بھی ہمارے ساتھیوں میں شامل تھے۔ صوفی محمد اشرف مرے کالج میگزین کے نگران تھے۔

**سوال:** اب کچھ لاء کالج لاہور کا ذکر ہوجائے۔

**جواب:** 1963ء میں مرے کالج سیالکوٹ میں بی اے کرنے کے بعد اورینٹل کالج لاہور (پنجاب یونیورسٹی) میں ایم اے اردو میں داخلہ لیا۔ سید عبداللہ کالج کے پرنسپل تھے۔ ایک ماہ تک ایم اے اردو کا طالب علم رہا۔ وولز ہوسٹل میں رہائش بھی مل گئی لیکن جب لاء کالج میں ایوننگ کلاسز کا آغاز ہوا تو لاء کالج میں داخلہ لے لیا۔ دو سال تک ''المیز ان'' کا ایڈیٹر رہا۔ کوکب اقبال انگریزی سیکشن کے ایڈیٹر تھے، مجلسِ ادارت میں بشیر انصاری بھی شامل تھے، یہ فیلڈ مارشل جنرل محمد ایوب خاں کا دور تھا۔ صدارت ان کا مقدر بنی۔ نواب آف کالا باغ پنجاب کے گورنر تھے، جمہوریت کا گلا گھونٹ دیا گیا تھا۔ میری ایک غزل المیز ان میں شائع ہوئی جس کا ایک شعر ہے:

کیسے بہار آئے کھلیں پھول کس طرح
گلچیں مرے چمن کا نگہباں ہے ان دنوں

اردو سے بے وفائی کا نتیجہ آج تک بھگت رہا ہوں۔ گو لاء کرنے کے بعد جلیل جاوید ایڈووکیٹ اور میں نے پرائیویٹ طلبا کی حیثیت سے پنجاب یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کرلیا لیکن یوں میرے قیمتی چار سال ضائع ہوگئے، قانون کی تعلیم سے مجھے کچھ حاصل نہ ہوا۔ اردو چھوڑ کر لاء کالج میں داخلہ لینا میری ایک بڑی غلطی تھی۔

سوال: اپنے زمانۂ طالب علمی کے مزید اشعار سنائیے۔

جواب: تو سنیئے:

ماں کا دل کانچ کی گڑیا سے بھی نازک ہے ریاضؔ
رات کو آؤ گے کب، ماں کو بتا کر جانا

حسرتِ تعبیر کی یہ انتہا دیکھو ریاض
ایک چڑیا مرگئی ہے چونچ میں تنکا لیے

کچے مکاں سے جب بھی نکلتی ہے تو کبھی
جھکتی ہیں اونچے مکانوں کی سمٹیاں

سردی کا زور ٹوٹ چکا ہے مگر ابھی
چینی کی ایک گڑیا سی لپٹی ہے شال میں

**سوال:** نعت کیا ہے؟ کیا نعت اتحادِ امت کی بنیاد بن سکتی ہے؟

**جواب:** نعت درود و سلام کے پیکرِ شعری کا نام ہے، ہدایت آسمانی کی آخری دستاویز قرآن مجید فرقان حمید میں تاجدار کائنات حضور رحمت عالمؐ کے محامد و محاسن کی دھنک پھیلی ہوئی ہے۔ نبیؐ آخرالزماںؐ کے شمائل، فضائل، خصائل اور خصائص ہی نعت کے اساسی رویے مرتب کرتے ہیں، اللہ کی سنت پر عمل کرتے ہوئے حضورؐ کے ذکر کو بلند کرنے کا نام نعت ہے۔ اللہ اور اس کے فرشتے حضورؐ پر درود پڑھتے ہیں۔ ہر ایمان والے کو حکم ہے کہ

حضورؐ پر درود پڑھا کرو اور سلام بھیجا کرو۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ لوگ جو نعت کو شجرِ ممنوعہ قرار دیا کرتے تھے وہ اب نعت کو اپنا رہے ہیں۔ یوں نعت اتحادِ امت کا باعث بن رہی ہے۔ مکینِ گنبدِ خضرا سے غلامی کا رشتہ از سرِ نو استوار کیے بغیر نہ اتحادِ امت کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوسکتا ہے اور نہ عظمتِ رفتہ کی بازیابی کی آرزو پوری ہوسکتی ہے۔

**سوال:** کیا نثر میں نعت ممکن ہے؟

**جواب:** کیوں نہیں، نثر اور نظم کا فرق اپنی جگہ۔ اس فرق کے باوجود جذبات میں ڈوبے ہوئے ہم ایسے نثر پارے بھی دیکھتے ہیں جن پر شاعری کا گمان ہوتا ہے۔ قرآن پاک کو ایک نعتِ مسلسل کہا جاتا ہے۔ سرکارؐ کے محامد و محاسن ہر سمت جلوہ گر ہیں، قرآن نثر میں ہے نظم میں نہیں، عطاء اللہ شاہ بخاری، صاحبزادہ فیض الحسن، شورش کاشمیری، پیر کرم شاہ الازہری، شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہرالقادری اور دیگر علما کی تقاریر کے بعض حصے نعت کی ذیل میں آتے ہیں، ظاہری طور پر یہ تقاریر نثر میں شمار ہوتی ہیں۔

**سوال:** آپ کب سے نعت کہہ رہے ہیں۔ کب آپ پر انکشاف ہوا کہ آپ کے اندر ایک شاعر چھپا بیٹھا ہے؟

**جواب:** مجھے نہیں معلوم کہ میں کب سے نعت کہہ رہا ہوں، مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ مجھے کب احساس ہوا کہ میرے اندر ایک مدحت نگار موجود ہے۔ ایک تازہ شعر میں آپ کے سوال کا جواب موجود ہے۔

عالم ارواح میں معلوم تھا مجھ کو ریاضؔ
مَیں قلم رکھ دوں گا آقاؐ کے قدوم پاک پر

ایک نعت کے قطعہ بند اشعار:

روز الست آنکھ جو کھولی شعور نے
قدرت نے ایک نور سا ہاتھوں میں رکھ دیا

مَیں نے بڑے خلوص سے چوما اُسے ریاضؔ
اور پھر قلم حضورؐ کے قدموں میں رکھ دیا

**سوال:** کیا وجہ ہے کہ حمد کی نسبت نعت زیادہ کہی جارہی ہے؟

**جواب:** اس میں شاید شعوری کوششوں کا اتنا زیادہ دخل نہ ہو، مطلوب ومقصود اللہ رب العزت تک رسائی ہے لیکن یہ رسائی واسطۂ رسالت کے بغیر ممکن نہیں، قرآن پاک میں ارشادِ خداوندی ہے:

''اور (اے حبیب) اگر وہ لوگ اپنی جانوں پر ظلم کر بیٹھے تھے، آپ کی خدمت میں حاضر ہوجاتے اور اللہ سے معافی مانگتے اور رسولؐ بھی ان کے لیے مغفرت طلب فرماتے تو وہ (اس وسیلہ اور شفاعت کی بنا پر) ضرور اللہ کو توبہ قبول کرنے والا، نہایت مہربان پاتے''۔

یہ نقطہ نظر کسی بندے کا نہیں بلکہ قرآن کا اسلوب دلکش ہے، عرفانِ مصطفیٰ کے بغیر عرفانِ خدا ممکن نہیں۔ قرآن کلامِ خدا ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے کہ ہم نے آپ کا ذکر آپ کے لیے بلند کیا۔ آج کا شاعر دربارِ رسالت مآبؐ کے شعرا کے آثار قلم ہی سے اکتسابِ شعور کررہا ہے۔ آج کی نعت بھی حمدِ خدا کے شعور کو اجاگر کررہی ہے۔ نعت کا شاعر دہلیزِ مصطفیٰ کو چوم کر تیزی سے وادیِ حمد میں داخل ہورہا ہے۔ اب حمدیہ مجموعے الگ سے شائع ہورہے ہیں، روزِ ازل سے آج تک ایک لمحہ بھی حمدِ خدا سے خالی نہیں، کائنات کا ذرہ ذرہ اپنے خالق کی حمد بیان کررہا ہے، ذات الٰہی ہمیشہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہے۔ وہی ہمارا معبودِ حقیقی ہے اور اسی کی جانب ہمیں لوٹ کر جانا ہے۔ آج کا شاعر لاشعوری طور پر نعت میں حمدیہ اشعار بھی داخل کررہا ہے، حمدیہ مشاعروں کا بھی آغاز ہوچکا ہے، ہر شاعر کی آرزو ہے کہ جب وہ داورِ محشر کے حضور پیش ہو تو اس کے ہاتھ میں بیانِ حمد بھی موجود ہو، مَیں نے خود حمد کے دو مجموعے ترتیب دیے ہیں، حمدیہ

قطعات پر مشتمل کتاب الگ سے شائع ہو رہی ہے۔ (ان شاء اللہ)

**سوال:** اس مرحلہ پر آپ اپنے مرحوم ساتھیوں کو یاد کرنا چاہیں گے۔

**جواب:** کتنے روشن ستارے افق کے پار غروب ہوگئے، اب وہ عدم آباد میں آباد ہو چکے ہیں۔ جہاں سے آج تک کوئی واپس نہیں آیا۔ شجر طہرانی، عشق الہاشمی، اثر صہبائی، ڈاکٹر عبدالحمید عرفانی، عباس اثر، یونس رضوی، میر عزیز، تصور کرتپوری، اطہر سلیمی، رفیق ارشد، ابرار حسین ابرار، کلیم سیالکوٹی، شفیق مشفق، قمر تابش، قاضی محمد اختر، اسلم عارف، صادق چغتائی، اسلم دیوانہ، محبوب شفیع، آثم میرزا، اصغر سودائی، جلیل جاوید، خلیل انور، اکرام سانبوی، ع ادیب، نصرت ادیب ہاشمی، ریاست علی چودھری، آثم فردوسی اشکبار آنکھیں ان مرحومین کی ادبی خدمات کو خراج تحسین پیش کرتی ہیں۔

**سوال:** آپ اپنے تخلیقی سفر کے کس دور کو شہرِ اقبال کا سنہری دور قرار دیں گے؟

**جواب:** میرے خیال میں 1975ء سے 1985ء تک کا دور عہد جدید میں ادبی حوالوں کے لحاظ سے شہر اقبال کی موجودہ تحریک کا سنہری دور ہے۔ گلزار بخاری، شفیع ضامن، سید آفتاب احمد نقوی، انور جمال، محمد یونس حسرت، یوسف نیر، اعزاز احمد آذر اور چند ایک دوسرے احباب کا لاہور اور دیگر شہروں سے شہر اقبال کے مختلف کالجوں اور اداروں میں تبادلہ ہوا۔ اور شہر اقبال کی مجلسی و ادبی زندگی ادب کے نئے ذائقوں سے آشنا ہوئی۔ یہ حلقہ ارباب ذوق کا بھی سنہری دور تھا۔ حلقے کو مقامی ادبا اور شعرا کا بھی بھرپور تعاون حاصل رہا۔ تاب اسلم، اصغر سودائی، وارث رضا، ناصر ہیرا، عابد چودھری، خواجہ اعجاز احمد بٹ، ازہر منیر، ع ادیب، طارق اسماعیل، رشید آفریں، اسلم ملک، ارشد طہرانی، یونس رضوی، عباس اثر، میر عزیز، اطہر سلیمی، رفیق ارشد، ابرار حسین ابرار، اسلم عارف، صادق چغتائی، محبوب شفیع، منظور حسین کاشف، ضرار محمود ملک، اعزاز احمد آذر، افتخار بخاری، زرینہ زمرد ملک، امیر فیصل، خالد مجاہد، تجمل سلیمی، ریاست علی چودھری، آصف بھلی ارباب علم وفن کی ایک کہکشاں آباد تھی۔

**سوال:** موجودہ منظر؟

**جواب:** موجودہ علمی، ادبی، مجلسی اور صحافتی منظر نامے میں آصف بھلی ایڈووکیٹ سب سے زیادہ فعال اور متحرک نظر آتے ہیں۔ تاب اسلم، خالد خلیل، زاہد بخاری، طالب بھٹی، رشید آفریں ارشد طہرانی، شاہد ذکی، صدیق رشب، یوسف نیز خالد خلیل، خواجہ اعجاز احمد بٹ، اشفاق نیاز مختلف فورمز پر سرگرم عمل ہیں۔ خالد لطیف کا ''سٹی میگ'' شہر اقبال کی ثقافتی زندگی کا ترجمان ہے۔ فاروق ثمر صحرائی کی معاونت میں یہ پرچہ تیزی سے ترقی کی منازل طے کر رہا ہے، ادبی حوالے سے بھی چیمبر کی خدمات کا حوالہ آبِ زر سے لکھا جائے گا۔ حلقہ ارباب ذوق ختم ہو چکا ہے۔ اور پاکستان رائٹرز گلڈ مسلسل خاموش ہے۔

**سوال:** سیالکوٹ نے علامہ اقبال اور فیض جیسی نابغہ روزگار شخصیات کو جنم دیا، اقبال اور فیض کے بعد اُس معیار کا ادب تخلیق نہیں ہو رہا۔

**جواب:** آپ کی خدمت میں اقبال ہی کا ایک شعر پیش کر رہا ہوں۔ یہی آپ کے سوال کا جواب بھی ہے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اقبال نے ہی کہا تھا:

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی!

وقت سب سے بڑا نقاد ہے۔ بدقسمتی سے بعض اہلِ قلم اپنا مقام خود متعین کرنے لگتے ہیں۔

**سوال:** آپ نے ''اکائی'' کے نام سے ایک نئی صنف سخن متعارف کرائی ہے، تفصیلات

سے آگاہ فرمائیں۔

**جواب:** ہمارے یک مصرعی اور سہ مصرعی نظموں کی روایت پہلے سے موجود ہے۔ میں نے یک مصرعی نظموں میں معمولی سی ہیئت کی تبدیلی کر کے اور بہت سی یک مصری نظموں کو ایک مربوط نظم کی شکل دے کر اس نئ صنف سخن کو اکائی کا نام دیا ہے اس لیے کہ اکائی بہت سی اکائیوں کا مجموعہ ہے، ہر''اکائی'' کا پہلا لفظ یا الفاظ ایک ہی ہوں گے۔ اس تکرار سے ایک خاص آہنگ پیدا ہوتا ہے۔ اکائی کی تمام اکائیاں ایک ہی بحر میں ہوں گی۔ ''اکائی'' کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اسے محافل میں ترنم سے پڑھا بھی جاسکتا ہے۔ یہ نئ صنف سخن صرف حمد و نعت کے لیے مختص ہوگی اکائی کا دامن زیادہ سے زیادہ سلام اور منقبت تک پھیلایا جاسکتا ہے ماہنامہ ''ادب نعت'' لاہور کی مختلف شماروں میں اکائی کی مثالیں دیکھی جاسکتی ہیں۔

**سوال:** کیا عوامی سطح پر اس نئ صنفِ سخن کی پذیرائی کے امکانات موجود ہیں؟

**جواب:** بات یہ ہے کہ

جس دیے میں جان ہوگی وہ دیا رہ جائے گا

مجھے تیقّن ہے کہ اکائی ہوائے خوشگوار کا خنک جھونکا ثابت ہوگی، اربابِ علم وفن نے اسے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا ہے۔

**سوال:** نعت کی تاریخ صدیوں پر محیط ہے۔ کن نعت گوشعرا نے آپ کو متاثر کیا۔

**جواب:** نعت کی تاریخ صدیوں پر نہیں قرنوں پر محیط ہے۔

خدا خود میرِ مجلس بود اندر لامکاں خسروؔ

نعت ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی، قیامت کا دن بھی عظمتِ مصطفیٰ کے ظہور کا دن ہے۔ تمام الہامی صحیفوں میں محامد مصطفیٰ کے چراغ جل رہے ہیں، قرآن کو ایک نعتِ مسلسل کہا گیا ہے۔

ریاض اسمِ محمدؐ تو خود اک نعتِ مسلسل ہے
ترے الفاظ کیا تیرا قلم، تیری زباں کیا ہے

امیر مینائی، محسن کاکوروی، مولانا احمد رضا خاں، مولانا ظفر علی خاں، اقبال اور ہمارے عہد میں حفیظ تائب، حافظ مظہرالدین، مظفر وارثی، حافظ لودھیانوی، احمد ندیم قاسمی سے عبدالعزیز خالد تک، اور پھر حالی

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقت دعا ہے
امت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے

**سوال:** نعت کی ادبی حیثیت کے بارے میں کیا کہیں گے؟

**جواب:** کیا یہ عجیب بات نہیں کہ مرثیہ کی تو ادبی حیثیت کو تسلیم کرلیا گیا لیکن نعت کو محض حصولِ برکت کی چیز سمجھ کر نظر انداز کرنے کی جسارت کی گئی، انیس اور دبیر کی ادبی خدمات سے انکار نہیں۔ لیکن امیر مینائی، محسن کاکوروی، مولانا احمد رضا خاں، مولانا ظفر علی خاں اور اقبال کی نعت کو نصاب کا حصہ کیوں نہ بنایا جاسکا؟ ادبی تاریخ کے مؤرخ پر ابھی اس سوال کا جواب قرض ہے۔ الحمدللہ، نعت کی ادبی حیثیت کو تسلیم کرلیا گیا ہے، بقول حفیظ جالندھری:

بڑے زوروں سے منوایا گیا ہوں

**سوال:** پاکستان میں غزل کا مستقبل کیا ہے، عصر حاضر میں غزل گو شعرا کے بارے میں کیا کہیں گے؟

**جواب:** غزل ایک سدا بہار صنفِ سخن ہے، ریختی کا بازار آج بھی گرم ہے، پاکستان میں ہی نہیں بھارت اور جہاں جہاں اردو بولی، سمجھی اور پڑھی جاتی ہے وہاں غزل کا حال بھی روشن ہے اور مستقبل بھی۔ عصر حاضر سے مراد اگر لمحہ موجود ہے تو عرض کروں گا کہ ہمارے نوجوان شعرا ہوائے خوشگوار کا ایک جھونکا ہیں، ان کے ہاں تازگی، شگفتگی اور مضمون آفرینی

کی اتنی دلکش مثالیں ملتی ہیں کہ قاری بے ساختہ داد دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ شہزاد احمد سے لے کر خالد احمد اور نجیب احمد تک غزل گو شعرا کی ایک کہکشاں جگمگا رہی ہے۔ سیالکوٹ کے حوالے سے تاب اسلم اور مشاہد ذکی کا نام لینا چاہوں گا۔ جلیل عالی، جان کاشمیری، اسلم کولسری، اختر شمار، آصف ثاقب، ظفر اقبال، تاب اسلم، میر مشکور حسین یاد، گلزار بخاری، سعداللہ شاہ، رومی کنجاہی، خورشید رضوی، رب نواز مائل، زہیر کنجاہی، تصور اقبال، ریاض مجید، کرامت بخاری، ارشد جاوید، سید ریاض حسین زیدی، امجد اسلام امجد، عطاء الحق قاسمی، اشرف جاوید، ناصر زیدی، ناصر بشیر بہت اچھی غزل کہہ رہے ہیں۔

**سوال:** سنا ہے آپ پاکستان رائٹرز گلڈ کے رکن ہیں۔ پاکستان رائٹرز گلڈ اس وقت کیا خدمات سرانجام دے رہا ہے؟

**جواب:** میں پاکستان رائٹرز گلڈ کا رکن ہی نہیں بلکہ پاکستان رائٹرز گلڈ سب ریجن سیالکوٹ کا سیکرٹری بھی رہا ہوں۔ آج کل تاب اسلم اس کے سیکرٹری ہیں، سوال کا دوسر احصہ چونکا دینے والا ہے۔ بھائی۔ پاکستان رائٹرز گلڈ کبھی بھی ایک فعال ادبی تنظیم نہیں رہی، ادیبوں اور شاعروں کی اس تنظیم نے آج تک ادیبوں اور شاعروں کے لیے کوئی مؤثر قدم نہیں اٹھایا۔ سنا ہے گلڈ کے آغاز پر ممبران کو پلاٹ دیئے گئے تھے، سیالکوٹ کے بعض لوگوں نے بھی بہتی گنگا میں اشنان کیا تھا۔ آج کل گلڈ ایک مردہ گھوڑا ہے جسے ہزار چابک مارنے سے بھی زندہ نہیں کیا جا سکتا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون.

**سوال:** آپ تحریک منہاج القرآن سے بھی وابستہ رہے ہیں؟

**جواب:** رہا نہیں، وابستہ ہوں اور یہ سودا زندگی بھر کا سودا ہے۔ میرے شہر کے مردِ قلندر نے کہا تھا:

قوت عشق سے ہر پست کو بالا کردے
دہر میں اسمِ محمدؐ سے اجالا کردے

تحریک منہاج القرآن دہر میں اسمِ محمدؐ سے اجالا کرنے کی تحریک ہے، اتحاد امت اس کے اہداف میں شامل ہی نہیں بلکہ اس کے لیے ہر سطح پر عملی جدوجہد ہورہی ہے، مصطفوی انقلاب ہماری منزل ہے۔ فرقہ واریت کا تحریک منہاج القرآن سے دور کا بھی واسطہ نہیں، تحریک فروغ علم کی بھی تحریک ہے۔ اسلام کے خلاف فکری مغالطوں کا علمی سطح پر جواب دیا جاتا ہے۔ مَیں تحریک کے سرپرست اعلیٰ اور بانی شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہرالقادری کو اپنے عہد کی دانش سے تعبیر کرتا ہوں، تحریک کا سفرعظمتِ رفتہ کی بازیابی کا سفر ہے اور یہ سفر پوری دنیا میں جاری ہے۔

**سوال:** ادب کے فروغ میں پرنٹ میڈیا اور الیکٹرونک میڈیا کے حوالے سے کیا کہیں گے؟

**جواب:** ادب کے فروغ میں پرنٹ میڈیا کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں، سچی بات تو یہ ہے کہ پرنٹ میڈیا کے بغیر ادب کا فروغ ممکن ہی نہیں، کتاب ارباب ذوق کی سب سے اچھی دوست ہے، بدقسمتی سے آج پرنٹ میڈیا بھی کتاب کی اشاعت کا فیصلہ میرٹ پر نہیں کرتا بلکہ کتاب کی اشاعت کا فیصلہ عالمی مفادات سے وابستہ ہوکر رہ گیا ہے۔ دھڑا دھڑ کتابیں شائع ہورہی ہیں۔ انتہائی دلکش اور خوبصورت کتابیں جو شائع ہونے کے ساتھ ہی کتابوں کے انبار میں دفن ہوجاتی ہیں۔ الیکٹرونک میڈیا ادب کے فروغ اور اس کی ترویج کے لیے انتہائی خدمات سرانجام دے سکتا تھا لیکن الیکٹرونک میڈیا ادیبوں اور شاعروں کے ہاتھ میں نہیں۔ مفادات کے قیدیوں کے ہاتھ میں ہے۔ سلسلہ یہاں بھی زر کی چمک کا ہے۔ نوٹوں کی برسات پر پرنٹ اور الیکٹرونک میڈیا کا کاروبار چلتا ہے اوپر سے نیچے تک ہر شخص مال بنانے کے چکر میں ہے۔ کرپشن نے پرنٹ میڈیا اور الیکٹرونک میڈیا کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ یہاں میں ایک بات کی وضاحت کرتا چلوں۔ جب الیکٹرونک میڈیا نیا نیا متعارف ہوا تھا تو کہا جاتا تھا کہ اب پرنٹ میڈیا کی اہمیت ختم ہوکر رہ جائے گی۔ لیکن خدا کا شکر ہے یہ خدشہ بے بنیاد ثابت ہوا ہے۔ اخبار اور رسائل پہلے سے بھی

زیادہ تعداد اور مقدار میں شائع ہو رہے ہیں۔ کتابوں کی اشاعت کی رفتار بھی حوصلہ افزا ہے۔ زندہ کتاب کبھی نہیں مرتی زندہ حروف لکھنے والے تخلیق کار بھی ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔

**سوال:** شاعری میں آپ نے زانوئے تلمذ کس کے آگے طے کیا، مطلب ہے آپ نے شاعری میں اصلاح کس سے لی؟

**جواب:** مرے کالج میں آسی ضیائی صاحب ہمارے اردو آپشنل کے استاد تھے، اُن دنوں آپ اپنے نام کے ساتھ رامپوری بھی لکھا کرتے تھے۔ شاعری پر آپ سے اصلاح لینا شروع کی۔ یہ سلسلہ تقریباً 50 برس پر محیط ہے۔ دو چار برس کی بات نہیں۔ اتنی مہربان اور شفیق شخصیت، اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ لاء کالج لاہور میں داخلہ لیا تو مجلسِ ادارت میں گوجرانوالہ کے بشیر انصاری (اب مولانا بشیر انصاری) بھی شامل تھے، شاعر بھی ہیں۔ ان سے دوستی ہوگئی اور انہی کے توسط سے آغا صادق (ساہیوال) سے تعارف ہوا اور ان سے بھی شاعری پر اصلاح لیتا رہا۔ ایک مرتبہ سیالکوٹ بھی تشریف لائے۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھے

**سوال:** نئی نسل کے لیے کوئی پیغام۔

**جواب:** میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے۔

پاکستان ہمارا گھر ہے، پاکستان ہماری پہچان ہے، پاکستان ہماری شناخت ہے۔ ہم کومٹڈ ہیں ارضِ وطن کے ایک ایک ذرے سے، ان دریاؤں سے، ان پہاڑوں سے اور اس خطہ پاک پر بسنے والے مفلوک الحال انسانوں سے، یہ کومٹ منٹ غیر متزلزل اور غیر مشروط ہے۔

کون اربابِ سیاست کو یہ سمجھائے ریاضؔ
یہ شکستہ سا مکاں، جیسا بھی ہے، اپنا تو ہے

پاکستان سے محبت کرو کہ یہ عالمِ اسلام کی پہلی دفاعی لائن ہے۔ فصیلِ ارضِ وطن پر چراغ بن کر جاگتے رہو۔

**سوال:** ان دنوں آپ کی کیا مصروفیات ہیں؟

**جواب:** شہر اقبال کی مجلسی، علمی اور ادبی زندگی اور میرے درمیان بڑھاپے کی دیوار حائل ہوگئی ہے۔ بڑھاپا تیزی سے حملہ آور ہوا ہے۔ شوگر اور بلڈ پریشر نے مجھے بے بس کر دیا ہے۔ ٹانگوں میں سکت نہیں رہی، مَیں نے زندگی میں سائیکل تک استعمال نہیں کی۔ شہر سے کینٹ تک پیدل جاتا اور پیدل آتا لیکن اب چند قدم چلتا ہوں تو ٹانگیں کانپنے لگتی ہیں، گھر کی چار دیواری تک محدود ہوکر رہ گیا ہوں۔ اللہ رب العزت کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میرا قلم کسی ضعف اور نقاہت کا شکار نہیں ہوا۔ ان دنوں غزل اور نعت کے حوالے سے اپنا تخلیقی کام سمیٹ رہا ہوں۔ بیک وقت دس بارہ مسودہ جات کو آخری شکل دے رہا ہوں جن میں نعت کے علاوہ حمد کے دو مجموعے، غزل کے دو مجموعے، حمدیہ اور نعتیہ قطعات کے دو مجموعے اور ملی شاعری کا ایک مجموعہ بھی شامل ہے۔ دعا کیجئے کہ یہ مجموعے میری زندگی میں شائع ہوجائیں۔ ''طلوع فجر'' پریس میں ہے۔ یہ بارہ ربیع الاول کے حوالے سے ۵۰۰ بنود پر مشتمل ایک طویل نعتیہ نظم ہے۔

فضائے نعت میں اڑتے ہوئے نہیں تھکتا
مرا قلم بھی ہے جبریل کے پروں کی طرح

## ممتاز نعت نگار اور معروف غزل گو

# ریاض حسین چودھری سے غیر رسمی گفتگو

انٹرویو: فاروق قمر صحرائی

(سٹی میگ:۱۶-۳۱ اکتوبر ۲۰۱۰ء)

ریاضؔ کا ''ریاض'' نصف صدی پر محیط ہے۔ اس دوران میں آپ دنیائے ادب سے ایک دن کے لیے بھی غیر حاضر نہیں رہے۔ ریاض حسین چودھری وطنِ عزیز کے ممتاز نعت نگار ہی نہیں بلکہ ایک معروف غزل گو بھی ہیں۔ ان سے ایک غیر رسمی ملاقات میں ان کی مدحت نگاری کے حوالے سے جو گفتگو ہوئی وہ سوال و جواب کی صورت میں نظر قارئین ہے۔

س: شاعری کیا ہے اور کیوں کی جاتی ہے؟

ج: کسی حسابی کلیے کی طرح شاعری کی تعریف ممکن نہیں۔ تخلیقِ حسن aesthetic creativity شاعری کا بنیادی وصف ہے۔ شاخِ آرزو پر جذبوں کے مچلنے اور پھر ان جذبوں کے خوشبو بن کر مضرابِ دل پر نغمے بکھیرنے کو شاعری سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ رہا سوال کہ شاعری کیوں کی جاتی ہے تو بھائی! اندر کی روشنی کو تو باہر آنا ہی ہوتا ہے۔ خوشبو کو کسی چار دیواری میں بند تو نہیں کیا جا سکتا۔ شاعری اندر کی روشنی اور خوشبو سے ہی ابلاغ پاتی ہے۔

س: کیا شاعر میں خداداد صلاحیتوں کا ہونا ضروری ہے؟

ج: بہت ضروری ہے۔ کوئی شخص شاعر ہوتا ہے یا نہیں ہوتا۔ یہ ایک خداداد صلاحیت

ہے جو کتابیں پڑھ کر یا ڈگریوں کے انبار لگا کر نہیں سیکھی جا سکتی۔البتہ شعوری طور پر ان خداداد صلاحیتوں کو نکھارا اور سنوارا جا سکتا ہے۔ البتہ شاعری کے اصول اور قواعد وضوابط ضرور سیکھے جا سکتے ہیں ان کا سیکھنا آمد اور آورد دونوں طرح کی شاعری کے لئے ضروری قرار دیتا ہوں۔

س: آپ نے شعر کہنے کا آغاز کب کیا؟

ج: چھٹی یا ساتویں میں پہلی نظم کہی تھی۔ آغاز بچوں کے لیے نظمیں لکھنے سے ہوا۔ ''لیل ونہار'' اور ''قندیل'' کے علاوہ بچوں کے رسائل تعلیم و تربیت، کھلونا، علم و ادب اور دیگر رسائل میں میری بے شمار نظمیں شائع ہوئیں۔ بچوں کے لیے پہلی نظم ''بڑھا چل بڑھا چل تو اے نوجواں'' 1959ء میں پھلواری کراچی میں شائع ہوئی۔

س: عام آدمی کیسے شاعر بن سکتا ہے؟

ج: شاعر بنتے نہیں بلکہ پیدا ہوتے ہیں۔ اوپر میں اس حوالے سے تفصیلی گفتو کر چکا ہوں۔

س: آپ کی پہلی نعت کب اور کس رسالے میں شائع ہوئی؟

ج: میری نعت پہلی بار نوائے وقت کے ہفت روزہ قندیل میں شائع ہوئی تھی۔ شرقی بن شائق قندیل کے ایڈیٹر تھے۔

س: اس نعت کا کوئی شعر عنایت فرمائیں۔

ج:

ریاضؔ نامہ سیہ ہے اپنا مگر تمنا ہے عاصیوں کی
ہو رقصِ رحمت مرے چمن میں حضورؐ، رقصِ شرر سے پہلے

س: سنِ اشاعت؟

ج: سال یاد نہیں۔ عرض کرتا چلوں کہ ان دنوں اخبارات کے سنڈے میگزین شائع کرنے کا رواج نہیں تھا۔

س: کیا آپ سمجھتے ہیں کہ شاعر کے لیے اصلاح ضروری ہے؟ آپ نے کس سے اصلاح لی؟

ج: شاعر ہی کیا ہر شخص کے لیے اصلاح کی ضرورت ہے۔ استاد کی مدد کے بغیر اعتماد سے آگے نہیں بڑھا جاسکتا۔ ہر قدم پر ٹھوکریں کھانے سے بہتر ہے کہ کسی ماہرِ فن کے آگے زانوئے تلمذ طے کیے جائیں۔ آسی ضیائی جو مرے کالج میں اردو ادب کے استاد تھے میں ان سے باقاعدہ اصلاح لیتا رہا ہوں۔ استادی شاگردی کا یہ دورانیہ تقریباً نصف صدی پر محیط ہے۔ آپ رامپور (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ سے ایم اے کیا۔ ہجرت کے بعد آپ شہرِ اقبال کے مضافاتی گاؤں فتح گڑھ میں رہائش پذیر ہوئے۔ اس دوران مَیں تھوڑے عرصے کے لیے آغا صادق سے بھی اصلاح لیتا رہا ہوں۔ آغا صادق ایک بار سیالکوٹ بھی تشریف لائے تھے۔

س: کیا آپ کی شعری سرگرمیاں صرف مشاعروں تک ہی محدود ہیں؟

ج: جی نہیں! مشاعرہ تو محض ابلاغ کا ایک وسیلہ ہے اور ہماری ثقافتی اور مجلسی زندگی کی آبرو ہے۔ مشاعروں کے علاوہ ہفتہ وار تنقیدی نشستوں کا آغاز بھی کیا۔ پاکستان نیشنل سنٹر ہماری ادبی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ اعزاز احمد آذر پہلے پریذیڈنٹ ڈائریکٹر تھے۔ بعد ازاں خالد خلیل، ضرار محمود ملک، ارشد طہرانی ادبی محافل کے انعقاد میں پیش پیش ہوتے۔ تاب اسلم پاکستان رائٹرز گلڈ کے سیکرٹری بھی تھے۔ نئی کتابوں کی تقریباتِ رونمائی، مختلف شعراء اور افسانہ نگاروں کے ساتھ شام منانے کی روایت، غرض ساری عمر اسی دشت کی سیاحی میں گزری ہے۔

س: آپ کی کون کون سی کتابیں شائع ہو چکی ہیں؟

ج: ''خون رگِ جاں'' (ملی نظمیں) 1970ء میں شائع ہوئی۔ نعتیہ مجموعے ''زرِ معتبر''، ''رزق ثناء''، ''تمنائے حضوریؐ''، ''متاعِ قلم''، ''کشکولِ آرزو'' اور ''خلدِ سخن''۔ ساری عمر دوسروں کی کتابوں کی تقریباتِ رونمائی کا اہتمام کرتا رہا لیکن اپنی کسی ایک کتاب کی بھی تقریبِ رونمائی منعقد نہ ہوسکی۔ البتہ گزشتہ دنوں چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری کی جانب سے میرے ساتویں نعتیہ مجموعے ''خلدِ سخن'' کی تقریبِ پذیرائی منعقد ہوئی، ''کفر ٹوٹا خدا خدا کرکے''۔

س: مزید اشاعتی پروگرام؟

ج: اپنا کام سمیٹ رہا ہوں۔ کتابوں کے مزید دو مسودے تیار ہو چکے ہیں۔ ''طلوعِ فجر'' ایک طویل نعتیہ نظم ہے۔ جو پانچ سو بندوں پر مشتمل ہے۔ اس کا موضوع 12 ربیع الاول ہے۔ جو تاریخِ کائنات کا سب سے بڑا دن ہے۔ غزل کی ہیئت میں کہی جانے والی نعتوں کا ایک مجموعہ ''غزل کا سر بکف'' بھی اشاعت کے لیے تیار ہے۔ غزلوں کو بھی علیحدہ کتابی صورت میں جمع کررہا ہوں۔ دعا کیجئے جتنا کام کیا ہے وہ سب میری زندگی میں ہی کتابی صورت میں سامنے آجائے۔

س: آپ نے شروع میں جو غزلیں کہیں ان کے چند اشعار جو آج بھی آپ کو یاد ہوں۔

ج:

میں جی رہا ہوں زندہ مسائل کی کوکھ میں
اپنے بدن پہ سوچ کی چادر لپیٹ کر

غزلوں کو ''سرِ صلیبِ بدن'' کے نام سے ترتیب دیا تھا۔ جناب عارف عبدالمتین نے اس پر دیباچہ بھی تحریر کیا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے یہ کتاب شائع نہ ہوسکی۔ چاہتا ہوں کہ

''سرِ صلیبِ بدن'] شائع ہوجائے اور عارف عبدالمتین کا دیباچہ محفوظ ہوجائے۔

س: دورِ حاضر کے کس شاعر نے آپ کو متاثر کیا ہے؟

ج: دورِ حاضر سے مراد اگر لمحۂ موجود نہیں تو عرض کروں گا کہ غالب اور اقبال کے بعد ساحر لودھیانوی نے مجھے متاثر کیا ہے۔ مزاحمتی شاعر کا شعور زیادہ تر انہی کی عطا ہے۔

س: کیا ادب کا کوئی مقصد ہونا چاہیے؟

ج: کائنات کی کوئی شے بھی مقصدیت سے خالی نہیں۔ ادب برائے ادب کے فلسفے کو مسترد کرتا ہوں۔ ادب برائے زندگی برائے وطن کا قائل ہوں۔ وطن عزیز پاکستان دو قومی نظریے کی بنیاد پر وجود میں آیا۔ پاکستان اسلام کا گہوارہ ہے۔ یہ عالم اسلام کی پہلی ایٹمی طاقت ہے۔ یہ مسلم امہ کی پہلی دفاعی لائن ہے۔ اور غلامانِ محمدؐ کا حصارِ آہنی ہے۔

س: کیا آپ اپنی شاعری سے مطمئن ہیں؟

ج: اطمینان کا دوسرا نام تخلیقی سطح پر اپنی موت کا اعلان کرنا ہے۔

س: غزل کے علاوہ آپ نے کن اصناف میں شاعری کی ہے؟

ج: غزل اور نعت کا آغاز ساتھ ساتھ ہوا۔ البتہ ابتداء میں غزل زیادہ کہی۔ سید آفتاب احمد نقوی کے مشورے پر نعت کی طرف خصوصی توجہ دی۔ غزل اب بھی ہوتی ہے لیکن بہت کم، تخیل طوافِ گنبدِ خضرا میں مصروف رہتا ہے۔ سوچ درِ اقدس پہ سرنگوں ہے۔ غزل کی ہیئت میں نعت کہنے کے علاوہ نظم معریٰ، نظم آزاد اور پابند نظم میں بھی نعت کہی ہے۔ ثلاثی اور نعتیہ قطعہ نگاری کی طرف خصوصی توجہ دی ہے۔

س: آپ کا آئیڈیل؟

ج: آقائے محتشمؐ کی ذاتِ اقدس کے علاوہ بھی کیا کوئی اور شخصیت آئیڈیل ہوسکتی ہے؟

س: آپ کا پسندیدہ رنگ؟

ج: گنبدِ خضرا کا رنگ۔ لباس سفید پسند کرتا ہوں۔

س: اپنی نعت کا کوئی نمائندہ شعر سنائیے؟

ج:

فضائے نعت میں اڑتے ہوئے نہیں تھکتا
مرا قلم بھی ہے جبریل کے پروں کی طرح

س: دنیائے شعر میں آزاد شاعری کا کیا مقام ہے؟

ج: آزاد شاعری سے اگر آپ کی مراد آزاد نظم ہے تو بھائی وہ تو اپنا وجود منوا چکی ہے۔ اگر مراد نثری نظم ہے تو میں اظہار پر پہرے بٹھانے کا قائل نہیں ہوں۔ بقول امجد اسلام امجد:

جس دیے میں جان ہوگی وہ دیا رہ جائے گا

س: آپ جدت پسند ہیں یا روایتی شاعری کو پسند کرتے ہیں؟

ج: وہ جدت بے معنیٰ ہے جس کی جڑیں اپنی روایت میں پیوست نہیں۔

س: کس ادبی تنظیم سے تعلق ہے؟

ج: حلقۂ اربابِ ذوق اور پاکستان رائٹرز گلڈ

س: الیکٹرانک میڈیا کے اس دور میں اردو ادب کی طرف قارئین کا رجحان کم ہو رہا ہے، ایسا کیوں ہے؟

ج: بظاہر ایسا ہی لگتا ہے کہ الیکٹرانک میڈیا نے پرنٹ میڈیا کو پیچھے دھکیل دیا ہے۔ قارئین کی بجائے ناظرین کی تعداد بڑھ رہی ہے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ اخبارات

و جرائد بدستور شائع ہورہے ہیں۔ کتابیں بڑی تعداد میں شائع ہورہی ہیں۔ الیکٹرانک میڈیا کے بارے میں بھی ٹیکنیکل کتابیں شائع ہورہی ہیں۔ یہ درست ہے کہ یہ زمانہ بیل گاڑی کا نہیں بلکہ راکٹ کا دور ہے۔ زندگی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ انسان کو کتاب کی ضرورت ہر دور میں رہے گی۔ نیوز چینلز کی بھرمار کے باوجود اخبارات بڑی تعداد میں شائع ہورہے ہیں۔ میں الیکٹرانک میڈیا سے خوفزدہ نہیں ہوں۔

س: اچھا شاعر بننے کے لیے کون کون سے عوامل ضروری ہے؟

ج: شعر گوئی عطیۂ خداوندی ہے۔شعر گوئی کی صلاحیتوں کو نکھارنے اور سنوارنے کے لیے استاد کی رہنمائی، مشقِ سخن اور مطالعہ بہت ضروری ہے۔

س: آپ کے خیال میں شاعری کا مستقبل کیا ہے؟

ج: تابناک، بہت ہی تابناک۔

س: ان دنوں ہونے والی شاعری کا معیار کیا ہے؟

ج: ان دنوں بہت ہی خوبصورت اور جاندار شاعری ہورہی ہے۔ تازہ کاری کی عمدہ مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔

س: اصغر سودائی سے اختلافات کی نوعیت کیا تھی؟

ج: اصغر سودائی میرے قابلِ احترام پیش رو تھے۔ اختلافات اصولی تھے، ذاتی نوعیت کے نہیں تھے۔ خواجہ طفیل محمد کی کتاب ''تحریکِ پاکستان میں سیالکوٹ کا حصہ'' میں تمام تفصیل درج ہے۔ سودائی صاحب کے احترام میں کبھی فرق نہیں آیا۔ بڑی محبت سے ملتے اور حوصلہ افزائی فرماتے۔ جب مجھے رزقِ ثناء پر صدارتی ایوارڈ ملا تو لاہور میں مبارکباد کا واحد ٹیلی گرام مجھے اصغر سودائی صاحب کی طرف سے موصول ہوا تھا، حق مغفرت کرے۔

س: آپ نے پاکستان بنتے دیکھا؟ اس وقت آپ کی عمر کیا تھی؟

ج: قیامِ پاکستان کے وقت میری عمر تقریباً چھ سال تھی اور میں غالباً پہلی یا دوسری جماعت کا طالب علم تھا۔ یہ ایک مشنری سکول تھا اور ہمارے گھر (رنگپورہ روڈ) کے بالکل سامنے تھا جو قیامِ پاکستان کے بعد بند ہوگیا۔ مجھے دھاروال سکول میں داخل کروادیا گیا۔ قیامِ پاکستان کی چند یادیں ذہن میں محفوظ ہیں۔ مثلاً میں رنگ ساز کی دکان پر کھڑا ہوں اور مسلم لیگ کا سبز پرچم رنگوا رہا ہوں۔ دکان کے سامنے ایک گوردوارہ ہے جس کے دروازے پر ننگی کرپان لے کر ایک سکھ پہرہ دے رہا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ہندوؤں اور سکھوں کے مکانوں کو آگ لگی ہے۔ لوگ لوٹ مار میں مصروف ہیں۔ مجھے یہ بھی یاد ہے جموں کی طرف سے آنے والے مہاجرین جموں روڈ سے گزر رہے ہیں۔ مہاجرین کو عارضی طور پر سکولوں وغیرہ میں ٹھہرایا جارہا ہے۔ مہاجرین کی زبانی ظلم کی داستانیں سنتے تو خون کھولنے لگتا۔ ایک عورت جو اپنا ذہنی توازن کھو چکی تھی ہماری گلی میں سے گزرا کرتی تھی۔ وہ بلند آواز میں پکارتی ''فرزند دلوں کے بند'' اس کے آنسو کبھی تھمتے ہی نہ تھے۔ جموں میں اس کے جوان بیٹوں کو شہید کردیا گیا تھا۔ راتیں ہم جاگ کر گزارا کرتے تھے کیونکہ ہندوؤں اور سکھوں کے حملے کا ڈر تھا۔ کبھی کبھی کرفیو بھی نافذ کردیا جاتا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہمارے محلے میں ایک ہی گھر میں ریڈیو تھا جہاں میں ابا جان کے ساتھ خبریں سننے جایا کرتا تھا۔ مجھے فخر ہے کہ میرے بزرگوں نے بھی پاکستان بنانے میں بھرپور حصہ لیا۔ بعد میں مجھے گھر کے بزرگوں سے معلوم ہوا کہ جب 1944ء میں قائداعظم سیالکوٹ تشریف لائے تھے تو جلسہ گاہ مولا بخش کے تالاب کے قریب ہمارے نوتعمیر شدہ مکان میں قائداعظم کو ٹھہرانے کا پروگرام تھا لیکن بعد میں قائداعظم کو چھاؤنی میں ٹھہرایا گیا۔ ہمارے مکان میں قائداعظم کے وفد کے دیگر اراکین نے قیام کیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ قائداعظم کی وفات پر گھر کے بزرگ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے اور ہمارے کارخانے کے باہر ہر آنے جانے والے کے بازو پر سیاہ پٹیاں باندھی جارہی تھیں۔

س: عشقِ حقیقی اور عشقِ مجازی میں کیا فرق ہے؟ اپنا نقطۂ نظر بیان کیجئے۔

ج: جو فرق خالق اور مخلوق میں ہے۔ وہی فرق عشقِ حقیقی اور عشقِ مجازی میں ہے۔

س: اپنی فیملی کے بارے میں کچھ بتائیں؟

ج: میری ماموں زاد میری شریکِ حیات ہیں۔ چار بیٹیاں اور ایک بیٹا مدثر، بہو اور ان کی دو بچیاں۔ مدثر کے بارے میں اپنے آقاؐ کے حضور التماس گزار ہوں۔

حضورؐ، میرا مدثر بھی گھر سے نکلا ہے
تلاشِ رزق میں بارش کے پانیوں کی طرح

س: شہرِ اقبال کا ادبی منظر نامہ

ج: حلقۂ اربابِ ذوق کا روشن ماضی باقی رہ گیا ہے۔ تاب اسلم پاکستان رائٹرز گلڈ سیالکوٹ کے سیکرٹری ہیں۔ بزمِ دوستانِ ادب سرگرمِ عمل ہے۔ زاہد بخاری، رشید آفریں، مخدومہ بخاری، طالب بھٹی، منصور خاور، محمد آصف بھلی، خواجہ اعجاز احمد بٹ، خالد خلیل، وارث رضا، شاہد ذکی، طارق اسماعیل، فاروق قمر صحرائی اور یوسف نیر متحرک دکھائی دیتے ہیں۔ اللہ ان کے حوصلوں کو بلند رکھے۔ تاب اسلم ''یدِ بیضا'' کے نام سے ایک ادبی پرچہ نکالتے ہیں۔ خالد لطیف صاحب ایک خوبصورت ثقافتی پرچے کے ایڈیٹر ہیں اور ادبی سرگرمیوں کو بھی بھرپور کوریج دیتے ہیں۔ ریڈیو پاکستان سیالکوٹ بھی ادبی پروگرام نشر کرنے میں پیش پیش رہتا ہے۔

# نثری نعت

''کاروانِ نعت'' کے ابرار حنیف صاحب کو انٹرویو دیتے ہوئے نثری نعت کے حوالے سے ریاض حسین چودھریؒ نے کہا تھا:

**''تخلیقی اور جمالیاتی اوصاف کی حامل نثر کو نثری نعت کہا جائے گا۔''**

''دنیا کے بتکدے میں پہلا وہ گھر خدا کا'' اور اس کے بعد کا مضمون ''لبیک یا رسول اللہ لبیک'' دراصل ان کیفیات کا مرقع ہیں جو کسی عاشق صادق پر نقشِ محبوب دیکھنے کے بعد طاری ہوجاتی ہیں پھر شاعر رسول ﷺ کی تو بات ہی اور ہے۔ یہ کیفیات اس کے لئے حرف وصوت کی کشتِ زعفران ہیں جس کی بدولت ان کا جہانِ مدحت مہک رہا ہے۔ ممتاز ادبا اور صاحبانِ نقد ونظر عشقِ رسول ﷺ میں جھومتی ہوئی اس باطنی نورانیت کو نعتیہ شعریت کی تخلیق کا لازمہ قرار دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان دو تحریروں کو نقد ونظر کے احاطے میں شامل کیا گیا ہے۔

# دنیا کے بتکدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا

ریاض حسین چودھری کے حرمین شریف میں حاضری کے وہ لمحات جن سے ان کے شعور نعت کو فروغ تجلی نصیب ہوا

Umra and Riaz Ch's Stream of Consciousness

(سیلانِ آگہی)

بس سے اترتے وقت ایک لمحہ کے لیے قدم رک گئے، چشم پرنم نے جھک کر مکہ مکرمہ کی سرزمین مصور کی بلائیں لیں۔ دھڑکتے دل نے خاکِ منور کو سلامِ شوق پیش کیا۔ ہر دھڑکن نے اپنے ہونٹوں پر حروفِ حمد سجالیے، دامن آرزو چاند ستاروں سے بھر گیا۔ شاخ تمنا پر کرنوں کے پھول کھل اٹھے۔ سجدے جبین شوق میں مچلنے لگے۔ لبیک اللھم لبیک کے الفاظ جگنو بن کر فضاؤں میں پھیل گئے، ہونٹ خشیت الٰہی سے کپکپارہے تھے بدن شاخ نازک پر بنے آشیانے کی طرح لرز رہا تھا۔

اے صناع ازل، اے رازق انس و جاں، اے مالک روز جزا، اے معبود حقیقی، اے میرے پیارے محمدؐ کے رب! قدم قدم میرا تو سر بھی اس قابل نہیں کہ سرزمین حرم کے لمسِ جاوداں سے ہمکنار ہوسکے۔ آسمان کی طرف التجائیہ نظروں سے دیکھا لیکن زمین اور آسمان کے درمیان آنسوؤں کی ان گنت دیواریں حائل ہوچکی تھیں۔ تشکر و امتنان کی خوشبو سانسوں میں رچ بس گئی۔

اللہ رب العزت نے ہدایت آسمانی کی آخری دستاویز، صحیفہ انقلاب قرآن مجید، فرقان حمید میں اس شہر دلنواز کی قسم کھائی ہے کہ شہر محبوبؐ کی اس لیے قسم کھاتا ہوں کہ میرا محبوبؐ اس میں چلتا پھرتا دکھائی دیتا ہے۔ اس خطہ نور و نکہت نے میرے محبوبؐ کے قدموں کو بوسہ دینے کا اعزاز لازوال حاصل کیا ہے۔ میں اسی سرزمین مقدس پر پلکوں کے بل چلنے کا آرزومند تھا۔

سامنے رنگ و نور کی ایک دنیا آباد تھی، کشتِ آرزو میں رحمت کی باد بہاری چل رہی تھی، آسمانوں سے کہکشاؤں کے جھرمٹ اتر کر خالق ارض و سما کی ربوبیت کا اعلان کررہے تھے، میں اپنا بیگ اٹھائے حرم شریف کی طرف بڑھ رہا تھا۔ مجھے شوق فراواں کی ہمرکابی میسر تھی۔ یہ خیال دامن دل سے لپٹ گیا کہ حرم کی انہی دلکش فضاؤں میں میرے حضورؐ بھی سانس لیتے ہوں گے۔ انہی پہاڑوں نے میرے آقاؐ کے چہرۂ انور کی زیارت کی ہوگی۔ آقا علیہ السلام کا مقدس بچپن انہی گلیوں میں گزرا ہوگا۔ متانت، شائستگی اور سنجیدگی کے الفاظ کی تخلیق انہیؐ کی گردِ پا سے ہوئی ہوگی، یہی چاند میرے آقاؐ کی انگشت مبارک کے اشارے پر وجد میں آ گیا ہوگا اور شق القمر کا معجزہ رونما ہوا ہوگا۔ اسی شہر مقدس کے مضافات میں غار حرا کی بساطِ ادب بچھی ہوگی۔ اللہ کی حاکمیت کے پرچم انہی منڈیروں پر لہرائے گئے ہوں گے، یہ سرزمین ملائکہ کی سجدہ گہ ہے، یہ اصحاب رسول کی معطر، معنبر اور مقدس سانسوں کی امین ہے، جان نثاری کے ان گنت پھول انہی فضاؤں میں کھلے ہوں گے۔ یہ قریۂ محبت تاریخ کے ایک ایک لمحے کا آئینہ دار ہے۔ قیامت تک اس سرزمین مقدس پر عقیدتوں کی شبنم گرتی رہے گی۔ ان مہکتی ہوئی فضاؤں میں ہچکیوں اور سسکیوں کی ان گنت دنیائیں آباد رہیں گی، یہ رسول اول و آخرؐ کا محبوب شہر ہے۔

حرم شریف کے اردگرد کسی ہوٹل میں سر چھپانے کو جگہ نہ ملی، یہ سعودی عرب میں 28 ویں شب رمضان تھی۔ رات غالباً نصف سے زیادہ گذر چکی تھی حرم اقدس کے باب ام ہانی کے سامنے کھڑا سوچ رہا تھا کہ اب کیا کروں۔ رمضان کے آخری ایام میں تو فرزندان توحید جوق در جوق ادھر کھچے چلے آتے ہیں، کہاں جاؤں گا، یہ خیال دل میں آتا تھا کیونکہ جہاں جانا چاہتا تھا وہاں تک تو آ چکا تھا۔ میں حالت احرام میں تھا اور عمرہ کی ادائیگی کا فریضہ جلد سے جلد ادا کرنا چاہتا تھا۔ زندگی ہی میں کفن بدن پر سجا کر جب انسان اپنے پروردگار کے حضور حاضر ہوتا ہے تو زمینی رشتے کچے دھاگوں کی طرح ایک ایک کر کے ٹوٹ جاتے ہیں۔ سو میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ فکری اور نظری رشتے خون کے رشتوں پر غالب آ چکے تھے، قریب ہی ایک منی چینجر کی دکان نظر آئی۔ کرنسی تبدیل کروائی۔ پیاس ستا رہی تھی رک کر ایک دکان سے ملک شیک کا ایک گلاس پیا تو جان میں جان آئی۔ ایک بڑے ہوٹل

کے کاؤنٹر پر منیجر کو ایک رات کے تین سو ریال پیش کیے لیکن وہ مسکرا کر کہنے لگا عید کے بعد آیئے گا۔ اپنے سامنے خنک پانی کا کٹورہ دیکھ کر صدیوں سے پیاسے انسان پر کیا گذرتی ہے۔ کچھ یہی کیفیت میری بھی تھی۔ اللہ کا گھر اتنا قریب تھا کہ غلاف کعبہ پکڑ کر بارگاہ خداوندی میں ہچکیوں اور سسکیوں کی زبان میں اپنی التجائیں پیش کرنے والے زائرین کی آنکھوں سے گرنے والے آنسوؤں کی آواز تک سنائی دے رہی تھی۔ کشکول آرزو اشک ہائے ندامت سے لبریز تھا لیکن ابھی عشق کا امتحان باقی تھا۔ چند قدم چلا تھا کہ زمین پر آلتی پالتی مارے چند ورکرز جو اورنج رنگ کی وردی میں ملبوس تھے کھانا کھا رہے تھے۔ ان کے مسکراتے ہوئے چہروں پر مجھے پاکستان کا لفظ لکھا ہوا دکھائی دیا۔ وطن کی مٹی کی خوشبو جگنو بن کر سانسوں میں اتر گئی۔ میں نے اردو زبان میں اپنا مسئلہ ان کے سامنے رکھا، واقعی وہ میرے ہم وطن نکلے، ایک صاحب نے جوتے رکھنے والے بلاکوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اپنا بیگ وہاں رکھئے۔ اطمینان سے عمرہ ادا کیجئے صبح تک آپ کے بیگ کو کوئی ہاتھ بھی نہیں لگائے گا۔ البتہ جوتوں کی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔ اس وقت میں نے نئی ہوائی چپل پہن رکھی تھی۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ میں نے ان احباب کا شکریہ ادا کرنے کے بعد اپنا بیگ سپرد خدا کیا اور باب ام ہانی کے راستے حرم شریف میں داخل ہوگیا۔

میں نہیں جانتا کہ بیت اللہ پر پہلی نظر کب پڑی، مجھے نہیں معلوم کہ اندر کی دنیا کس انقلاب سے روشناس ہوئی، تجلیات الٰہی کا مینہ برس رہا تھا۔ ذہن کی سرکشی پر رحمت کی پھوار پڑ رہی تھی۔ روح آلودگی سے پاک ہو رہی تھی۔ ندامت کے پسینے سے سارا جسم پہلے ہی شرابور ہو رہا تھا، تمام اشک وضو کا پانی بن گئے، میں گم سم کھڑا خانہ کعبہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سنا بھی تھا اور پڑھ بھی رکھا تھا کہ بیت اللہ پر پہلی نظر پڑتے ہی جو دعا مانگی جائے اسے خلعت قبولیت سے نوازا جاتا ہے لیکن ہونٹوں پر آنے سے پہلے ہی تمام دعائیں آسمان کی طرف پرواز کر چکی تھیں۔ آنکھوں نے ردائے حیرت میں منہ چھپالیا۔ لہو کی ایک ایک بوند کاسہ بکف تھی، اپنے ہونے کا احساس تک جاتا رہا تھا۔ میں کون ہوں؟ کہاں سے آیا ہوں؟ کس لیے آیا ہوں؟ رب کعبہ کی قسم میں سب کچھ بھول چکا تھا۔ حتیٰ کہ یہ بھی یاد

نہ رہا کہ یہ رمضان کا مہینہ ہے، سحری کا وقت قریب ہے اور مجھے روزہ بھی رکھنا ہے، سچ پوچھئے تو رحمت خداوندی کے حصار نور میں تھا۔ میرے اردگرد بندگان خدا کا ایک ہجوم تھا۔ ہر شخص اپنے من کی دنیا میں ڈوبا ہوا تھا۔ امن اور عافیت کی بادِنسیم محوخرام تھی ادب اور احترام کی فضا نے بیت اللہ کے گرد عقیدتوں کا ہالہ سا بنا رکھا تھا۔ آنکھیں طواف کعبہ میں مصروف تھیں اور حجر اسود کے بوسے لے رہی تھیں، صدیوں نے اپنے پر سمیٹ لیے۔

چشم تصور میں پہلا منظر ابھرتا ہے

حضورؐ کے جد امجد سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور ان کے فرزند ارجمند سیدنا اسماعیل علیہ السلام بیت اللہ کی تعمیر مکمل کر چکے ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک پتھر پر کھڑے ہوکر اپنے رب کے حضورؐ نبی آخرالزماں کے ظہور کی دعائیں مانگ رہے ہیں، یہ خوش نصیب پتھر اپنے مقدر کے ستارے کو یوں چمکتا دیکھ کر جھوم اٹھتا ہے، اپنے بدن پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قدموں کے نشان ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیتا ہے، نسبت رسول کی روشنی چاروں طرف پھیل جاتی ہے اور ہم مقامِ ابراہیم پر نوافل ادا کرتے ہیں۔

تاریخ کے اوراق الٹے جا رہے ہیں۔

حلیمہ کے مقدر کا ستارا اوج ثریا سے بھی پرے چمک رہا ہے، کائنات کی دولت اپنی گود میں سمیٹے حرم شریف میں آتی ہے۔ چاہتی ہے کہ نومولود کو حجر اسود کا بوسہ دلائے۔ حجر اسود وجد میں آ جاتا ہے۔ اپنے بخت رسا کی بلندیوں کو رشک سے دیکھتا ہے اور دیوار کعبہ سے نکل کر سیدہ آمنہؓ کے لالؐ کے لب اقدس کا بوسہ لے لیتا ہے۔ الصلوٰۃ والسلام علیک یارسول اللہ، ایک تقدس مآب سناٹا چاروں طرف محیط ہوجاتا ہے۔ اے حجر اسود! حضرت عمر فاروقؓ کا یہ فرمانا برحق ہے برحق ہے کہ تو ایک پتھر ہی تو ہے، نہ مجھے نفع پہنچا سکتا ہے نہ نقصان، میں تیرا بوسہ اس لیے لیتا ہوں کہ میرے آقاؐ نے تیرا بوسہ لیا ہے۔ قول عمرؓ برحق ہے لیکن اے حجر اسود ہم غلامان رسول ہاشمی تیرا اس لیے بھی بوسہ لیتے ہیں کہ تو نے ہمارے آقا علیہ السلام کے لب اقدس کو چوما تھا۔ اے حجر اسود! ردائے تکریم حشر تک تیرا مقدر بنے گی، نسبت رسولؐ کا تاج قیامت تک تیرے سر پر جگمگاتا رہے گا، اے سنگ

رحمت! تو ہمیشہ سلامت رہے۔

چشم تخیل میں ایک اور منظر جاگ اٹھتا ہے۔

جزیرہ نمائے عرب خشک سالی کی لپیٹ میں ہے۔ قدم قدم پر تشنگی نے ڈیرے جما رکھے ہیں۔ ہر گام پر پیاس کے صحرا خیمہ زن ہیں۔ ردائے سبز کو دیکھنے کے لیے آنکھیں ترس گئی ہیں۔ قحط سالی کے آثار دکھائی دے رہے ہیں۔ دن کو سورج آگ برساتا ہے اور رات کو خرمن آرزو سلگنے لگتا ہے، موسم جبر ہریالی کے تصور تک کو نگل چکا ہے۔ سرداران مکہ حضرت عبدالمطلب کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں، فریاد کناں ہیں کہ اے ہمارے سردار! اے خانہ کعبہ کے متولی! اب تو تشنگی ہونٹوں پر اگنے لگی ہے، چرند، پرند اور انسان پانی کی ایک ایک بوند کو ترس رہے ہیں، حضرت عبدالمطلب ننھے حضورؐ کا ہاتھ تھامتے ہیں۔ یتیم عبداللہؓ کو دیوار کعبہ کے ساتھ کھڑا کر کے رب کعبہ سے بارش کی دعا مانگتے ہیں۔ معصومیت چہرہ اقدس کے گرد ہالہ سا بنالیتی ہے، ننھے حضورؐ کے چشمان مقدسہ یقیناً آسمان کی طرف اٹھی ہوں گی، آسمان اپنے بخت رسا کی بلندیوں پر جھوم اٹھا ہوگا اور زبان حال سے پکار اٹھا ہوگا یاسیدی! یا مرشدی! اذن ربی سے ابھی حکم سرکارؐ بجا لاتا ہوں۔ یارسول اللہ! تحویل کعبہ کے وقت بار بار میری طرف دیکھنا آپؐ کے رب کو بہت پسند آئے گا اور ہدایتِ آسمانی کی آخری دستاویز میں اس کا ذکر بھی ہوگا آقاؐ میں اس لمحہ جاوداں کا منتظر رہوں گا۔ جب آپؐ میری طرف بار بار دیکھیں گے اور حالت نماز میں ہیں، جبریل اللہ کا پیغام لے کر پہنچ جائیں گے کہ محبوبؐ! رخ انور کعبہ کی طرف پھیر لیجئے آج سے کعبہ کو مسلمانوں کا قبلہ بنایا جارہا ہے۔۔حضورؐ کے وسیلہ جلیلہ سے مانگی ہوئی دعا کو قبولیت کا شرف عطا ہوتا ہے۔ افق پر بادلوں کا ہجوم اتر آتا ہے۔ ابر کرم جھوم کر آسمانِ طلب کو اپنے حصار میں لے لیتا ہے۔ خوب مینہ برستا ہے۔ زمین جل تھل ہوجاتی ہے۔ چہروں پر جمی ریگِ صحرا پانی کی خنک بوندوں میں تبدیل ہونے لگتی ہے۔ زمین سبزے کی چادر اوڑھ لیتی ہے۔ نبوت کے ہزاروں چاند چہرہ اقدس میں جھلملانے لگتے ہیں۔ روئیدگی حرف سپاس بن جاتی ہے، آقاؐ کرم، آقاؐ کرم...

چشم تصور ایک اور منظر دیکھتی ہے۔

حجر اسود کی تنصیب کا مرحلہ درپیش ہے۔ ہر قبیلہ یہ اعزاز حاصل کرنے کا آرزو مند ہے۔ قبائلی عصبیت جاگ اٹھتی ہے یہ فیصلہ نہیں ہو پاتا کہ اس اعزاز کا زیادہ حق دار کون ہے، جنگ کے مہیب سائے لہرا رہے ہیں۔ آخر کار طے پاتا ہے کہ جو شخص حرم اقدس میں سب سے پہلے داخل ہوگا اس کا فیصلہ تمام قبائل منظور کرنے کے پابند ہوں گے۔ دوسرے دن سب سے پہلے حرم اقدس میں تاجدار کائنات حضور رحمت عالم کا چہرہ انور طلوع ہوتا ہے قلب و نظر کا دامن ان گنت روشنیوں سے بھر جاتا ہے۔ قبائل کے چہروں پر امید کی روشنی پھیل جاتی ہے، رسول رحمت پہلے ہی جزیرۃ العرب میں امین اور صادق کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں۔ کردار کی خوشبو پہلے ہی دلوں کو مسخر کر چکی ہے۔ آقائے محتشمؐ، نبی مکرمؐ، رسول معظمؐ ایک چادر زمین پر بچھا دیتے ہیں، حجر اسود کو دستِ اقدس سے اٹھا کر چادر کے درمیان رکھتے ہیں، قبائلی سرداروں کو حکم دیتے ہیں کہ چادر کا ایک ایک کونہ پکڑ لو۔ اور پھر حضورؐ اپنے دست اقدس سے حجر اسود کو دیوار کعبہ میں نصب فرما دیتے ہیں، حجر اسود ممنونیت کے گہرے پانیوں میں ڈوب جاتا ہے، برہنہ تلواریں واپس نیام میں چلی جاتی ہیں، حکمت و دانائی کے پھول چاروں طرف کھل اٹھتے ہیں، امن کی باد بہاری چلنے لگتی ہے، روح کونین جھوم اٹھتی ہے۔

مرحبا سید مکی مدنی العربی
دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

تاریخ کا ایک اور ورق الٹ جاتا ہے۔

حضرت حمزہؓ غصے کے عالم میں حرم اقدس میں داخل ہوتے ہیں، ابوجہل نے آج نبی مکرمؐ کی شان میں گستاخی کی ہے۔ حمزہؓ، ابوجہل کے سر پر اپنی کمان دے مارتے ہیں کہ ملعون! تیری یہ جرأت کے میرے بھتیجے کے خلاف زبان دراز کرے۔ سن لے! آج سے میرا دین بھی محمدؐ کا دین ہے۔ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ، اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، محمدؐ اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔

وقت کا رہوار آگے بڑھتا ہے

سیدنا عمر فاروقؓ اسلام کے دامن رحمت سے وابستہ ہو چکے ہیں، سر اٹھا کر چلنے کی روایت کو نئی روشنی عطا ہوتی ہے۔ حضورؐ کی غلامی کا پٹکا گلے میں ڈالے مسلمانوں کی ایک جماعت کے ساتھ سیدنا عمرؓ حرم شریف میں برسر عام نماز ادا کرتے ہیں۔ فاروق اعظمؓ کے دبدبے کا یہ عالم ہے کہ کسی کو ان کے رستے کی دیوار بننے کی جرأت نہیں ہوتی۔ روشنی کے سفر کی رکاوٹیں دور ہو رہی ہیں، تحریک اسلامی قدم بہ قدم آگے بڑھ رہی ہے، ظلمت شب رخت سفر باندھنے پر مجبور ہے۔

چشم تصور احتراماً بار بار جھک رہی ہے

صلح حدیبیہ کا موقع ہے حضرت عثمان غنیؓ مسلمانوں کے سفیر بن کر مکہ میں تشریف لاتے ہیں، کفار انہیں پیش کش کرتے ہیں کہ عثمانؓ اب آپ مکے میں آ ہی گئے ہیں تو خانہ کعبہ کا طواف بھی کرتے جائیں لیکن غیرت عثمانیؓ اپنے آقا علیہ السلام کے بغیر طواف کعبہ کی پیش کش بھی قبول نہیں کرتے، عشق مصطفےٰ کا پرچم کچھ اور بھی سربلند ہو جاتا ہے۔

لوح شعور پر فتح مکہ کا منظر ابھرتا ہے

کفار و مشرکین اپنے انجام کا تصور کر کے کانپ رہے ہیں۔ انتقام کا خوف ان کے رگ و پے میں سرایت کر گیا ہے۔ ان کی آنکھوں میں مسلمانوں کو تپتی ہوئی ریت پر گھسیٹنے کا منظر جاگ اٹھا ہے، پیغمبر اسلام اور ان کے پیروکاروں کو کون کون سی اذیت نہ دی گئی، کفار و مشرکین مکہ سوچ رہے ہیں کہ آج ان سفاک لمحوں کا قرض چکایا جائے گا۔ گن گن کر بدلہ لیا جائے گا۔ آج سرزمین مکہ سرداران قریش کے خون سے سرخ ہو جائے گی لیکن فاتح مکہ کی چادر رحمت فضاؤں پر محیط ہے۔ محبت کا زم زم بہہ رہا ہے تاجدار کائناتؐ کی طرف سے اعلان ہو رہا ہے کہ آج جو ابوسفیان کے گھر میں پناہ لے لے گا اسے بھی امان دی جائے گی۔ جو شخص اپنے گھر کے اندر سے دروازہ بند کر لے گا اس سے بھی باز پرس نہ کی جائے گی جو شخص حرم اقدس کی حدود میں امان طلب کرے گا اس سے بھی درگذر

کیا جائے گا۔ خون کے پیاسوں کے سر پر سائبان حرم کا سایہ ہے۔ بیت اللہ کو تین سو ساٹھ بتوں سے پاک کیا جا رہا ہے۔ بلالؓ کعبہ کی چھت پر اذان دے رہے ہیں۔ اللہ اکبر اللہ سب سے بڑا ہے اللہ اکبر، اللہ سب سے بڑا ہے۔

حاجی عمرہ؟ حاجی عمرہ؟

ایک معلم میرے شانے ہلا رہا ہے۔

کیا؟ میں چونک پڑتا ہوں۔

صدیاں لمحۂ موجود کے دروازے پر دستک دے رہی ہیں۔ اپنے ہونے کا احساس لوٹ آتا ہے۔ میں کون ہوں؟ کہاں سے آیا ہوں؟ کس مقصد کی تکمیل کے لیے حاضر ہوا ہوں؟ سب کچھ مجھے یاد آجاتا ہے۔ آنکھیں بدستور طواف کعبہ میں مصروف ہیں۔

حاجی! عمرہ؟ وہ اپنے الفاظ دہراتا ہے۔

ہاں، مجھے عمرہ ادا کرنا ہے، میں اسے اشارے سے جواب دیتا ہوں۔

وہ مجھے بتاتا ہے کہ سو ریال لوں گا۔ میں اسے جواب دیتاہوں۔ نہیں پچاس ریال دوں گا، عمرے کا معاوضہ ہاتھ کے اشارے سے طے پاتا ہے۔ میں معلم سے پوچھتا ہوں میں نے وضو تازہ کرنا ہے، طہارت خانے کہاں ہیں؟ وہ بضد ہے کہ پہلے پچاس ریال دو پھر بتاؤں گا، مجھے یہ سودے بازی اچھی نہیں لگتی، میں ایک قدم آگے بڑھ جاتاہوں۔ ایک اردنی بھائی میری مشکل آسان کردیتے ہیں، الٹے پاؤں حرم اقدس سے باہر آتا ہوں وضو کرنے کے بعد حرم شریف میں داخل ہوتا ہوں اور تصویر ادب بن جاتا ہوں۔ خانہ کعبہ میرے سامنے ہے، دونوں ہاتھ بہر سلامی اٹھ جاتے ہیں، سرتاپا حرف تشکر بن جاتا ہوں۔ میرے اللہ، کہاں مجھ سا گناہ گار بندہ ناچیز اور کہاں تیرا گھر، آسمان کی طرف پرواز کرجانے والی ساری دعائیں لوٹ آتی ہیں، چہرہ اشکوں سے بھیگ جاتا ہے۔ ایک گنہ گار سیاہ کار عاجز ناچیز بندہ حرف دعا بن کر اپنے رب کے حضور حاضر ہے، **لبیک اللھم لبیک۔**

# لبیک یارسول اللہ ﷺ لبیک

(جناب محمد متین خالد نے درِ نبی ﷺ پر حاضری کے حوالے سے خوبصورت مضامین کا ایک دل آویز مجموعہ شائع کیا۔ ''لبیک یا رسول اللہ لبیک'' اس میں شامل کیفیت حضوری سے لبریز ایک ایمان افروز تحریر ہے جو ریاض حسین چودھریؒ کے عشق میں ڈوبے ہوئے قلم سے ٹپکی ہے۔ دراصل یہ تحریر جناب ریاضؒ کے ۱۹۸۵ء میں درِ حبیب ﷺ پر حاضری کے سفر نامۂ حجاز کا ایک اقتباس ہے۔ روضۂ رسول ﷺ پر یہ حاضری ریاض کی نعت نگاری کا سرچشمہ بن گئی۔)

''مسجد نبوی ﷺ کے جوار میں واقع ایک ہوٹل میں، میں نے غسل کیا، نئے کپڑے زیب تن کیے، میری ہمشیرہ نے مجھے خوشبوؤں میں بسا دیا اس لیے کہ اس کا بھائی، حضور ﷺ کا ایک ادنیٰ سا شاعر، اپنے آقا ﷺ کی بارگاہ میں حاضری دینے جارہا تھا۔ تمناؤں، آرزوؤں اور خواہشوں کا ایک لشکر اس کے ہمراہ تھا۔ آنسوؤں، ہچکیوں اور سسکیوں کا سیل بے پناہ اس کے ساتھ روانہ ہورہا تھا۔ میرا چھوٹا بھائی اظہر مجھے اشتیاق سے دیکھ رہا تھا۔ آخر اس سے نہ رہا گیا اور کہنے لگا، بھائی جان میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ جب آپ اپنے آقا ﷺ کی بارگاہ میں پیش ہوتے ہیں تو آپ پر کیا گزرتی ہے؟ یہ سن کر میں کانپ اٹھا۔ اب میں اسے کیا بتاتا کہ ایک مجرم اپنے آقا ﷺ کی عدالت میں حاضر ہورہا ہے۔ رسوائیوں اور ندامتوں کے سوا اس کے دامن میں کچھ بھی نہیں۔ کیا تم میری رسوائیوں کا تماشا دیکھنا چاہتے ہو؟ نہیں، اظہر نہیں۔ اور اقبالؒ کی یہ رباعی میرے ہونٹوں پر مچلنے لگی۔

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر
روز محشر عذر ہائے من پذیر

گر حسابم را تو بینی ناگزیر
از نگاہے مصطفیٰ پنہاں بگیر

اے میرے پروردگار! تو غنی ہے اور میں ایک فقیر بے نوا، حشر کے روز میرے عذر کو پذیرائی بخش کر میری خطاؤں سے درگزر کرنا، اگر میرا حساب لینا ناگزیر ہوجائے تو مجھے میرے حضورﷺ کے سامنے رسوا نہ کرنا، میں حضورﷺ کی شفیق نگاہوں کی تاب نہ لاسکوں گا۔

میں نے جلدی سے اظہر اور زاہد غنی (اپنے بہنوئی) سے ہاتھ ملایا اور تیز تیز قدموں سے سیڑھیوں کے ذریعہ نیچے اترنے لگا۔ الصلوۃ والسلام علیک یارسول اللہ ہر موئے بدن پکار اٹھا۔ ہوٹل اور مسجد نبویﷺ کا درمیانی فاصلہ چند قدموں پر محیط تھا لیکن مجھے یوں لگا جیسے یہ فاصلہ صدیوں پر پھیل گیا ہو۔ مجھے یوں لگا جیسے میں صدیوں سے اس سفر پر رواں ہوں، راستے گزر رہے ہیں لیکن منزل قریب نہیں آ رہی۔

۱۸ جون ۱۹۸۵ء، ان گنت تمناؤں، آرزوؤں، حسرتوں اور خواہشوں کی خلعت فاخرہ میں لپٹا ہوا ایک روشن اور منور دن، کلیوں کی نرماہٹ کا تابندہ احساس لیے ہوئے ایک جھلملاتا ہوا دن، میری حیات مستعار کے ناقابل فراموش اور یادگار لمحات کا حامل دن، بیان سے قاصر قلبی کیفیات میں ڈوبا ہوا ایک شگفتہ اور گداز دن، ایک عجیب سا کیف، ایک عجیب سا سرور اور ایک عجیب سا نشہ رگ و پے میں سرایت کررہا تھا۔ حد نظر تک پھیلا ہوا ایک دلنواز اور دل آویز منظر جس پر نئے دن کا مسکراتا ہوا سورج اپنی رو پہلی کرنیں بکھیر رہا تھا، میرے سامنے تھا۔ یہ دلنواز اور دل آویز منظر مجھے، میرے ہونے کا احساس دلا رہا تھا اور میری کائناتِ شعور کو لمسِ اثبات سے ہمکنار کررہا تھا۔ چاروں طرف انوارِ سرمدی کی بارش ہورہی تھی، نور کا باڑا بٹ رہا تھا، عمرہ کی ادائیگی اور حرم کی سرزمین پر سجدۂ بندگی ادا کرنے کے بعد میں مدینۃ النبی کی خاکِ شفا کو اپنی آنکھوں کا سرمہ بنانے کی سعادت حاصل کررہا تھا، ایک دیوانہ اپنے سرہانے غلامی کی زنجیر رکھ کر سونے والا دیوانہ، اپنی

آنکھوں میں حیرتوں کے سمندر چھپائے، ہونٹوں پر درود و سلام کے گجرے سجائے اور اپنی دونوں ہتھیلیوں پر عشق مصطفیٰ ﷺ کے چراغ جلائے، دیوانہ وار، شہرِ حضور ﷺ کی معطر، معتبر اور مقدس گلیوں میں آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کے ڈگمگاتے ہوئے قدم آہستہ آہستہ مسجد نبوی ﷺ کی جانب اٹھ رہے تھے۔ احساس ندامت قدم قدم پر دامن گیر تھا، ماتھے پر عرقِ انفعال کے چمکتے ہوئے قطرے خطاؤں اور گناہوں کی ایک طویل داستان بیان کررہے تھے، یہ روز، روز عید تھا۔ پلکوں پر اشکوں کا میلہ سا لگا ہوا تھا، پسِ مژگاں رتجگے کا سا سماں تھا۔ یہ عید میرے لیے اربوں، کروڑوں عیدوں سے بڑھ کر ایک ایسی عید تھی جس کے دامن میں روز اول سے میرے سلگتے ہوئے آنسو جذب ہورہے تھے اور میں نے وادیٔ خیال میں پیدا ہونے والی جلال و جمال کی تمام تر رعنائیاں جس عید کے انتظار میں پلکوں کی دہلیز پر نثار کردی تھیں، آنکھوں نے پلکوں پر آنسوؤں کی کناری سی لگا دی تھی۔ حریمِ دیدہ و دل میں چراغاں ہورہا تھا۔ میں کبھی اپنے آپ کو دیکھتا، من کے اندر تاریکیوں کے سوا کچھ نظر نہ آتا اور کبھی نگاہیں شہر پیغمبر ﷺ کے در و دیوار کو چومتیں جہاں اجالے ہی اجالے بکھرے ہوئے تھے، جہاں دھنک کے ساتوں رنگ ادب و احترام کی قندیل تھامے آہستہ آہستہ اتر رہے تھے۔ اندر کا موسم خوش گوار سے خوش گوار تر ہوتا چلا جارہا تھا، کشت آرزو میں باد بہاری چل رہی تھی، شمیمِ خلدِ مدینہ چاروں طرف محوِ خرام تھی۔ قریہ جاں کے کسی دور دراز گوشے سے ایک کمزور سی آواز ابھری، اس کمزور سی آواز نے میرے پورے وجود کو ہلا کر رکھ دیا۔ مجھے میری اوقات یاد دلا دی، اندر کی ساری ندامت پیشانی پر اُمڈ آئی، ریاض! تمہارے نامۂ اعمال میں رسوائیوں اور بداعمالیوں کے سوا کچھ بھی نہیں، تیری فرد جرم بڑی طویل ہے، تیری دونوں ہتھیلیوں پر اس فرد جرم کے اوراق دھرے ہوئے ہیں۔ ان اوراق پر تیرے ایک ایک جرم کی تفصیل درج ہے۔ ریاض! تیرا سینہ منافق ساعتوں کی آماجگاہ بنا ہوا ہے، تیرے من میں نفرتوں کا لاوا کھول رہا ہے، تیرے ظاہر و باطن میں ہر طرف کثافت اور غلاظت کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں، تمہاری یہ جرأت کہ والی کون و مکاں ﷺ کے دربار گہر بار میں چلے آئے ہو، کیا منہ لے کر حضور ﷺ کی بارگاہِ بے کس پناہ

میں جا رہے ہو؟ بندۂ گستاخ رک جا! خبردار! ایک قدم بھی آگے نہ بڑھانا، ضمیر کی عدالت سے فیصلہ صادر ہورہا تھا، میں سہم گیا، قدم رک گئے، کم مائیگی اور تر دامنی پاؤں کی زنجیر بن گئی، جسم شرمساری کے پسینے میں ڈوب گیا، میں ٹوٹ گیا۔ عالم تحیر میں گم، جوار مسجد نبویﷺ میں کھڑا تھا۔ قدم تھے کہ اٹھائے نہ اٹھتے تھے، نظریں تھیں کہ زمین میں گڑی جارہی تھی، اس عالمِ بے بسی میں میرے سرکارﷺ کی رحمت دستگیری کے لیے آگے بڑھی، میرے ہاتھ میں میری بیاض نعت تھی۔ میرے رتجگوں کا حاصل، حصار ہجر میں نوائے بردہ، میری دعائے نیم شبی کا ارمغان، میرے آنسوؤں، ہچکیوں اور سسکیوں کا آئینہ، میری عقیدتوں، محبتوں اور خود سپردگیوں کا سرنامہ، دل کو قدرے دلاسہ ہوا۔ عالم وجد میں قریۂ جان و دل میں جود و عطا کی سبز بوندیں اترنے لگیں۔ ایک عجیب سا احساس جاگ اٹھا۔ چلو سوت کی انٹی ہی سہی، شاید میرا نام بھی یوسفؑ کے خریداروں میں شامل ہوجائے۔ روح اور دل پشیمان ہوکر سلگ اٹھے۔

کیا عجب، سگان کوئے مدینہ کی رضا کے جویا رہنے کے صلے میں مجھ گناہ گار کو بھی شرف باریابی سے سرفراز کیا جائے! عجب ثنا خوانِ مصطفیٰ اور غلامانِ رسولِ ہاشمی کی کشف برادری کے بدلے میں دربارِ مصطفیٰﷺ کے کسی کونے کھدرے میں مجھے بھی جگہ مل جائے۔ اس احساس غلامی کے بیدار ہوتے ہی میری ذرا سی ڈھارس بندھی، ایک نیا حوصلہ ملا۔ ایک پر کیف بانکپن اور ایک عجیب سرشاری کا شعور عطا ہوا۔ تھوڑا سا اعتماد بحال ہوا تو سنبھل کر کھڑا ہوگیا۔ ذہن میں یہ خیال بجلی کی طرح کوند گیا کہ میں لاکھ برا سہی، لاکھ خطا کار سہی، چہرہ زمانے بھر کی سیاہی سے آلودہ سہی، لیکن پھر بھی اپنے شفیق اور مہربان نبیﷺ کا امتی تو ہوں۔ دعویٰ لاکھ جھوٹا سہی، انﷺ کی محبت کا دم تو بھرتا ہوں، میرے آقاﷺ پیکرِ عفو و کرم ہیں۔ انؐ کی رحمت کی کوئی حد نہیں، انؐ کے در سے کوئی سوالی خالی ہاتھ نہیں لوٹا۔ سب کا بھرم رکھنے والے رسولِ آخرﷺ مجھے بھی رحمت کی شال عطا کریں گے، وہ کہاں کسی کا نام و نسب اور کب کسی کا ہنر دیکھتے ہیں، مجھ سے بے ہنر کے برہنہ سر پر بھی

دست شفقت رکھیں گے، وہ تو کرم ہی کرم ہیں، رحمت ہی رحمت ہیں، عطا ہی عطا ہیں، کیا عجب مجھ ایسے روسیاہ کو بھی اپنی کملی کے اجالوں میں چھپالیں! کیا عجب ایک اچٹتی سی نگاہ مجھ جیسے پرتقصیر پر بھی ڈال لیں اور میرے مقدر کا ستارا چمک اٹھے! کیا عجب... کیا عجب... اور میری آواز رندھ گئی، ہچکی بندھ گئی... یارسول اللہﷺ! ایک دیوانہ اذن باریابی کا منتظر ہے، یا حبیب اللہﷺ! اپنے شاعر کو حاضری کی اجازت مرحمت فرمایئے! یارسول اللہﷺ! اس بھری دنیا میں کوئی اس کا پرسان حال نہیں، کوئی اس کے آنسو پونچھنے والا نہیں، کوئی اس پر نگاہ التفات ڈالنے والا نہیں، کوئی اس کے زخموں پر مرہم رکھنے والا نہیں، آقا حضورﷺ! یہ پریشان بھی ہے اور پشیمان بھی، یہ آرزوؤں اور تمناؤں کا ایک طوفان دل میں چھپائے چشمِ کرم کا منتظر ہے، حضورﷺ چشمانِ مبارک اٹھایئے، آقاﷺ نگاہ کرم فرمایئے، ضبط کا بندھن بار بار ٹوٹ رہا تھا۔ تمام آرزوئیں اور تمنائیں سیلِ اشک میں خس و خاشاک کی طرح بہنے لگیں، یارسول اللہ اُنظر حالنا، یارسول اللہ اُنظر حالنا۔

دل نے ایک بار پھر ٹوکا، ریاض! ذرا سنبھل کر قدم رکھ، یہ سر زمینِ محبوبِ خدا ہے۔ یہاں کے ذرے ذرے میں عشاقِ مصطفیٰ کے دل دھڑک رہے ہیں۔ یہ خطۂ دلنواز آج بھی میرے حضورﷺ کے نقش کف پا سے پھوٹنے والی شعاعوں سے جگمگا رہا ہے۔ دیار دل کا ہر منظر، کشورِ روح کا ہر پیکر کیفِ حضوری میں ڈوب گیا۔ ہر موئے بدن حرفِ سپاس بن گیا۔ نظریں آسمان کی طرف اٹھ گئیں اور ہاتھ دعا کے لیے پھیل گئے: اے قادر مطلق، اے بنجر زمینوں کی طرف کالی گھٹاؤں کو حکمِ سفر دینے والے رب! میری پلکوں پر جھلملانے والے تشکر کے آنسو قبول فرما۔ یا باری تعالیٰ! تو نے اپنے ایک گناہ گار بندے کو اس کی تمام تر رسوائیوں کے باوجود شہرِ حبیبﷺ کی زیارت کا شرف بخشا ہے تو اب اپنے محبوبﷺ کے ایک ادنیٰ سے شاعر کی حاضری کو لمحاتِ حضوری میں بھی بدل دے۔ اے میری سانسوں کے مالک! اے رحیم و کریم رب! میں تیرے محبوبﷺ کے دربار میں حاضری کے آداب سے واقف نہیں ہوں۔ میرے ذوق اور میرے شوق کو حدِ ادب میں

رکھ، میرے اضطراب کو حرفِ تحمل عطا کر، دل نے آہستہ سے سرگوشی کی، یہاں سانس بھی آہستہ لے، یہ شہر نبیﷺ ہے، دیکھ! حضورﷺ انہی فضاؤں میں سانس لیا کرتے تھے۔ انؐ کی مقدس سانسوں کی خوشبو آج بھی ان فضاؤں میں رچی بسی ہے۔

چشم تصور انگلی پکڑ کر مجھے میرے بچپن میں لے جاتی ہے، سردیوں کے دن ہیں، نماز عشاء کے بعد ہم سب بچے اپنے دادا جان کے بستر میں گھس جاتے ہیں۔ ایک ساتھ تقاضا ہوتا ہے کہ لالہ جی! کوئی کہانی سنائیں، وہ چند لمحے توقف فرماتے ہیں اور مدینے کی گلیوں کا ذکر چھیڑ دیتے ہیں، حضورﷺ کی کہانی سناتے ہیں، وہ ہمیں اپنے ساتھ طائف کے بازاروں میں لے جاتے ہیں، پہاڑوں کا فرشتہ حضورﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کرتا ہے یارسول اللہ! اگر حکم ہو تو اس بستی کو ان دو پہاڑوں کے درمیان پیس دوں لیکن حضورﷺ جو سرتاپا رحمت ہیں، پہاڑوں کے فرشتے کو ایسا کرنے سے روک دیتے ہیں۔ حضورﷺ کے مقدس ٹخنوں سے خون بہہ رہا ہے، آپﷺ ایک باغ میں تشریف لاتے ہیں۔ دادا جان ہمیں حضورﷺ کے بچپن کے واقعات سنایا کرتے، دائی حلیمہ کی قسمت پر رشک کیا کرتے، دائی حلیمہ جب حضورﷺ کو لے کر چلی تو اس کی مریل سی سواری سب تیز رفتار سواریوں سے آگے نکل گئی۔ جب وہ حضورﷺ کو اپنی گود میں لیے اپنی کٹیا میں داخل ہوئی تو کٹیا میں ہر طرف روشنی پھیل گئی۔ حضورﷺ پالنے میں ہوتے تو چاند حضورﷺ کی انگلی کے اشارے پر کبھی دائیں طرف جھک جاتا اور کبھی بائیں جانب۔ وہ ہمیں بتاتے کہ خانہ کعبہ میں تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے، عرب اپنے ہاتھ سے تراشے ہوئے بتوں کی پوجا کرتے تھے۔ کبھی دادا جان ہمیں بتاتے کہ حضورﷺ مہمان عرش بن کر آسمانوں کی سیر کو گئے تھے۔ حضرت بلالؓ کا ذکر کرتے کہ اسلام قبول کرنے پر انہیں ریت پر گھسیٹا جاتا۔ غار حرا کا ذکر آتا، حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کا واقعہ سناتے، دادا جان کی آواز بھرا جاتی! آنکھیں چھلک پڑتیں، ہم بچے حیران ہوتے کہ یہ کہانی سناتے سناتے دادا جان کو کیا ہوجاتا ہے۔ وہ کہانی سناتے سناتے چند لمحوں کے لیے رک کیوں جاتے

ہیں۔حضورﷺ کا نام زبان پر آتے ہی ان کی آنکھیں کیوں چھلک پڑتی ہیں اور یہ حضورﷺ کون ہیں کہ ان کے نام پر لہو کی گردش تیز ہوجاتی ہے۔ یہ مدینہ کس بستی کا نام ہے، یہاں کے ذرے ذرے کو آنکھوں کا سرمہ بنانے کی تمنا کیوں دلوں کو بے تاب رکھتی ہے۔ جب شعور ذرا پختہ ہوا اور معلوم ہوا کہ ہمارا تو سب کچھ ہمارے حضورﷺ ہی ہیں۔حضورﷺ اللہ کے آخری نبی ہیں، اللہ کے سب سے برگزیدہ پیغمبر ہیں، یہ کائنات ارض و سماوات آپﷺ کے قدموں کا تصدق ہے، حضورﷺ ہمارے آقاﷺ ہیں، ہمارے سردار ہیں، ہمارے ماویٰ و ملجا ہیں اور کائنات کی سب سے محترم شخصیت ہیں اور اس وقت تک ایمان مکمل نہیں ہوتا جب تک حضورﷺ ہمیں ہماری جان، مال، اولاد غرضیکہ ہر شے سے عزیز تر نہ ہوجائیں تو میری آنکھیں بھی حضورﷺ کا نام سنتے ہی بھیگنے لگتیں۔حضورﷺ کی محبت رگ و پے میں اترتی محسوس ہوتی، اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں بریلوی کا سلام سنتا تو حالت غیر ہوجاتی۔ آنکھیں بند کرلیتا، درود شریف پڑھتا اور چشم تصور میں گنبد خضرا کی چھاؤں میں پہنچ جاتا، بارگاہ نبویﷺ میں پہنچ کر سلام عرض کرتا، اپنی گزارشات بارگاہ نبویﷺ میں پیش کرتا اور درود پڑھتے پڑھتے پھر اپنی دنیا میں واپس پہنچ جاتا، جب کسی کتاب یا رسالے میں گنبد خضرا کی تصویر دیکھتا تو دونوں ہاتھ اٹھا کر سلام کرتا، حضورﷺ کے بارے میں کہیں کوئی تحریر پڑھتا یا اخبار میں حضورﷺ کا اسم گرامی دیکھتا تو بے اختیار حضورﷺ کے اسم گرامی کو چوم لیتا، اس اخبار یا رسالے کو کبھی آنکھوں سے اور کبھی سینے سے لگاتا، سینے میں ایک ٹھنڈک سی محسوس ہوتی، لطف و راحت کا ایک عجیب سا موسم دل و نظر پر محیط ہوجاتا، واقعہ ہجرت پڑھ کر عجیب سی حالت ہوجاتی، مکہ مکرمہ سے حضورﷺ کے سفر ہجرت کا آغاز، غار ثور سے قبا تک کا سفر، اہل مدینہ کا والہانہ استقبال، بنو نجار کی بچیوں کا خیر مقدمی گیت گانا، اکثر مجھے تڑپا دیتا۔ جب میں نے پہلی بار اس مکان کی تصویر دیکھی جہاں یثرب کی بچیوں نے دف بجا کر حضورﷺ کو خوش آمدید کہا تھا تو میں دیر تک وہ تصویر آنکھوں سے لگا کر روتا رہا تھا۔ میں اکثر سوچتا، کاش میں بھی یثرب کی ان بچیوں میں شامل ہوتا۔حضورﷺ کی راہوں میں اپنی آنکھیں بچھاتا۔حضورﷺ کی ناقہ کی مہار تھام کر عرض کرتا، حضورﷺ میرے گھر چلیے ہم

سب گھر والے آپ کی خدمت کیا کریں گے۔ حضورﷺ میرے قریب آکر پوچھتے کیا تم مجھے چاہتے ہو تو میں بے ساختہ پکار اٹھتا ''دل و جان سے یارسول اللہﷺ!'' اور پھر دیوانہ وار اپنے آقاﷺ کے قدموں سے لپٹ جاتا۔

خیالات کی وادیٔ دلکشا میں پھول کھل رہے تھے۔ تصورات کی دنیا سے باہر آیا تو سر پر سورج پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ میں فضائے مدینہ میں سانس لے رہا تھا۔ ہوائے مدینہ سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہورہا تھا۔ میں نے اضطراری کیفیت میں نیلے آسمان کی طرف دیکھا۔ کیا میرے آقاﷺ بھی اسی آسمان کو دیکھا کرتے تھے۔ جسم پر ایک کپکپی سی طاری ہوگئی، ان پہاڑوں نے حضورﷺ کو دیکھا ہوگا۔ ان ہواؤں نے انؐ کے گیسوئے تابدار کے بوسے لیے ہوں گے۔ اس خاک نے قدوم مصطفیٰﷺ کو چومنے کا اعزاز حاصل کیا ہوگا۔ میں دیر تک کھلے آسمان کی طرف دیکھتا رہا۔ میں نے جدھر دیکھا مجھے میرے حضورﷺ ہی نظر آئے۔ آسمان کی وسعتیں انوار محمدیﷺ سے بھر گئیں۔ میرے زندہ نبی کا وجود ایک زندہ و پائندہ حقیقت بن کر ہر طرف جلوہ افروز تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے دھند کا پردہ کچھ اور بھی گہرا ہوگیا۔ آنسوؤں کے رقص میں تیزی آگئی، مجھے کچھ خبر نہیں تھی کہ میرے اردگرد کیا ہورہا ہے۔ روضۂ اقدس کی زیارت سے مشرف ہونے والے عشاق کس حال میں ہیں، ان کے دلوں پر کیا گزر رہی ہے۔ میں ہمت کرکے آگے بڑھا۔ یوں لگا جیسے بادِ بہاری سڑک کے دونوں طرف مؤدب کھڑی ہے۔ تمناؤں کے ان گنت آنچل قدم قدم پر بچھے ہوئے ہیں۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کائنات کا ذرہ ذرہ میرے ساتھ چل رہا ہے۔ ہر چیز روضۂ اقدس کی جانب رواں دواں ہے۔ مجھے یوں لگا جیسے وقت کی رفتار تھم گئی ہو، ہواؤں نے دم سادھ لیا ہو، چراغ بدست خوشبو کے قدم رک گئے ہوں اور پھر اوج ثریا نے میری آنکھوں کو چوم لیا۔ نگاہ اٹھائی تو ہر اشک آئینہ خانہ بن گیا، پلکیں بھیگ گئیں۔ سامنے گنبد خضرا اپنی جملہ تابانیوں کے ساتھ جلوہ افروز تھا۔ میں ایک لمحے کے لیے ڈگمگا گیا، پوری کائنات کا مرکزِ نگاہ جس کے تصورِ دلپذیر سے کشورِ جاں میں بادِ بہاری

چلتی ہے، جس کے تصدق میں موسموں کو شاداب ساعتوں کی خلعت عطا ہوتی ہے، رعنائی خیال جس کے دامن کی اترن ہے، جو ہر زبان کی ہر لغت میں امن، سلامتی، سکون اور عافیت کا سب سے بلیغ استعارہ ہے، میں اس شہرِ انتخاب میں تھا اور اپنے تصورات میں گم صم گنبدِ خضرا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ نگاہیں بہرِ سلامی اوپر اٹھیں اور اٹھی ہی رہیں، کسے آنکھ جھپکنے کا یارا تھا۔ پھر احترام سے جھک گئیں اور جھکتی ہی چلی گئیں۔ دل کی ہر دھڑکن آنکھوں میں سمٹ آئی تھی، دیارِ ہجر میں عمرِ عزیز کی کتنی راتیں اور کتنے دن گنبدِ خضرا کی ٹھنڈی چھاؤں میں کھڑا تھا، لہو کی ایک ایک بوند ناچ اٹھی، پورا عالم رقص میں آ گیا، فضائیں جھوم اٹھیں، ساعتیں درود پڑھنے لگیں، فضائیں الصلوۃ والسلام علیک یارسول اللہ کے سرمدی الفاظ سے معمور ہوگئیں۔ میں نے اپنے منتشر خیالات کو سمیٹا۔ دل نے ایک بار پھر ٹوکا، ریاض! سنبھل کر چل، ہوش کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑ، اپنے بختِ رسا کی بلائیں لے۔ چند لمحے بعد تو حضورﷺ کی عدالتِ عظمیٰ میں پیش ہونے والا ہے، اے مجرم! اپنی صفائی میں کیا کہو گے؟ دیکھو! سر جھکا کر اپنے جرائم کا اعتراف کرلینا، وہ دلوں کے پوشیدہ مناظر بھی دیکھ لیتے ہیں۔ تمام آرزوؤں کو دامنِ دل میں سمیٹ لے اور پھر چند ثانئے بعد بابِ جبریل کے سامنے کھڑا تھا۔ دہلیزِ مصطفیٰﷺ کو نظروں نے بوسہ دیا، نگاہوں سے خود بخود سجدے ٹپک پڑے۔ جی چاہا سرکارﷺ کی چوکھٹ سے دیوانہ وار لپٹ جاؤں، عشاقِ مصطفیٰﷺ کے قدموں کو چوم لوں، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اپنے جذبات کا اظہار کس طرح کروں، رقص کروں کہ جھوم جاؤں، گمان گزرتا کہیں یہ خواب تو نہیں۔ کیا میں حالتِ بیداری میں ہوں؟ پھر میں اپنے آنسوؤں کے ان گجروں کو تلاش کرنے لگا جو میں نے عمر بھر شب کے پچھلے پہر سپردِ بادِ صبا، اس التماس کے ساتھ کئے تھے کہ اے مدینے کی طرف جاتی ہوئی ہواؤ! میرے ان آنسوؤں کو دہلیزِ مصطفیٰﷺ پر رکھ کر عرض کرنا کہ آقاﷺ آپ کا شاعر بے حد اداس ہے۔ حضورﷺ چاروں طرف سے اسے غموں نے گھیر رکھا ہے، حضورﷺ بلاوے کا منتظر ہے۔ مجھے کچھ خبر نہیں کہ میں نے کب اور کیسے دہلیزِ مصطفیٰﷺ کو عبور کیا۔

ہوش آیا تو حضور ﷺ کے قدمین مبارک میں کھڑا تھا۔ سامنے سبز جالیاں تھیں، چشم پُرنم نے جھک کر حضور ﷺ کے قدموں کو بوسہ دیا۔ یارسول اللہ! ہماری جنت تو آپ ﷺ کے قدموں میں ہے۔ یادِ مصطفیٰ ﷺ میں پہروں مچلنے والا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ آنسوؤں، ہچکیوں اور سسکیوں کا ایک طوفان اُمڈ آیا۔ میرے وجدان نے ہمیشہ حضور ﷺ کے قدموں پر سجدے لٹانے کی آرزو کی ہے۔ سرکار ﷺ کے قدموں میں گر کر مرجانے کی تمنا کی ہے۔ آج میں اپنے آقا ﷺ کے قدموں میں کھڑا تھا۔ لبوں پر درود وسلام کے زمزمے مچل رہے تھے۔ عشاقِ مصطفیٰ بارگاہ حضور ﷺ میں ہدیہ سلام پیش کرنے کے بعد سامنے سے آرہے تھے، میں بڑے ادب اور احترام کے ساتھ آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ دل کی رفتار یقیناً قدموں سے تیز تھی اور پھر وہ لمحہ بھی آ گیا جسے حاصل زندگی بھی کہوں تو کم، یوں لگا جیسے انوار کی چادر سی میرے سامنے تان دی گئی ہو، شاداب ساعتوں کے موسم نے مجھے اپنی بانہوں میں لے لیا ہو، آہستہ آہستہ نظریں اٹھائیں۔ سامنے رنگ ونور کا ایک سمندر موجزن تھا۔ چند لمحوں کے لیے نجانے کہاں کھو گیا، روضۂ اطہر کی سنہری جالیاں سامنے تھیں، وہ جالیاں جنہیں میں نے چشمِ تصور میں بارہا بوسہ دینے کی سعادت حاصل کی تھی۔ سینے سے ایک طوفان اٹھا، میں دیوانہ وار پکار اٹھا: ''لبیک یارسول اللہ لبیک!''، میں بے ساختہ پکار رہا تھا۔ حضور ﷺ آپ ﷺ کا ایک ادنیٰ سا شاعر، آپ ﷺ کے گھرانے کا نوکر، آپ ﷺ کے غلاموں کا غلام حاضر ہے، آقا آپ ﷺ کا مجرم سر جھکائے آپ ﷺ کی عدالت میں کھڑا ہے۔ میں نے چشمِ تصور میں دیکھا، حضور ﷺ فاتحانہ انداز میں مکہ میں داخل ہورہے ہیں۔ سر، بارگاہ خداوندی میں جھکا ہوا ہے۔ کفار و مشرکین بھی مجرموں کی طرح سر جھکائے کھڑے ہیں لیکن حضور ﷺ کی طرف سے اعلان ہورہا ہے کہ آج جو شخص ابوسفیان کے گھر میں آجائے گا، اسے بھی پناہ دے دی جائے گی جو اپنے گھر کو اندر سے بند کرلے گا، وہ بھی امان پائے گا۔ یہ سوچ کر مجھے حوصلہ ہوا۔ ایک مجرم کے اوسان بحال ہوئے۔ حضور ﷺ اپنے شاعر کا سلام قبول کیجئے: الصلوۃ والسلام علیک یارسول اللہ! ساری عمر ارادے باندھتا

رہا کہ حضور کی بارگاہ بے کس پناہ میں پہنچ کر اپنی ساری تمنائیں طشت دیدہ و دل میں سجا کر پیش کردوں گا۔ یہ عرض کروں گا، وہ عرض کروں گا۔ اپنے ٹوٹے ہوئے وطن کی داستان کہوں گا۔ عرض کروں گا کہ آقاﷺ آپ کے غلاموں کے وطن کا ایک بازو ٹوٹ گیا ہے۔ حضورﷺ میرا مشرقی پاکستان سازشوں کے بھنور میں ڈوب گیا ہے۔ آقاﷺ غلاموں کا آشیانہ شاخِ نازک پر لرز رہا ہے۔ حضورﷺ شرمسار ہوں کہ اب میرے وطن سے آپﷺ کو ٹھنڈی ہوا نہیں آتی، ہم آپﷺ کی تعلیمات کو بھول چکے ہیں، تارک قرآن ہوکر در در کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں، ہم آپﷺ کی تعلیمات کو بھول چکے ہیں، ہم نے ہر اخلاقی قدر کا جنازہ اپنے کندھوں پر اٹھا رکھا ہے۔ اپنی ثقافتی اقدار کو عملی زندگی میں نافذ کرنے کی بجائے انہیں ہم نے عجائب گھروں کے شفاف شوکیسوں میں سجا رکھا ہے۔ حضورﷺ ہم اپنی تاریخ ہی نہیں، اپنے جغرافیے کے بھی قاتل ہیں۔ صنم خانے ہمارے سوچوں کے نگر میں آباد ہیں، کشورِ دیدہ و دل میں دھول اڑ رہی ہے۔ ہر زاویہ نگاہ تشکیک کی گرد میں لپٹا ہوا ہے۔ ہم نے اپنے دین میں اپنی جھوٹی انا کی گمراہیوں کی مسند بچھا رکھی ہے۔ ہم نے تاج ختم نبوت پر ڈاکہ ڈالنے والے غاصبوں کو اپنے دامن میں چھپا رکھا ہے۔ ہم وہ بدبخت ہیں جو فلسطین، بوسنیا اور کشمیر کی بیٹی کے سر پر تحفظ کی ردا نہ دے سکے۔ ان کی عصمتیں سر بازار لٹتی رہیں لیکن ہماری غیرت ایمانی پر مسلسل برف گرتی رہی۔ آقاﷺ ٹوٹ جائیں ہمارے دونوں ہاتھ، ٹوٹ جائیں ہمارے دونوں ہاتھ، حضورﷺ ہم آپ کے مجرم ہیں، حضورﷺ ہم آپﷺ کے مجرم ہیں۔ سوچا تھا حضورﷺ کی بارگاہ اقدس میں وطن کی ہواؤں کا سلام پیش کرنے کے بعد گھر کے ایک ایک فرد کا نام لے کر سلام عرض کروں گا کہ یارسول اللہ میرے گھرانے کا ایک ایک بچہ دونوں ہاتھ اٹھا کر سلام کہہ رہا تھا۔ حضورﷺ آپ کی کنیزیں گلاب کی سرخ پتیاں لے کر دست بستہ کھڑی تھیں۔ آقاﷺ، غلام زادے سر تاپا حرفِ سپاس بن کر سلام پیش کررہے تھے، حضورﷺ میرے گھر کے در و دیوار بھی سلام کہتے تھے۔ حضورﷺ میرا قلم، میری تنہائیوں کا ساتھی، حضورﷺ ہم دونوں مل کر آپ کی

محبت کے چراغ جلایا کرتے تھے، حضور ﷺ اس ٹوٹے ہوئے قلم کو بھی اپنے ساتھ لے آیا ہوں، ورق ورق پر سجدے لٹانے والا قلم، حضور ﷺ سلام عرض کرتا ہے لیکن تمام تمنائیں اور آرزوئیں سیلِ اشک میں بہہ گئیں۔ ممکن ہے عالم بے خودی میں زبان حال سے یہ سب گزارشات حضور ﷺ کے گوش گزار بھی کردی ہوں لیکن محسوس یہی ہورہا تھا جیسے زبان پر تالے پڑ گئے ہیں، لفظ لڑکھڑا رہے ہیں، جذبات کی بیساکھیاں ٹوٹ رہی ہیں، جملے آنسوؤں میں تحلیل ہورہے ہیں۔ آواز حلق میں اٹک کر رہ گئی اور روتے روتے ہچکی بندگئی، دزدیدہ نگاہوں سے دیکھا، غلامان رسول ہاشمی کے جذبوں کا ایک سمندر چاروں طرف موجزن تھا۔ ہر کوئی اپنے دکھ سمیٹے اپنے آقا ﷺ کی بارگاہ میں گزارشات پیش کررہا تھا۔ میرے آگے پیچھے دائیں بائیں عشاق مصطفیٰ دنیا و مافیہا سے بے نیاز حضور ﷺ کے دربار گہر بار میں درودوں کے گجرے اور سلاموں کی ڈالیاں پیش کررہے تھے۔ ایک عالم کیف میں ڈوبا ہوا تھا۔ دل نے سرزنش کی کہ سیدنا ابوبکر صدیقؓ اور سیدنا عمر فاروقؓ کی بارگاہ میں سلام پیش کئے بغیر آگے بڑھ آئے ہو۔ چلو اور جاں نثاران مصطفیٰ سے اپنی کوتاہی کی معافی مانگو۔ میں شرمندگی کی چادر میں منہ چھپائے بارگاہ صدیقیت اور بارگاہ فاروقیت میں حاضر ہوا۔ عرض کی میرے حضور ﷺ کے محترم ساتھیو! حضور ﷺ کا ایک ادنیٰ سا شاعر سلام کے لیے حاضر ہوا ہے اور بصد ادب التماس گزار ہے کہ اس مجرم کی انگلی پکڑ کر اسے حضور ﷺ کی خدمت اقدس میں لے چلیں! میں ایک مجرم کی طرح ستونوں کے پیچھے چھپ رہا تھا، میری روسیاہیاں میری آنکھوں میں سمٹ آئی تھیں۔ یقین نہیں آرہا تھا کہ سچ مچ مواجہہ شریف میں کھڑا ہوں اور حضور ﷺ مجھے دیکھ رہے ہیں، کہیں اندر سے آواز آئی، اے دیدۂ شوق میں سلگنے والے آنسوؤ! اے مصحفِ شعور پر تحریر ہوتی سسکیو! اور اے لوح عقیدت پر رقم ہوتی ہوئی ہچکیو! احتراماً جھک جاؤ اور خاکِ انور کو اپنی آنکھوں کا سرمہ بنالو، زائرین کے قدموں کی دھول اپنے چہرے پر مل لو۔ آواز آئی، ریاض! اپنی اوقات جانتے ہو، یہ تو حضور ﷺ کا کرم ہے کہ تجھ جیسے کمینے کو بھی حاضری کا پروانہ جاری ہوگیا ہے، معلوم ہے کس

کے دربار اقدس میں کھڑے ہو، ارے نادان! یہ تیرے آقاﷺ کا دربار ہے۔ سامنے روضہ اطہر کی سنہری جالیاں ہیں۔ یہ وہی سنہری جالیاں ہیں جنہیں دیکھ کر تیرا وجدان رقص میں آجایا کرتا تھا۔ یہ وہی سنہری جالیاں ہیں جنہیں تم ہر شب چشمِ تصور میں بوسہ دیا کرتے تھے۔ نظریں اٹھا اور اپنی سلگتی ہوئی آنکھوں سے اِن معطر جالیوں کو چوم لے۔ یہ بارگاہِ والیٔ کون و مکاںﷺ ہے، یہ محبوبِ رب العالمینﷺ کا آستانہ ہے، یہ دربارِ شہنشاہ انس و جاںﷺ ہے، یہ درِ یتیم آمنہؓ کے لالﷺ کی آرام گاہ ہے، یہاں ذرا سا بھی اضطراب سوء ادب میں شمار ہوگا۔ چند لمحوں کے لیے میں بھول چکا تھا کہ میں کون ہوں، کہاں سے آیا ہوں اور کس عظیم پیغمبر کی بارگاہ میں کھڑا ہوں۔ وہ اضطراب اور بیقراری جسے ہجر کی ساعتوں میں حرز جاں بنایا کرتا تھا، وہ تڑپ جس میں مچل مچل کر دوری میں بھی حضوری کی لذت سے ہمکنار ہوا کرتا تھا، ختم ہوچکی تھی۔ ایک عجیب سا سکون روح پر محیط تھا، جیسے بھوک اور پیاس کی شدت سے نڈھال بچہ روتے روتے ماں کی آغوش میں میٹھی نیند سو جاتا ہے۔ کچھ اس قسم کی کیفیت سے روح اور بدن سرشار تھے۔ اندر سے وہی آواز دوبارہ ابھری، ریاضِ خوش نوا! اپنے بخت رسا پر ناز کر، یہ وہی مواجہہ شریف ہے جو تیری سوچوں کا مرکز ومحور رہا ہے، یہ اسی سالار نسل آدمﷺ کا دربار ہے ہم نسل در نسل جس کی شفقتوں کے مقروض چلے آرہے ہیں، جس کی ثنا ازل سے تیرے مقدر میں لکھ دی گئی تھی۔ یہ اسی نبی محتشمﷺ کا آستانہ ہے جس کی یاد شب کے پچھلے پہر تیری خلوتوں میں میلہ سا لگایا کرتی تھی، یہ اس نبی آخرالزمانﷺ کی دہلیز ہے جس پر سجدہ ریز ہونے کے لیے تیرا قلم مچلتا رہتا تھا۔ تیری سانسیں مضطرب رہتی تھیں، اے میرے مقدر وجد میں آ، اے میری روح ذرا جھوم جا، مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے حضورﷺ کی چادرِ رحمت نے مجھے اپنے دامن کی خنک چھاؤں میں سمیٹ لیا ہو، قلب ونظر میں اٹھنے والا طوفان تھم چکا تھا۔ جھیل کی مضطرب موجیں سکون آشنا ہوچکی تھیں۔ میں نے اپنی بیاضِ نعت کو الٹنا پلٹنا شروع کردیا۔ ''حضور حاضر ہے ایک مجرم'' یہ نعتیہ نظم لبوں پر مچل اٹھی، ایک ایک مصرعے میں دل کی ہزار

ہزار دھڑکنیں سمٹتی جارہی تھیں۔ الفاظ کانپ رہے تھے، ہونٹ کپکپارہے تھے۔ ہاتھوں پر رعشہ طاری تھا اور میرا سارا وجود احساسِ ممنونیت کی چادر میں لپٹا ہوا تھا۔ یوں لگا جیسے صدیاں بیت گئی ہوں، اللہ اکبر، اللہ اکبر، مؤذن کی آواز گونجی، میں چونک پڑا، جیسے کوئی برسوں کی نیند کے بعد بیدار ہوتا ہے۔ الصلوٰۃ والسلام علیک یارسول اللہ! چشم پرنم نے جھک کر حروف سپاس کو بوسہ دیا۔ حضورﷺ اس کی کوتاہیوں سے درگزر فرمائیے۔ روح اور جسم دونوں آنسوؤں سے وضو کر کے نمازِ عشق ادا کر رہے تھے، مؤذن کی آواز گونج رہی تھی‘‘۔

اشھد ان محمد رسول اللہ

اشھد ان محمد رسول اللہ